مجموعہ کالم و مضامین

صدائے حق

وقتی تقاضوں سے متعلقہ اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت اور عوامی و معاشرتی اصلاح
کے متنوع مضامین اور اخبارات و رسائل میں شائع کردہ کالموں کا مجموعہ

تالیف
مولانا مفتی محمد ایاز صاحب
رئیس جامعہ تبلیغ القرآن پشاور

العلم پبلشنگ سروسز

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	نظام عقائد	
1.	اسلام کا نظامِ عقائد	1
	عبادات	
2.	اسلام کا نظامِ عبادات	5
3.	حقیقت بندگیٔ رب	9
4.	دعا عبادت ہے	19
5.	حج ایک عظیم عبادت	23
6.	حج کی ابتدا	26
7.	قربانی کی تاریخ اور حقیقت	31
8.	صدقے کا بہترین اصول	35
9.	موسم سرما نیکیوں کا موسم بہار	37
	سنّت وسیرت	
10.	سیرت النبی ﷺ ایک عملی اور جامع سیرت	40
11.	سیرت النبی ﷺ ہی جامع و مستند سیرت	51
12.	سیرت، جامعیت اور اقسام	57
13.	میثاق مدینہ : مدنی ریاست کا مرتب دستور	63
14.	انسانی حقوق کا پہلا اور عالمی چارٹر (منشور)	73
15.	عہد نبوی ﷺ میں مدینہ کا شہری نظام	77

89	ریاست مدینہ کا شعبہ تعلیم اور دیگر شعبہ جات	.16
103	دور نبوی کا نظام مواخات	.17
109	مسجد نبوی ﷺ اور اس کا نظام	.18
119	اسمِ محمد ﷺ	.19
126	حب رسول ﷺ کے تقاضے	.20
130	اتباع سنت	.21
	اصلاح وتربیت	
135	دین و شریعت	.22
141	تزکیہ نفس کی حقیقت	.23
146	نیا اسلامی سال اور اپنا احتساب	.24
150	تربیت اولاد	.25
152	دین اسلام کیا ہے۔۔؟	.26
154	عید کا پیغام	.27
158	فتنے اور ان سے بچاؤ	.28
164	اسلام کا نظام معاشرت	.29
169	قرآن، کتاب انقلاب	.30
172	بسنت تہوار	.31
177	فہم قرآن	.32
181	قرآن سے گہرا تعلق	.33
	اصلاح معاشرہ	
185	رشوت اور ہمارا معاشرہ	.34

35.	یکساں نظام تعلیم	190
36.	کیسا نظام تعلیم	193
37.	مجدد اور تجدید واحیائے دین	196
	دعوت وتنظیم	
38.	منظّم دعوت	198
39.	اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ	203
40.	دعوت دین کا کام منظّم طریقے سے کیسے کریں؟	210
41.	اسلام، تعارف اور دعوت	217
	معیشت وتجارت	
42.	اسلام کا نظامِ معاملات ومعاشیات	222
43.	اسلامی معیشت اور حلال وحرام کا تصور	226
44.	زکوٰۃ کی اقتصادی ومعاشی اہمیت	230
45.	معیشت	234
46.	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت تاجر	244
47.	”سود کی لعنت“	248
48.	سود کی خباثت	253
	تعمیرِ فکر	
49.	کامیابی کا تصور اور اصول	257
50.	کامیاب لوگوں کے عادات	259
51.	پُرسکون اور باوقار زندگی گزارنے کا راز	263

.52	کتابِ زندگی	266
.53	سماجی ترقی کا راز	270
.54	کامیابیاں حاصل کیجئے	272
حالاتِ حاضرہ		
.55	تبدیلی۔۔۔۔ مگر کیسے؟	276
.56	یالیت قومی یعلمون، کاش! میری قوم سمجھ جائے	280
.57	نوجوان نسل اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی	283
.58	پاکستان کی قدر/ مقصد پر نظر	286
.59	دینی مدارس اور سانحۂ راولپنڈی	289
.60	یوم ختم نبوت اور آئین پاکستان	295
.61	گستاخانہ خاکوں کے منسوخی کے بعد؟	297
.62	آسیہ مسیح کیس پس منظر و پیش نظر	299
.63	آسیہ مسیح کیس کے بعد اقدامات	302
سیاست و حکومت		
.64	اسلام کا نظامِ سیاست و ریاست	304
.65	اسلامی نظام، اہمیت اور طریقہ کار	309
.66	ریاست مدینہ کا نظم و نسق	315
.67	سیرت کی روشنی میں مدینہ کی ریاست کے قیام کا پس منظر	323
.68	مدینہ میں ریاست کے قیام کا طریقہ کار	334
.69	اسلامی ریاست کے فرائض	341
.70	دینی قیادت کا المیہ	344

.71	ملتِ حنفیت ولی اللٰہی اور سندھی نقطہ نظر	345
.72	قرآن اور اقامت دین	355
	اسلام اور مغرب	
.73	فکری جنگ	357
.74	نیو ایئر نائٹ، کفار سے مشابہت	359
.75	اسلام اور ویلنٹائن ڈے	362
.76	"اپریل فول کی حقیقت"	367
.77	ہولوکاسٹ کیا ہے؟	370
.78	مغرب کا تہذیبی دعویٰ	372
.79	مغربی تہذیب سے آزادی	374
	اسلامی مہینوں کا تعارف، خصوصیات، احکام و مناسبات	
.80	اسلامی کیلنڈر	376
.81	اسلامی ہجری سال، پیغام اور خصوصیات	381
.82	محرم الحرام کی حقیقت	384
.83	محرم کی تاریخ و پس منظر اور اس کی فضیلت	389
.84	ماہ صفر کی حقیقت	393
.85	رمضان المبارک اور قرآن	397
.86	"رمضان نیکیوں کا موسم بہار"	400
.87	رمضان اور تقویٰ	404

اسلام کا نظامِ عقائد

اسلام میں عقائد کو اساسی حیثیت حاصل ہے جس کے بغیر دین اسلام کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی اور کوئی عبادت یا نیک عمل صحیح عقیدے کے بغیر اللہ رب العزت کے دربار میں شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔اس لیے عقائد کی درستی کو چھوڑ کر باقی اعمال و احکام بجا لانے والے انسان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ریت پر آبادی کی بنیاد رکھنے والا۔ اس بات کی وضاحت قرآن کریم نے اس طرح کی ہے۔

"اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی تصور کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا اور قضائے الٰہی یعنی موت کو پاتا ہے۔سو اللہ نے اس کو اس کا حساب برابر چکا دیا اور اللہ دم بھر میں حساب کر دیتا ہے"۔(سورۃ نور: ۹۳)

موجودہ دور کے بگڑے ہوئے حالات سے دل برداشتہ بہت سے لوگوں اور سیاسیوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کے جو انقلاب کا نعرہ لگائے یا کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرکے عقیدے کے ہر بگاڑ اور افکار و نظریات کی ہر کج روی و خرابی اور انحراف کو معاف کر دیتے ہیں اور عقیدے کے مسئلے سے بالکل صرفِ نظر کر لیتے ہیں، بلکہ الٹا اِن لوگوں کو جو ایسے موقعہ پر عقیدہ کی بحث کو اٹھائیں اور اس شخص کے عقائد کے بارے میں کوئی سوال کریں ہدفِ ملامت بنا لیتے ہیں یا ان پر کبھی باطل قوتوں سے ساز باز کر لینے کا الزام بھی لگاتے ہیں اور کبھی حالات کی نزاکت کی آڑ میں عقیدے کی بات اور اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ان کا یہ طرزِ فکر اور طرز عمل ، عقیدہ کو اہمیت نہ دینا دینی مزاج اور نبوی طریق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ حالانکہ عقیدہ و عمل کا باہمی تعلق بیج اور درخت کی مانند ہے جیسا بیج ویسا درخت۔ عقیدہ درست و مضبوط ہو تو عمل صحیح اور قابلِ قبول ہوگا۔اسی طرح اگر عقیدہ غلط ہو تو اعمال پر بُرا اثر پڑے گا اس لیے حیات و کائنات کے بارے میں درست اور صحیح عقیدہ و تصور کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ زندگی کے بارے میں کسی معاشرے کا اختیار کردہ عقیدہ و تصور جتنا جامع و کامل ہوگا اتنا ہی وہ معاشرہ مضبوط و پائیدار ہوگا۔اس کے برعکس تصورِ

حیات جتنا ناقص اور عارضی ہوگا اتنا ہی اس کی بنیاد پر اٹھنے والا معاشرہ کمزور، منتشر اور متزلزل ہوگا۔ لہٰذا اسلام کا عقیدۂ حیات و کائنات دوسرے مذاہب کے مقابلے میں یقیناً ایک جامع و کامل تصورِ زندگی پیش کرتا ہے اور یہی اس دین اسلام کی امتیازی شان اور نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں عقیدے پر زور و اصرار اور سب سے پہلے اس کے حصول کی تاکید ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام علیہم السلام عقیدہ توحید کی دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے اور اس کے مقابلے میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے۔ اپنی دعوت اور شریعت میں کوئی ترمیم یا تغیر و تبدل گوارہ نہ کیا، ان کے ہاں مداہنت اور تبدیلیٔ مؤقف کی کوئی گنجائش کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ عقائد اور حدود اللہ کے بارے میں ہر دور کے انبیا علیہم السلام فولاد سے زیادہ بے لچک اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط واقع ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر، عمل و عبادات کا مثالی مجسمہ (خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرے کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہی کیوں نہ ہوا ہو) اُس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک وہ اس عقیدے کا ماننے والا نہ ہو جس کو انبیا علیہم السلام لے کر آئے ہیں اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اسی عقیدے کی بنیاد پر نہ ہوں جس کی دعوت انبیا کی زندگی کا اولین نصب العین تھا۔ یہی وہ حد فاصل اور واضح فرق ہے جو انبیا علیہم السلام اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں اور عام انقلابیوں کے درمیان ہے، بہر حال ان عقائد و ایمانیات میں کچھ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ہے اور کچھ کا تعلق دوسرے چیزوں سے ہے مثلاً رسولوں پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، کتابوں پر ایمان، قیامت پر ایمان وغیرہ۔

الغرض اسلام کے اہم اور بنیادی عقائد، ایمانِ مفصل میں مختصر طور پر ذکر ہیں۔ جس میں اللہ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، آخرت پر، تقدیر پر اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایمان کہتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننا اور یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے واسطے وحی کے ذریعے ان کو بہت سے وہ باتیں بتلائی ہے جو

ہم آنکھ، کان وغیرہ اپنے علمی ذرائع سے معلوم نہیں کر سکتے اور اس بنا پر ان کی ان سب باتوں کی تصدیق کی جائے جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائیں اور ان پر یقین کیا جائے اور ان کے لائے ہوئے دین کو دین حق کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ پس کسی آدمی کے مومن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سب باتوں کو حق مانے جن کی اطلاع اللہ کے پیغمبر دیں، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کسی نے انکار کیا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

ان تمام عقائد میں سے توحید، آخرت اور رسالت کو امہات العقائد یعنی بنیادی عقیدے کہتے ہیں۔ ان تین عقیدوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام جس زندگی کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں اس کا پورا نظام انھی تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور وہی شخص اس زندگی کو اپنا سکتا ہے جو ان تینوں بنیادی باتوں کو تسلیم کرے۔ گویا اسلامی نظام زندگی کی یہ تین فکری اور اعتقادی بنیادیں ہیں اس لیے دین میں ان کی خاص اہمیت ہے۔

عقائد کی اقسام:

عقائد دو قسم کے ہیں یا یوں بھی تعبیر کی جا سکتی ہے کہ عقائد کے دو درجات ہیں۔

ا۔ ایک وہ جن کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا قطعی اور یقینی ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کو ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ جن چیزوں کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجے کا ہو، اہل علم کی اصطلاح میں ان کو ضروریات دین کہتے ہیں۔ "امہات العقائد" یعنی توحید، رسالت، قیامت وآخرت پہلی قسم کے عقیدے ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا، آخرت میں جنت اور دوزخ کا ہونا، فرشتوں کا ایک مستقل مخلوق ہونا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بہت سے انبیا کا آنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبین یعنی سب سے آخری نبی ہونا اور سلسلۂ نبوت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہونا، یہ سب بھی اسی درجے کے عقیدے ہیں کہ ان کا ثبوت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی یقینی اور قطعی ہے، جیسا کہ توحید، رسالت اور قیامت کا اور ان کو اِسی درجے کا تواتر اور عام شہرت امت میں حاصل رہی ہے۔ اس

لیے ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک بھی بات کا انکار کرکے آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا، اگرچہ اس کا یہ انکار کسی تاویل کی آڑ لے کر ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ دوسری قسم کے عقائد وہ ہیں جن کا ثبوت اگرچہ قابلِ اطمینان اور پکا ہے لیکن اس درجہ کی قطعیت اور ایسا تواتر ان عقائد کو حاصل نہیں جس کے بعد کسی احتمال اور تاویل کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرے درجے کے عقائد کی مثال میں عذابِ قبر، قیامت اور آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً میزان، صراط، شفاعت، رویۃ باری تعالیٰ وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے دجال کے ظہور اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول اور اسی طرح بعض اور علاماتِ قیامت کا درجہ بھی یہی ہے۔ یعنی ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگرچہ قابلِ اطمینان اور پکا ہے، لیکن "ضروریاتِ دین" کے معیار کا نہیں۔ اس لیے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا اگرچہ سخت درجہ کی گمراہی ہے، لیکن اسے کو کفر یا ارتداد نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام کا نظامِ عبادات

اسلامی نظامِ عبادات دین ومذہب کی بنیادی ضرورتوں میں ایک لازمی امر ہے جو عقیدے کی درستی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ عقائد کے بعد اسلام میں جس چیز کی بڑی اہمیت، جس پر بڑا زور اور جس کی بڑی تاکید کی گئی ہے وہ عبادات ہیں، جو انسانوں کی پیدائش کا اولین مقصد اور غرض وغایت ہے۔ اللہ پاک نے خود ارشاد فرمایا:

”اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں“۔ (سورۃ الذاریات)

عبادات سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کا طلب گار بن کر اُس کی توحید والوہیت اور اپنی بندگی کا عملی اظہار کرتا ہے۔ عبادات اس نظریے اور عقیدۂ توحید کا عملی ثبوت ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق مالک حاکم مانتا ہوں، اس لیے اس کے سامنے سر بسجود ہوں، اس کے حکم کے مطابق اپنی جان اور مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

عبادت سے مراد خاص وہ اعمال ہیں جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبرائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور بیچارگی اور بندگی اور سرافگندگی ظاہر کرنے کے لیے کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عربی میں ان عبادات کو قُربات بھی کہتے ہیں جیسے نماز، روزہ، حج زکوۃ وصدقات، ذکر اور تلاوت، قرانی جیسے تعبدی اعمال جو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور اپنے روحانی پہلو کی درستی اور ترقی کے لیے کیے جاتے ہیں اور وہ صرف عبد و معبود کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ ساری عبادت و اعمال روح کی پاکیزگی و تقربِ الٰہی حاصل کرنے اور اللہ کی معبودیت، عظمت وکبریائی کی گواہی دینے کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ اسلام کا نظامِ عبادات تین قسم کی عبادات پر مشتمل ہے۔ ایک خالص جسمانی عبادات جیسے رکوع، سجدہ، اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف، نماز اور روزہ وغیرہ۔ دوسری خاص مالی عبادات جیسے انفاق فی سبیل اللہ، صدقہ و خیرات، زکوۃ، نذر اللہ اور قربانی وغیرہ۔ اور تیسری قسم عبادت دونوں (مال وجان) سے مرکب جیسے حج، عمرہ، جہاد وغیرہ۔

اسلامی شریعت کی رو سے ان عبادات میں ہر عاقل بالغ مسلمان، مرد و عورت پر خاص طور پر چار چیزیں فرض ہیں اور اسی لیے ان کو دین کے ارکان اربعہ (یعنی چار ستون) کہتے ہیں۔

(۱) پانچ وقت کی نماز

(۲) اگر وہ زکوۃ کے شرائط پورے کرے تو سال میں ایک مرتبہ اپنے مال کی زکوۃ۔

(۳) رمضان کے روزے۔

(۴) اور خانہ کعبہ کا حج (بشرط استطاعت) جو عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔

یہ وہ فرائض ہیں جن کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور ان کا مستقل تارک (چھوڑنے والا) گویا جماعت مسلمین سے خارج ہے۔

عبادت کا مقصد:

عبادت کا ایک تعلق معبود سے ہے اور ایک عبد سے ہے، یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہماری عبادات سے معبود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور اس کی شان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

"اگر سارے انسان اور سب اولین و آخرین اعلی درجہ کے متقی اور عبادت گزار ہو جائیں تو اللہ کی شان اور اس کی عظمت و کبرائی میں ذرہ برابر زیادتی نہیں ہو گی اور اگر سب کے سب بدترین قسم کے نافرمان اور پورے شیطان بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں اور اس کی عظمت وجلال میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی"۔

بہر حال ہماری عبادات سے اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ اس کی شان کبرائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، بلکہ ہماری عبادتیں دراصل ہمارے ہی فائدے اور ہماری ہی نفس کی تکمیل کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کا حکم صرف اس لیے دیا ہے کہ اس کے ذریعہ ہم ترقی کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑھائیں اور اس کی خاص رضا اور رحمت کے مستحق بنیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بندے میں اور مولا میں کوئی مناسبت ہی نہیں، کہاں زمین و آسمان کا خالق و مالک حق تعالیٰ شانہ اور کہاں ایک ناپاک بدبودار قطرے سے پیدا ہونے والا اور گندے خون سے بننے والا انسان، حقیقت یہ ہے کہ زمین پر رینگنے والے ایک گھناؤنے حقیر کیڑے اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ میں جو نسبت ہے، بندہ میں اور مولا میں وہ بھی نہیں ہے۔ پس اس کی صورت یہی ہے کہ اس کی انتہائی برتری اور کبرائی اور اس کے سامنے اپنی انتہائی ذلت و پستی اور عاجزی و بیچارگی اور عبدیت و فدائیت کا اعتراف اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کریں، بس یہی چیز بندے کو پاک اور بلند کرکے اللہ کا مقرب و محبوب بنادیتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔

بہرحال انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی نشو نما عبادت ہی سے ہوتی ہے اور عبادت ہی عالم ملکوت اور ملاءِ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کا خاص ذریعہ ہے۔ عبادات کے علاوہ دین کے جو دوسرے احکام ہیں، اگرچہ ان سب کی تعمیل میں بھی اجر و ثواب ہے، یعنی اخلاق میں بھی اجر و ثواب ہے۔اسی طرح دین کی جدو جہد بھی بڑے اجر و ثواب کی چیز ہے، لیکن ملاءِ اعلیٰ سے ربط و مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی جو خاصیت عبادات میں ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اعمال اگرچہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق کیے جائیں اور ہماری نیت بھی حکم الٰہی کی تعمیل اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کی ہو، لیکن ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے مثلاً اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست و حکومت، تعلیم و تعلم، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ان سب اعمال کا رخ مخلوق کی طرف ہے، خالق کے ساتھ ان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ یہ بھی اس کے احکام ہیں، لیکن عبادات کا تعلق براہ راست صرف معبود سے ہے اور اس میں بندے کا رخ

صرف اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے غیر کی اس میں کہیں رکاوٹ ہی نہیں ہے، یہی عبادات کا امتیاز ہے اور دین میں عبادات پر زیادہ زور دینے کا یہی راز ہے۔

لیکن ان تمام عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ و خیرات، ذکر و دعا کے ادا کرنے کے بارے میں ایک اہم بات بھی ملحوظ خاطر رہنا ضروری ہے اور وہ ہے ان عبادات میں سنت کی پابندی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ادائیگی شرط ہے، کیونکہ جو عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف اپنے بنائے ہوئے خود ساختہ طریقے پر کیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا": وہ ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے سنت طریقے کے بغیر کوئی عمل کیا۔" (جامع صغیر)

اس لیے اعمال و عبادات میں بدعات اور سنت کے خلاف طریقوں سے بچنا چاہیے اور کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سنت طریقے کو جاننا اور پھر اُسی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔

بہر حال دین کے حوالے سے بنیادی کام یہ ہے کہ عقائد کے بعد ان ارکانِ اسلام میں روح اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور امت کے نمازوں، روزوں، زکوٰتوں اور حجوں کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز، روزے اور زکوٰۃ و حج کے منہاج پر لانے کے لیے جد و جہد کی جائے۔

حقیقت بندگئ رب

اسلام کے معنیٰ اللہ کی بندگی و اطاعت اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ اس پہلو سے آپ دیکھیں تو اللہ سے صحیح اور زندہ تعلق اسلام کی اہم ترین بنیادیں نہیں، حقیقتاً کل اسلام ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ پر استقامت کو عینِ اسلام قرار دیا ہے:

''سفیان بن عبد اللہ ثقفی سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام کے بارے میں مجھے ایسی بات بتا دیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے کسی سے پوچھنا نہ پڑے۔ فرمایا، کہو، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر جم جاؤ''۔ [بخاری، مسلم]

اس بندگی اور تعلق باللہ اور استقامت کے نتیجہ میں مومن دنیا و آخرت کی کامرانیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم گئے، ان پر فرشتے نازل ہوں گے کہ نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو اور جنت کی خوشخبری پاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمھارے ساتھی ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمھیں جنت میں وہ تمام نعمتیں ملیں گی۔ جنھیں تمھارا دل چاہے گا اور جنھیں تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہے اس اللہ کی جانب سے جو مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے''۔ [حم سجدہ: ۳۰]

صرف ایک اللہ معبود:

اسلام کی سب سے اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لاالٰہ الا اللہ، کائنات اور انسان کا خالق، مالک، پروردگار اور حاکم صرف اللہ ہے، اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے، نہ پروردگار، نہ مالک، نہ حاکم۔ الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں، کائنات میں اس کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا، اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ وہی حاجت روا، مشکل کشا اور نجات دہندہ ہے۔ وہی مصیبت اور ضرورت میں انسان کے کام آتا ہے۔ وہی اس لائق ہے کہ انسان اس کی پرستش و عبادت کرے اور اس کے آگے سر بہ سجود ہو،

اس کے سوا پرستش، عبادت اور دعا کا کوئی مستحق نہیں۔ یہی توحید تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترکہ اور بنیادی دعوت تھی:

”ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے، اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم میری ہی بندگی کرو“۔ [الانبیاء: ۲۵]

اللہ کے سوا کسی اور کو معبود ماننا، اور کسی کی پرستش کرنا، اس سے مدد مانگنا یا دعا کرنا شرک ہے اور شرک ایسا جرم ہے جسے اللہ معاف نہیں کرے گا:

”بے شک اللہ اس جرم کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس سے کم درجہ کے گناہ کو جس کے لیے چاہے گا معاف کردے گا“۔ [النساء: ۴۸]

صرف اللہ کی عبادت:

اللہ نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں پال رہا ہے، وہی ہماری ہر ضرورت پوری کرتا ہے، ہم سر سے پیر تک اس کے احسانات میں غرق ہیں۔ ان امور کا احساس ہمیں بے چین کر دیتا ہے کہ ہم سراپا شکر اور سرتاپا عجز و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائیں، خلوص و عقیدت سے اس کے گن گائیں، اس سے پیانِ وفا اور عہدِ بندگی باندھیں اور اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں نچھاور کردیں۔ بس یہی عبادت ہے۔ ہر سلیم الفطرت انسان، جو اللہ کو پہچانتا ہو، اس کی عبادت کرنے پر مجبور ہے، یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں عبادت کرنا بھی سکھایا اور بتایا کہ ہم عبودیت و بندگی کے جذبات کا اظہار کس طرح ادا کریں۔

اسلام نے جن عبادات کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے ان میں جذباتِ عبودیت کا اظہار بھی ہے، اللہ سے پیانِ وفا اور عہدِ بندگی بھی ہے۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کے حصول کی ضمانت بھی ہے اور انسان کو اللہ کا بہترین بندہ اور بہترین انسان بنانے کا سامان بھی۔ یہ عبادات پوری اسلامی زندگی کی بنیاد ہیں اور ایمان کے بعد تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ بھی۔ اس لیے ایمان کے بعد ان کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے اور وہ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب اور اسلام میں سب سے زیادہ مقصود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔ [بخاری، مسلم]

یہ اسلام کے پانچ بنیادی ستون ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اسلام کی راہ پر چلنے کے لیے ان پانچ ارکان کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔ جو شخص ان کا حق ادا نہیں کرتا وہ اسلام کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث، دونوں میں ان عبادات کی غیر معمولی تاکید اور ان کا غیر معمولی اجر ہے اور ان میں غفلت اور کوتاہی برتنے پر شدید عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان عبادات کی غیر معمولی اہمیت ہے جن کے باعث مشہور حدیثِ جبرئیل میں سائل کے سوال کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عین اسلام قرار دیا ہے:

"کہا، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟ فرمایا، اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکواۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر تم وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہو"۔ [بخاری، مسلم]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ان اعمال کا دین میں کیا مقام ہے۔

اللہ کو یاد کرنا:

اللہ کے عظیم احسانات اور ان کی شکر گزاری اور اس سے محبت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کریں۔ اس طرح کہ ہم اس سے اور بھی محبت کرنے لگیں گے، ہمیں اس کے تصور کا اور بھی زیادہ استحضار ہوگا، ہمارے دل میں اس کا خوف اور زیادہ پیدا ہوگا، عاجزی، نیاز مندی اور سر فگندگی کے جذبات پروان چڑھیں گے اور ہم اللہ کی رضا اور اس کے دین پر زیادہ سے زیادہ چل سکیں گے اور اس سب کے نتیجہ میں ہم اللہ کی محبت کے مستحق ہو جائیں گے۔ قرآن پاک میں ہے:

"تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گااور میری ناشکری نہ کرو"۔[البقرۃ: ۱۵۲]

اور جسے اللہ یاد کرے اور یاد رکھتے، اسے اور کیا چاہیے؟ دنیا و آخرت میں اسے کس چیز کی کمی؟ اللہ کے سچے بندے جو اللہ سے محبت رکھے اور ہر حال میں اس کی راہ چلنا چاہتے ہیں، کھڑے، بیٹھے، لیتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے"۔[ال عمران:۱۹۱]

اللہ کے ذکر کی دوسری اہم شکل فہم و خشوع کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت ہے:

"جس کتاب کی وحی تمھاری طرف کی گئی ہے اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو"۔

[العنکبوت:۴۵]

اللہ کی یاد کی ایک اور موثر شکل، دعا ہے جو تضرع وزاری کے ساتھ اللہ سے مانگی جائے:

"اپنے رب سے دعا مانگو گڑگڑا کر اور چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

[الاعراف:۵۵]

آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا نہ مانگنا یا اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا حدِ بندگی سے تجاوز کرنا ہے۔ دعا بندگی و عاجزی کا مظہر ہے۔

اللہ کی یاد کی ایک اور موثر شکل مختلف اوقات میں مختلف مواقع کی مسنون دعائیں اور اذکار ہیں، جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انھی مواقع پر اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ اللہ کے سچے بندے کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس سلسلے میں بہترین اسوہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں مختلف کام کرتے، اللہ کو کس طرح اور کن الفاظ میں یاد کرتے تھے، احادیث کے ذخیرے میں آج یہ سب کچھ محفوظ ہے۔ کاش ان بے بہا موتیوں سے ہم اپنا دامن بھر سکتے!

اللہ کے ذکر کی ایک اور موثر شکل توبہ و استغفار ہے۔ جب بھی ہم سے کوئی چھوٹی بڑی غلطی ہو جائے، اور غلطی کس سے نہیں ہوتی، تو ہم نادم و پشیمان ہوں، رو رو کر اللہ سے اپنے

گناہوں کی معافی مانگیں، آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے اور بندگیٔ رب کے راستے پر چلنے کا عہد کریں۔ قرآن پاک میں توبہ کی تلقین اس طرح کی گئی ہے۔

”اے ایمان لانے والو! اللہ سے توبہ کرو، خالص اور سچی توبہ امید ہے کہ تمھارا رب تم سے برائیوں کو دور کردے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی“۔[التحریم: ۸]

توبہ گنہگاروں ہی کی نہیں، متقی بندوں کی بھی صفت ہے کہ جیسا قرآن پاک میں ہے:

”اور مغفرت مانگتے ہیں سحر (صبح) کے وقت“۔[ال عمران: ۱۷]

حقیقت یہ ہے کہ احتساب و استغفار انسان کی تربیت و تزکیہ کے لیے اکسیر کا حکم رکھتے ہیں اور تزکیہ ہی وہ چیز ہے جو اللہ کو بے حد پسند ہے۔ اسی لیے توبہ سے نہ صرف یہ کہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں بلکہ بندہ اللہ کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے قرب کا مستحق ہوجاتا ہے اور یقیناً یہ بھی اللہ کی یاد ہی کی ایک اعلیٰ شکل ہے کہ بندۂ مومن اللہ کی کتاب اور اس کے دین کی تعلیمات کو سیکھے، سکھائے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ان تعلیمات کو عام کرنے میں لگا رہے۔ حدیث میں ہے:

”تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے“۔[بخاری، مسلم]

ایک اور حدیث میں قرآن کے اجتماعی مطالعہ اور درس وتدریس کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

”اور جو لوگ اللہ کے کسی گھر (مسجد) میں جمع ہو کر کتابِ الٰہی کو پڑھیں، پڑھائیں، سمجھیں، سمجھائیں (اللہ کی) سکینت و طمانیت ان پر نازل ہوگی۔ (اللہ کی) رحمت ان کو ڈھانپ لے گی، فرشتے ان پر سایہ کریں گے اور اللہ اپنے مقربین میں انھیں یاد فرمائے گا“۔[مسلم]

کتنی وجد انگیز اور روح پرور ہے یہ حدیث کاش ہم اس گروہ میں شامل ہوسکتے۔

اللہ سے ڈر اور اسی پر بھروسہ:

اللہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے اذن اور مشیت سے ہوتا ہے۔ وہی ہر ایک کو وجود بخشتا اور موت دیتا ہے، وہی ہر شے کو پالتا اور تمام ضروریات فراہم کرتا ہے۔ زندگی، موت، نفع، نقصان، مرض، شفا، عزت، ذلت، دولت، حکومت، اولاد،

رزق، قسمت، غرض دنیا و آخرت کی ہر شے صرف اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس قابل ہے کہ ہم اس سے رجوع کریں، اس پر بھروسہ کریں، اسے راضی کریں، اس کی نافرمانی سے بچیں، اس کی ناراضی اور عذاب سے ڈریں اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈریں کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی قوت ہے ہی نہیں جس سے کوئی اندیشہ ہو یا جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔ قرآن پاک میں ہے:

"جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اللہ کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہے"۔

اللہ پر ایمان کا صریح تقاضا یہ ہے کہ مومن اللہ سے ڈرے، اس کے سوا کسی سے نہ ڈرے:

"تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اگر تم (سچے) مومن ہو"۔[آل عمران: ۱۷۵]

"اہل ایمان کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" [ال عمران: ۱۲۲]

سچے اہل ایمان کی زندگی کا نقشہ قرآن پاک نے اس طرح کھینچا ہے:

"یہ وہ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا، (دشمن) لوگوں نے تمھارے مقابلہ کے لیے (لاؤلشکر) جمع کر رکھا ہے تو ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے کہا، اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے"۔[ال عمران: ۱۷۳]

یہ ہے سچے بندۂ مومن کی زندگی کا نقشہ، وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور اللہ سے ہر وقت ڈرتا ہے۔ وہ اللہ کے بھروسہ پر تقویٰ اور اللہ ترسی کی زندگی گزارتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں اسے موت آجاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو جیسا اس سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کا حق ہے اور تمھیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم (فرمانبردار) ہو"۔[العمران: ۱۰۲]

اللہ کی رضا کے لیے اس کی مکمل اطاعت اور محکومیت:

اللہ خالق ہے اور ہم سب اس کی مخلوق ہیں۔ اللہ مالک ہے، ہم سب اس کے مملوک ہیں۔ اللہ پروردگار ہے اور ہم سب اس کی رعیت ہیں۔ اللہ ہمارا معبود ہے اور ہم سب اس کے بندے اور غلام ہیں۔ یہ ہیں وہ رشتے جو ہمارے اور ہمارے اللہ کے درمیان ہیں۔ ان رشتوں کا

تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کا شکر ادا کریں، اس کے آگے جھکیں، اس کی رضا کے لیے جیئیں اور مریں اور پوری زندگی میں اس کے بندے اور فرمانبردار بن کر رہیں۔ قرآن پاک کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"شکر و ثنا اللہ کے لیے، جو اہل عالم کا رب ہے، رحمٰن و رحیم ہے، روزِ جزا کا مالک ہے۔ (اے اللہ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔[الفاتحہ: ۱تا۴]

یہ انسانی فطرت کی آواز ہے جس کی ترجمانی فطرت کے خالق نے کر دی ہے۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں اس آواز کو سنتے، اس پر لبیک کہتے، اللہ کا شکر بجا لاتے، اس کی بندگی و فرمانبرداری کا عہد کرتے اور اس عہد کی تکمیل کے لیے اس سے مدد چاہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"اور کچھ لوگ (یعنی اہل ایمان) ایسے ہیں کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے آپ کو (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر دیتے ہیں اور اللہ (ایسے) بندوں پر بہت مہربان ہے، اے ایمان لانے والو، اطاعت و سپردگی میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے"۔[البقرہ: ۲۰۷، ۲۰۸]

ان آیات سے واضح ہوا کہ اللہ ان بندوں کو اپنا سچا بندہ تصور کرتا ہے اور ان پر بہت زیادہ مہربان ہے جو اس کی رضا کو اپنا منتہائے مقصود بناتے ہیں اور اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے اپنے پورے وجود، اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کی زندگی اور ان کی املاک میں ان کی اپنی مرضی نہیں، اللہ کی مرضی اور اس کا حکم چلتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

"بلاشبہ اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے اس معاوضہ میں کہ ان کے لیے جنت ہے"۔[التوبۃ: ۱۱۱]

اللہ کی رضا اور جنت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ جنت اس مقام، اس عالم اور اس حالت کو کہتے ہیں جہاں اور جب اللہ اپنے بندوں سے ہمیشہ کے لیے راضی ہو جائے گا اور راضی ہو کر بے پایاں، لازوال اور ناقابلِ تصور نعمتوں اور اپنے قرب اور دیدار سے مالامال فرمائے

گا۔اللہ کی پرستش و عبادت کی طرح پوری زندگی میں اس کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی بھی ضروری ہے۔ یہ چیز خود ہمارے ایمان اور ہمارے عقیدۂ توحید کا تقاضا ہے۔ اللہ کی فرمانبرداری سے انحراف کے بعد ہم خود کو صحیح معنیٰ میں نہ مومن کہہ سکتے ہیں اور نہ مؤحد، کیونکہ اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہی نہیں، حاکم و فرماں روا بھی ہے:

"سنو اسی کے لیے ہے تخلیق اور اسی کے لیے ہے فرمانروائی"۔[الاعراف: ۵۴]

انسانوں کے اسی فرمانروا کو انسانوں کے لیے حکم دینے اور قانون بنانے کا حق ہے:

"حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اُسی کے لیے ہے"۔[یوسف: ۴۰]

اللہ کے سوا کسی کو علی الاطلاق قانون ساز ماننا شرک ہے:

"کیا ان کے یہاں (اللہ کے) ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایسا دین بنایا جس کی اجازت اللہ نے انھیں نہیں دی تھی"۔[الشوریٰ: ۲۱]

انسانوں کے لیے جائز، صحیح اور واجب الاتباع قانون صرف اللہ کا ہے، اس کے سوا کسی کے قانون کو جائز اور صحیح قانون سمجھ کر اس کی پیروی شرک ہے:

"تمھارے رب کی جانب سے تمھاری طرف جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسروں کی پیروی کر کے انھیں اللہ نہ بنالو"۔[الاعراف: ۳]

یعنی اللہ کے قانون کو صحیح اور واجب الاتباع تسلیم کرنا اور عملاً اس کی پیروی میں لگ جانا، اللہ کو رب (پروردگار، مالک، حاکم) ماننے کا صریح تقاضا ہے اور یہ مقام کسی اور کو دینا اسے خدائی اور حاکمیت کے مقام پر فائز کرنا ہے۔

اس نے اپنا دین اسی لیے بھیجا کہ انسان انسانوں کے بنائے ہوئے جاہلانہ، ظالمانہ اور غیر متوازن قوانین سے بچ سکے اور اللہ کے حکیمانہ، متوازن اور عادلانہ قوانین کے ذریعہ انسانیت کے سب، طبقوں، صنفوں، فرقوں اور قوموں کو انصاف کی نعمت مل سکے:

"بے شک ہم نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) واضح دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب یعنی (حق و انصاف کی) میزان کو اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں"۔[الحدید: ۲۵]

یہی نہیں کہ اللہ کا بھیجا ہوا قانون اور نظامِ زندگی ہی منصفانہ اور معتدل و متوازن نظام ہے بلکہ وہی دنیا و آخرت، دونوں میں فلاح و کامرانی کا ضامن ہے۔ ایسا قانون اور ایسا نظامِ زندگی اللہ ہی دے سکتا تھا اور اللہ نے ہمیں ایسا ہی دین دیا:

"یہ لوگ (اہل ایمان) اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ (دنیا و آخرت میں) کامیاب ہیں"۔[البقرہ:۵]

اللہ کے رسول، اللہ کا دین اور اس کا قانون لے کے مختلف قوموں اور ملکوں میں آتے رہے:

"ایسی کوئی قوم نہیں جس میں اللہ کی طرف سے کوئی آگاہ کرنے والا (نبی) نہ آیا ہو"۔ [فاطر:۲۴]

سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں کے رہنما و پیشوا بن کر آئے:

"(اے محمد) ہم نے تمھیں سب انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔[سبا:۲۸]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں"۔[احزاب:۴۰]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ کی بندگی اور شکر گزاری کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے سارے معاملات میں اللہ کے آخری رسول کی کامل پیروی کی جائے:

"(اے نبی) ان سے کہو، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف فرمادے گا، اللہ غفور ورحیم ہے"۔[ال عمران:۳۱]

جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کے لیے تیار نہیں، قرآن اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا:

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی پھر ان میں ایک گروہ اس کے بعد (اطاعت سے) منہ موڑتا ہے، ایسے لوگ مومن نہیں ہیں"۔ [النور:۴۷]

الغرض لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اسلام کا بنیادی کلمہ ہے۔ اس کلمہ کا پہلا جزیہ واضح کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، انسان صرف اللہ کا بندہ ہے اور اسے پوری زندگی میں اسی کی بندگی و غلامی کرنی ہے۔ کلمہ کے دوسرے جزء سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی بندگی و غلامی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے تمام معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کے لائے ہوئے دین و شریعت کی پیروی کی جائے۔ یہی دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کی راہ ہے اور اسی راہ کو اختیار کرکے ہم اللہ کی رضا، اس کی رحمت، اس کی نصرت اور اس کا قرب پا سکتے ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کی بندگی کی اصل حقیقت ہے۔

دعا عبادت ہے

دعا۔۔۔ تین حروف پر مشتمل ایک خوبصورت لفظ ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ دنیوی مسائل ہوں یا اخروی تکالیف اور مصائب سے بچنا مقصود ہو، یہی سہ حرفی لفظ ہی امید کی ایک کرن ثابت ہوتی ہے اور اسی کو سہارا سمجھ کر بے اختیار انسان کے ہاتھ خالق کائنات کے سامنے اٹھ جاتے ہیں۔ان پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اگر آنسوؤں کے دو چار موتیاں بھی شامل ہو جائیں تو سونے پہ سہاگہ بن جاتا ہے۔

دنیا میں ہر انسان اپنی حاجت براری کے لیے دعا ہی کو آخری ذریعہ بناتا ہے حتی کہ اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ مخلوق انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی دعا کے ذریعے اپنے مسائل حل کیے ہیں۔ انھیں جو بھی مسئلہ پیش آیا دعا ہی کے ذریعے اللہ کریم سے حل کروایا۔ لغزش کی تلافی ہو، قوم کی ہدایت ہو، نافرمانوں سے نجات ہو، ولد صالح کی تمنا ہو، عبادت و بندگی کو سند قبولیت درکار ہو، اور سب سے بڑھ کر پوری بنی نوع انسانیت کے لیے رہبر و رہنما کی طلب ہو، سب مواقع پر انبیائے کریم علیہم السلام کے ہاتھ خالق کائنات کے حضور اٹھتے نظر آتے ہیں۔ خود مالک کائنات کا فرمان ہے کہ: ”و یدعوننا رغبا و رھبا وکانوا لنا خاشین“۔ ”ربنا ظلمنا انفسنا“۔ ”رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا“۔ ”رب ھب لی من لدنك ذریة طیبة“ ۔”رب لا تذرنی فردا“۔ ”ربنا تقبل منا“۔ ”رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر“۔”ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایتك“ ،اور اس جیسی دیگر آیات میں یہی مناظر بیان کیے گئے ہیں۔

دعا ہی ہے جس کے بارے میں خود باری تعالیٰ کا حکم ہے کہ ادعونی استجب لکم کہ مجھ سے مانگو میں تمھاری دعاوں کو قبول کروں گا۔ دنیا میں کسی سے مانگو تو ناک بھوں چڑھاتا ہے، لیکن کائنات کے پالنہار سے مانگو تو خوش ہوتا ہے نہ مانگو تو ناراض رہتا ہے۔

دعا عبادت ہے:

اللہ تعالیٰ سے عاجزی و انکسار کے ساتھ گڑگڑا کر مانگنا نہ صرف عبادت بلکہ تمام عبادات سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"تمھارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھے ہی پکارا کرو، میں تمھاری پکار کو پہنچوں گا اور تمھاری دعا اور پکار کو قبول کروں گا، واقعی جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عن قریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔

سیدنا نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔"پکارنا عبادت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن عزیز کی یہی آیت کریمہ استشہاد کے طور پر پڑھی کہ پکارنا عبادت ہے۔(سنن ابی داؤد)۔سیدنا ابو ہریرۃؓ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پکار اور دعا سے بڑھ کر پیاری اور عزیز چیز کوئی نہیں۔(سنن ترمذی)۔سیدنا ابو ہریرۃؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ:"جو اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے، اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے"۔(سنن ترمذی)۔سیدنا ابو ہریرۃؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ" دعا اور پکار اشرف واعلیٰ عبادت ہے"۔(الادب المفرد)۔بعض روایات حدیث میں ہے کہ": دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے"۔ (مسند ابی یعلی)۔ایک اور روایت میں ان الفاظ میں منقول ہے کہ:"دعا عبادت کا مغز ہے"۔(سنن ترمذی)

الغرض اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اعلیٰ ترین عبادت ہے، دعا مانگنا توحید کا اعتراف اس سطح پر جا کر کرنا ہے جس سے زیادہ بلند سطح کا تصور بھی مشکل ہے۔ کوئی بندہ اپنے رب سے مانگ کر شرک سے اپنی بے زاری اور توحید پر ایمان کا عملی ثبوت دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس یقین اور اعتماد کا اظہار ہے کہ وہی ہر نفع و نقصان کا مالک ہے۔ وہ نفع و نقصان جس کی نسبت جب غیر اللہ کی طرف کی جاتی ہے تو شرک کی نت نئی اقسام وجود میں آجاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن و حدیث اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنے اور تنہا اسے ہی پکارنے کی تاکید کرتے ہیں۔اپنی اس اہمیت کی بنا پر دعا تمام انبیا اور صالحین کا وظیفہ رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے سے پکارو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(سورۃ الاعراف ۷ : ۵۵)

حافظ جلال الدین سیوطی زیر بحث آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”اپنے پروردگار سے عاجزی اور فروتنی کے ساتھ مانگا کرو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا، یعنی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو چیخ کر بلند آواز سے دعا کرتے ہیں“

اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

”دعا میں تجاوز کرنا یہ بھی ہے کہ دعا کرنے والا ایسی چیز کا مطالبہ کرے جو اس کو حاصل نہیں ہو سکتی، مثلاً یہ کہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کی دعا کرے، یا ایسی چیز حاصل کرنے کی دعا کرے جو فی نفسہ محال ہو، یا آخرت میں انبیائے کرام کے درجہ تک پہنچنے کی دعا کرے، یا چلّا کر بلند آواز سے دعا کرے۔

حافظ ابن قیم آہستہ دعا کرنے کے دس فوائد اور حکمتیں بیان کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) آہستہ دعا کرنا ایمان کی بہت عظمت ہے۔

(۲) اس سے ادب کا بہت بڑا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

(۳) عاجزی اور خشوع میں یہ بہت بڑا دخل رکھتا ہے۔

(۴) اخلاص میں بھی اس کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

(۵) اس سے اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں جمعیت قلبی حاصل ہوتی ہے۔

(٦) آہستہ دعا کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا تعلق نمایاں ہوتا ہے۔

(۷) یہ دوام طلب کی طرف بہت داعی ہے۔

(۸) یہ خشوع کو قطع کرنے والے اسباب و مشوشات سے بعید تر ہے۔

(۹) یہ حاسد کے مکر و فریب سے بعید تر ہے۔

(۱۰) دعا چونکہ ذکر ہے اور ذکر کا اخفا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ثابت ہے، اس لیے دعا بھی آہستہ ہی ہونی چاہیے (بدائع الفوائد)

دعا کی قبولیت کے خاص اوقات:

دعا ہر وقت مقبول ہو سکتی ہے، مگر جو اوقات یہاں لکھے جاتے ہیں ان میں مقبول ہونے کی توقع بہت زیادہ ہے، اس لیے ان اوقات کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

(۱) شب کے آخری پہر اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو آواز دیتے ہیں کہ مجھ سے کوئی مانگنے والا ہے کہ میں اس کی حاجت پوری کروں، کوئی معافی مانگنے والا ہے کہ اس کی خطاء معاف کروں"۔ (صحیح بخاری)

(۲) اذان و اقامت کے مابین کا عرصہ نہایت بیش قیمت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "اذان و اقامت کے مابین دعا رد نہیں کی جاتی، صحابہ نے پوچھا: ہم اس وقت کس قسم کی دعا مانگ سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ سے دنیا اور آخری کی عافیت طلب کرو"۔ (مسند احمد سنن ترمذی)

(۳) کسی مسلمان کی غیر موجودگی میں اس کے لیے دعا کرنا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "مسلمان کی وہ دعا مقبول ہوتی ہے جو وہ اپنے بھائی کے لیے کرتا ہے، اس کے سر کے قریب ایک فرشتہ کھڑا ہوتا ہے، جب وہ کوئی خیر کی دعا کرتا ہے، تو اس پر فرشتہ آمین کہتا ہے، اور دعا دیتا ہے کہ تمھیں بھی ایسا ہی خیر مل جائے"۔ (صحیح مسلم)

(۴) جمعہ کے دن ایک مخصوص وقت: سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "جمعہ کے روز ایک ایسی ساعت بھی ہے، جس میں کوئی مسلمان نماز پڑھے، اور اللہ تعالیٰ سے کسی خیر کو طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ عطا فرمائیں گے، آپ اپنے ہاتھ کے اشارے سے سمجھا رہے تھے کہ یہ وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے"۔ (صحیح بخاری)

(۵) لیلۃ القدر جس کی فضیلت قرآن عزیز میں وارد ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اگر میں اسی رات جاگتی رہی، تو مجھے کیا پڑھ لینا چاہیے؟ آپ نے فرمایا، یہ دعا پڑھنی چاہیے:

اللھم انك عفو، تحب العفو، فاعف عنی (سنن ترمذی)

یا اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، تو معاف کرنے کو پسند فرماتا ہے، پس مجھے معاف کیجیے۔

سنن ترمذی کی روایت میں "عفو" کے بعد "کریم" کا اضافہ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ آداب کے ساتھ ان مخصوص و مقبول اوقات میں دعا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

حج ایک عظیم عبادت

اسلام نے انسانی عبادات کا جو نظام دیا ہے وہ انتہائی کامل اور منظّم ہے، جس سے انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں امن وسکون، راحت واطمینان بخشنے کے ساتھ ساتھ زندگی کو بامقصد بنانے اور اُسے منظّم طریقے سے گزارنے کا ہنر بھی سکھاتا ہے۔اس غرض کی خاطر اسلام نے انسان کو کچھ عبادتیں اس طرح کی دی ہیں کہ وہ انھیں ہر روز ادا کرے، جیسے نماز، کچھ ایسی ہیں جو ہفتہ میں ایک مرتبہ ادا کیے جاتے ہیں۔ جیسے: جمعہ کی نماز۔کچھ ایسی ہیں جو سال میں ایک مرتبہ ادا ہوتی ہیں، جیسے: زکوٰۃ اور روزہ۔ کچھ عبادتیں ایسی ہیں جنھیں عمر بھر میں ایک مرتبہ کرنے کا پابند کیا گیا ہے،البتہ اختیاری طور پر کرے تو اس کا نصیب ہے۔ یہ عبادت "حج" ہے۔

حج انتہائی فضیلت والی عبادت ہے۔اس کا حکم بھی اللہ تعالیٰ نے بڑے عجیب انداز میں دیا ہے۔ فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے ان لوگوں پر جو اللہ کے گھر حاضری کی استطاعت رکھتے ہوں کہ انھیں زیارت کے لیے ہمارے در پہ ضرور حاضری دینی ہے۔اس انداز میں بڑی محبت بھی ہے، ناز و دولار بھی ہے اور اس دعوت پر لبیک نہ کہنے والوں کے لیے وعید کا پہلو بھی ہے۔

احادیث طیبہ میں حج کے فضائل بہت کثرت سے ارشاد فرمائے گئے ہیں ایک حدیث میں ہے کہ "جس نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حج کیا پھر اس میں نہ کوئی فحش بات کی اور نہ نافرمانی کی تو وہ ایسا پاک وصاف ہو کر آتا ہے جیسا ولادت کے دن تھا"۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ عرض کیا گیا اس کے بعد، فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ عرض کیا گیا اس کے بعد، فرمایا: حج مبرور"۔ ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ درمیانی عرصہ کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ اور ہی نہیں ہو سکتی۔ایک اور حدیث میں ہے کہ پے در پے حج و عمرے کیا

کرو۔ کیونکہ یہ دونوں فقر اور گناہوں سے اس طرح صاف کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کو صاف کر دیتی ہے۔اور حج مبرور کا ثواب صرف جنت ہے"۔

حج ایسی عظیم عبادت ہے کہ اس میں جان بھی لگتی ہے، مال بھی خرچ ہوتا ہے۔ دونوں چیزیں انسان اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس پر دوسری عبادتوں سے بڑھ کر وعدے کیے گئے ہیں کہ حج مبرور کی کوئی جزا ہی نہیں سوائے جنت کے۔

حج عشقِ الٰہی کا مظہر ہے اور بیت اللہ شریف مرکز تجلیات الٰہی ہے۔اس لیے بیت اللہ شریف کی زیارت ، بارگاہ الٰہی اور محبوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری مومن کی جان تمنا ہے۔ اگر کسی کے دل میں یہ آرزو چٹکیاں نہیں لیتیں تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان کی جڑیں خشک ہیں۔ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص بیت اللہ تک پہنچنے کے لیے زاد و راحلہ رکھتا تھا اس کے باوجود اس نے حج نہیں کیا تو اس کے حق میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ نصرانی ہو کر مرے یا یہودی ہو کر مرے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ

" جس شخص کو حج کرنے سے نہ کوئی ظاہری حاجت مانع تھی، نہ سلطان، نہ بیماری کا عذر تھ اور اس نے حج نہ کیا تو اسے اختیار ہے کہ خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ (مشکوٰۃ)

حج سراپا عشق ہے کیونکہ اس میں انسان خدا کے راستے میں اپنی دونوں محبوب چیزیں، جان اور مال قربان کرتا ہے۔ جب انسان کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو محبت میں کمال حاصل کرنے اور مرتبہ عشق تک پہنچنے کے لیے مراتب طے کیے جاتے ہیں۔ اسلام کے نظام عبادات میں بھی عشق و محبت کے مراحل طے کروائے جاتے ہیں۔ عشق مجازی میں اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو وہ سب سے پہلے کیا کرتا ہے؟ اس کا نام لینا اسے اچھا لگتا ہے یا کوئی اس کے سامنے نام لے تو اسے سننا اچھا لگتا ہے۔ کلمہ پڑھنا ایسا ہی ہے۔ پھر اس سے گفتگو، بات چیت کرنے میں اسے مزہ آنے لگتا ہے، تو یہ ایسے ہے جیسے نماز میں مناجات کی جاتی ہیں۔ پھر وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتا ہے، ہدیہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایسی

مثال ہے جیسے زکوٰۃ دی جاتی ہے یا دیگر مالی عبادتیں کی جاتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بھوک پیاس سے لاپرواہو جاتا ہے، جیسے روزہ رکھنا۔ کچھ اور آگے جائیں تو اپنے آپ سے بے نیاز ہو کر محبوب کے در کے چکر لگاتا ہے۔ حج اور طواف اس کی ایک مثال ہے۔

آخر میں مراتب عشق کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ بالآخر اس کی خاطر جان بھی قربان کر ڈالتا ہے، جیسے جہاد۔ یہ ایک تیسرا پہلو ہے جس سے ہم جائزہ لے سکتے ہیں کہ شریعت نے ہمیں عبادات کا کتنا جامع نظام دیا ہے اور اس کو پوری طرح سے اپنانے میں ہماری دنیا و آخرت کی کتنی عظیم فلاح پوشیدہ ہے۔

حج کی ابتدا

آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق کی سر زمین "اُر" میں سید ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وقت ساری دنیا اللہ تعالیٰ کو بھول چکی تھی اور قومی و بین الاقوامی سطح پر انسانیت دو قسم کے شرک میں مبتلا تھی۔ (۱) انسانی الوہیت (مخلوق کی عبادت اور پوجا پاٹ) (۲) انسانی حاکمیت (شہنشاہیت اور مخلوق کی اطاعت و غلامی) اس وقت روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اپنے اصلی مالک، خالق اور حاکم کو پہچانتا ہو اور صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرتا ہو۔

ابراہیمؑ کی قوم جو اس وقت دنیاوی ترقی میں سب قوموں سے آگے تھی وہ بھی اس بات کو نہ سوجھتی تھی کہ مخلوق کبھی بھی معبود ہونے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ ستاروں اور نیک ہستیوں کے مجسموں کی پرستش کرتے، نجوم، فال گیری، غیب گوئی، جادو ٹونے، تعویذ گنڈے اور طرح طرح کے توہمات کا ان میں خوب چرچا تھا جیسے آج کل کے ہندوؤں اور نا سمجھ مسلمانوں میں ہے۔ ان میں بھی مجاوروں اور پجاریوں کا بھی ایک طبقہ موجود تھا۔ جیسے ہمارے ہاں ہندوؤں کے پنڈت اور مسلمانوں میں درباروں کے مجاور پجاری، جو مندروں اور درباروں کی حفاظت بھی کرتے ہیں، لوگوں کو پوجا بھی کراتے ہیں، شادی غمی وغیرہ کی رسمیں بھی ادا کرتے اور غیب کی خبریں بھی لوگوں کو بتانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ تمام لوگ ان کے پھندے میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ انھی کو اپنی اچھی بُری قسمت کا مالک سمجھتے تھے۔

ان پجاریوں کے ساتھ بادشاہوں کی بھی ملی بھگت تھی۔ عام لوگوں کو اپنا بندہ اور غلام بنا کر رکھنے میں بادشاہ پجاریوں کے مددگار تھے اور پجاری بادشاہوں کے۔ الغرض یہی دو چیزیں (۱) انسانی الوہیت (۲) انسانی حاکمیت، ان لوگوں کی گمراہی کے بنیادی اسباب تھے۔ ایسے زمانے اور حالات میں ابراہیم علیہ السلام نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولی، وہ خود پیروں اور پجاریوں کا گھرانا تھا۔ آپ کے باپ دادا اپنی قوم کے پیر اور پجاری تھے۔ ظاہر بات ہے کہ باپ دادا کی وہی گدی ابراہیم علیہ السلام کے لیے تیار تھی جس پر بیٹھ کر وہ اپنی قوم کے پیشوا بن سکتے تھے اور وہی مراعات و سہولیات آپ علیہ السلام کو حاصل ہو سکتی تھیں، لیکن آپ نے

اس قدر زبردست ذاتی و خاندانی فائدوں کو لات مار کر محض سچائی اور حق کے پیچھے دنیا بھر کی مصیبتیں مول لینے پر آمادہ ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی ان کا یہ ایمان تھا اور من جانب اللہ اس بات کو جانتے تھے کہ سورج، چاند اور تارے خود غلاموں کی طرح گردش کر رہے ہیں، یہ نیک ہستیوں کے پتھر کے بت اور مجسمے جن کو انسان خود اپنے ہاتھ سے بناتے اور تراشتے ہیں اور یہ بادشاہ و شہنشاہ جو ہم ہی جیسے انسان ہیں، آخر خدا، حاجت روا، مشکل کشا اور حاکمیت اعلیٰ کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں اور ساتھ یہ اعلان بھی کیا؟

”میں نے سب سے منہ موڑ کر صرف اسی ذات کو عبادت و بندگی کے لیے خاص کر لیا ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہر گز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں“

[سورۃ انعام:۹۷]

یہ اعلان کرنا کیا تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ باپ نے دھمکی دی کہ میں تجھے عاق کر دوں گا اور گھر سے نکال باہر کروں گا۔ قوم نے کہا ہم میں سے کوئی تمھیں پناہ دینے والا نہیں ہو گا۔ حکومت بھی مخالف ہو گئی مگر وہ یک و تنہا انسان سب کے مقابلہ میں سچائی اور دین کے خاطر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باپ اور قوم کے باطل اور مشرکانہ دین کے خلاف آواز حق بلند کی اور بادشاہ کی طاغوتی نظام کو بھی للکارا۔ آخر کار شاہی دربار سے ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کا حکم جاری ہوا۔ اس سے بھی اس جبل استقامت کے ارادہ اور دعوت میں کوئی فرق نہیں آیا اور سزا کے لیے بھی تیار ہوئے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو آگ میں جلنے سے بچایا تو وہ اپنے گھر بار، عزیز و اقارب قوم اور وطن سب چھوڑ کر صرف اپنی بیوی اور ایک بھتیجے سیدنا لوط علیہ السلام کو لے کر غریب الوطنی میں ملک ملک کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑ ہوا۔

وطن سے نکل کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام شام، فلسطین، مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے رہے۔ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ اسی مسافرت کی زندگی میں ان پر کیا کیا گزری ہو گی، مال و زر کچھ ساتھ لے کر نہیں نکلے تھے اور باہر نکل کر اپنی روٹی کمانے کی فکر میں بھی نہیں پھر رہے تھے۔ بلکہ دن رات اگر فکر تھی تو یہ کہ لوگوں کو ہر ایک کی بندگی سے نکال کر

صرف اللہ کا بندہ بنائیں۔ وہ مرد حنیف نہ صرف خود ہی اللہ کے سوا کسی کی خدائی ماننے کے لیے تیار تھے بلکہ دوسروں سے بھی اعلانیہ کہتے پھرتے تھے کہ ایک اللہ کے سوا تمھارا کوئی مالک آقا، حاکم، معبود نہیں، باقی سب کی آقائی وخداوندی کا تختہ الٹ دو اور صرف ایک اللہ کے بندے بن کر رہو۔ آخیر عمر میں جب تقریبا ۹۰ برس پورے ہونے والے تھے اور اولاد سے مایوسی ہو چکی تھی تو اللہ نے مہربانی فرما کر اولاد دی لیکن اس اللہ کے جلیل القدر بندے کو اب بھی یہ فکر نہ ہوئی کہ خود خانماں برباد ہوا ہوں تو کم از کم اپنے بچوں ہی کو دنیا کمانے کے قابل بناؤں اور انھیں کسی ایسے کام پر لگاؤں کہ روٹی کا سہارا مل جائے، نہیں، بلکہ اس عظیم انسان کو فکر تھی کہ جس مشن کو پھیلانے میں خود اس نے عمر کھپادی، کاش کوئی ایسا ہو جو اس کے مرنے کے بعد بھی اس مشن کو پھیلاتا رہے اور اسی غرض کے لیے اللہ سے اولاد کا آرزو مند تھے۔ اولاد دینے کے بعد ایک بڑی اور آخری آزمائش ابراہیم علیہ السلام پر یہ بھی اللہ کی طرف سے آن پڑی کہ اپنے اس اکلوتے بیٹے کو رب العالمین کی خاطر قربان کر ڈالو۔ چنانچہ اشارہ پاتے ہی اپ اس کے لیے بھی تیار ہوئے۔ ان تمام آزمائشوں میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو دنیا کا امام بنا دیا ”اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان میں پورا اتر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھ کو تمام انسانیت کا امام بناتا ہوں“۔ اس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام امامت عالم پر سرفراز کیے گئے اور وہ اسلام کی عالمگیر اور بین الاقوامی تحریک ”حنیفیت“ کے لیڈر اور امام بن گئے۔

ابو الانس سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر ابو الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک تقریباً جتنے انبیاء نے آئے، کام کیا، قوم کو دعوت دی اور معاشرہ میں انقلاب برپا کرنے کی جو محنت کی تو ان کا یہ کام، دعوت قومی سطح پر دین کا کام، دعوت اور قومی انقلاب تھا۔ جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پہلے انسان اور پیغمبر ہیں جنھوں نے انسانیت عامہ کو اپنے فکر کا محور بنایا اور بین الاقوامی سطح پر انقلاب لانے اور عالمی دعوت کی ابتدا کی۔ اس حیثیت سے آپ امام الناس یعنی نوع انسانی کے لیڈر اور پیشواء اور امام الناس کہلائے۔

غرض اس اپنے عظیم فکر کے ذریعے ابراھیمؑ نے ایک طرف دنیا میں انسانی الوہیت (شنشاہیت، مطلق العنان بادشاہی) کا خاتمہ کر دیا تو دوسری طرف خدا شناسی کو عام کرکے انسانی الوہیت کا بھی خاتمہ کر دیا اور تمام انسانوں کو اللہ کی بندگی میں لا کر مساوات کے سٹیج پر لا کھڑا کر دیا۔

اب ان کو اس عالمگیر تحریک کی اشاعت کے لیے ایسے آدمیوں اور نائبوں کی ضرورت پیش آئی جو دنیا کے مختلف اطراف اور علاقوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں اور ان کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے کام کریں۔ لہٰذا اس کام میں تین آدمی آپؑ کے لیے قوت باز و ثابت ہوئے۔ ایک ان کے بھتیجے سیدنا لوطؑ جس کو آپؑ نے مشرق اردن کے علاقے سدوم میں بٹھایا جس سے ایران، عراق اور مصر کے درمیان آنے والے سب تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ دوسرا آپؑ کے صاحبزادے سیدنا اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) کے علاقے میں آباد کیا۔ یہ علاقہ شام اور مصر کے درمیان واقع ہے اور سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں پر بھی یہاں سے اثر ڈالا جا سکتا تھا۔ یہیں سے اسحاقؑ کے بیٹے سیدنا یعقوبؑ اور پوتے سیدنا یوسفؑ کی بدولت اسلام کی یہ عالمگیر تحریک مصر تک پہنچی۔

تیسرا سیدنا ابراھیمؑ کے بڑے صاحبزادے سیدنا اسماعیلؑ کو حجاز میں مکہ کے مقام پر رکھا اور ایک مدت تک خود ان کے ساتھ رہ کر عرب کے تمام گوشوں میں اس تحریک حنیفیت کی تعلیم پھیلائی۔ اور پھر یہی سے سیدنا اسماعیلؑ کی اولاد میں اس بین الاقوامی تحریک اسلام کی تکمیل کے لیے آخری نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔

باپ سیدنا ابراھیمؑ اور بیٹے سیدنا اسماعیلؑ نے پھر مل کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس عالمگیر بین الاقوامی اسلامی تحریک کا مرکز بھی تعمیر کیا جو خانہ کعبہ کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ یہ عالمی عمارت عبادت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ روز اول ہی سے دین اسلام کی عالمگیر اور بین الاقوامی تحریک، تبلیغ و اشاعت کا مرکز قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہاں ایک خدائے واحد کے ماننے والے فرزندانِ توحید ہر جگہ سے کھینچ کھینچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر اللہ کی عبادت اجتماعی طریقے سے ادا کریں، اسلام کی عالمگیر پیغام کو لے کر پھر

اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں اور ابراھیمؑ کی بین الاقوامی دعوت توحید فی الالوھیت اور توحید فی الحاکمیت وربوبیت کی فکر کو یہاں سے جلا بخشے۔اسی غرض کے لیے اس بین الاقوامی مرکز میں اسلام کا ایک عالمگیر اجتماع مقرر کیا گیا جسے حج کہا جاتا ہے الغرض حج کی ابتداء اس عظیم مقصد کے لیے ،ابراھیمؑ کے ذریعے تعمیر کعبہ کے اسی اعلان سے ہوا کہ واذن فی الناس بالحج۔۔الایۃ، جو آج امت محمدیہ (علی صاحبھا الفاتحیۃ وسلام) کا خصوصی امتیاز اور انفرادی شان ہے۔

قربانی کی تاریخ اور حقیقت

قربانی رسم نہیں ایک عبادت بلکہ روح عبادت کی تصویر ہے۔ بائبل کی عہد قدیم اور عہد جدید میں جو صحائف انبیا جمع ہیں ان سب میں قربانی کا حکم پایا گیا ہے۔ قربانی یعنی کسی حلال جانور کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کرنا اس وقت شروع ہوا ہے جب سے آدم علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے اور دنیا آباد ہوئی۔ سب سے پہلے قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے دی۔ اذ قربا قربانا۔ یعنی جب کہ دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی۔

علامہ ابن کثیرؒ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ ہابیل نے ایک مینڈھے کی قربانی پیش کی اور قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار سے کچھ غلہ وغیرہ صدقہ کرکے قربانی پیش کی۔ حسب دستور آسمان سے آگ نازل ہوئی، آگ نے ہابیل کے مینڈھے کو کھا لیا اور قابیل کی قربانی کو چھوڑ دیا۔ قربانی کے قبول ہونے یا نہ ہونے کی پہچان پہلے انبیا کے زمانہ میں یہ تھی کہ جس قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے تو ایک آگ آسمان سے آتی اور اس کو جلا دیتی تھی یہی قبولیت کی علامت تھی جیسا کہ سورۃ آل عمران میں اس کا ذکر صراحۃ آیا ہے کہ:

بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ "یعنی وہ قربانی جس کو آگ کھا جائے۔"

اسی طرح اس زمانہ میں کفار سے جہاد کے ذریعہ جو مال غنیمت ہاتھ آتا تو اس کو بھی آسمان سے آگ نازل ہو کر کھا جاتی اور یہ جہاد کے مقبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوا کہ قربانی کی گوشت اور مال غنیمت ان کے لیے حلال کر دیے گئے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خصوصی فضائل اور انعامات الٰہیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا احلت لی الغنائم یعنی میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعض غیر مسلموں نے اسلام قبول نہ کرنے کا ایک عذر یہ بھی پیش کیا کہ پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کی

قربانیوں کو آگ کھا جایا کرتی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا نہیں ہوتا، اس لیے ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ صورت ظاہر نہ ہو۔ سورۂ آل عمران میں اس عذر لنگ کو بیان کرکے یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں قربانیوں کو آگ نے کھایا تھا تم انھیں پر کونسا ایمان لائے ہو، تم نے تو ان کو بھی جھٹلا دیا ہے بلکہ ان کے قتل تک سے دریغ نہ کیا تھا۔ دراصل ان کا یہ قول حق طلبی کے لیے نہیں بلکہ حیلہ جوئی کے لیے تھا۔

جانور کی قربانی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے عبادت اور تقرب الٰہی کا ذریعہ قرار دی گئی ہے اور قربانی کا خاص ایک طریقہ کہ آسمانی آگ آکر اس کا جلا دے۔ یہ خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تمام انبیائے سابقین کے دور تک مشہور رہا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی اللہ کی طرف سے خواب میں اپنے لخت جگر کے قربان کرنے کا حکم ملا، اشارہ پاتے ہوئے باپ بیٹا دونوں تیار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سچی تعمیل اور اخلاص کی بدولت جانور کی قربانی کو بیٹے کی قربانی کا قائم مقام بنایا اور اس مبارک و عظیم قربانی کی یادگار اس ملت حنیفیہ میں جاری رکھی اور ہر سال اس کا دہرانا اہل استطاعت پر لازم کر دیا گیا۔

ابراہیمؑ کے بعد زمانہ جاہلیت میں بھی قربانی کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر وہ بتوں اور غیر اللہ کے نام پر قربانی کرتے تھے، اسی طرح آج تک دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر، یا مسیح یا کسی اور بزرگ ہستی کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ سورۂ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہو سکتی، قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہیے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد دس سال تک مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال پابندی سے قربانی فرماتے تھے، جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظّمہ کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ ہر شخص پر ہر شہر میں شرائط کے بعد واجب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اس کی تاکید بھی صفرماتے تھے۔ اسی لیے جمہور علمائے اسلام کے

نزدیک قربانی واجب ہے۔اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا۔مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھیے ،ان کو یہ گوارانہ ہوا۔اس لیے حکم دیا کہ تم جانور ذبح کردو، ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا۔

قربانی کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے۔ صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثار نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے۔تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کیے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔ نماز میں نماز کی روح، زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے، غرض اللہ تعالیٰ نے جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی۔اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

"تم خیر کامل کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔"

(آل عمران)

اور مال محبوب چیز ہے۔مال میں سے جانور بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔اس لیے کہ اگر بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسرا گھڑ کر بنا سکتا ہے، بخلاف جاندار کے کہ اگر فنا ہو گیا دوسرا ویسا نہیں ملتا اور یہ مال ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے، اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کو خرچ نہ کرے۔ توجب دنیوی منافع اس کو خرچ کیے بغیر نہیں مل سکتے تو اللہ تعالیٰ کی رضا (خوشنودی) جو اعلیٰ ترین نفع ہے، وہ محبوبات نفس قربان کیے بغیر کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

وہ محبوبات کیا ہیں؟ جان، مال، اولاد، عزت، آبرو وغیرہ۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا"۔ (توبہ)

غرض کہ آپ کو ان میں سے ہر چیز مٹانی ہو گی، تب کہیں بندگی کا اظہار ہو گا۔ درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں، جیسے

اگر سونا خرید ا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھس گھسا کر دیکھا جاتا ہے، اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں ورنہ نہیں۔ تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔

پس اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہو گی وہ ہمارے اعمال، ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔ اس لیے جنت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں ''محبوبات نفس'' کو قربان کرنا لازمی ہے۔ اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو، جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو، عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو، یہی عشق کی پختگی کی علامات ہیں۔

صدقے کا بہترین اصول

بزرگوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ مخصوص کر دیا جائے، مثلاً: ایک فیصد یا دس فیصد، جتنی استطاعت ہو، اس حساب سے متعین کر لیا جائے اور پھر وہ اتنا پیسہ صدقہ کے طور پر دے دیا جائے۔ البلاغ مفتی اعظم نمبر کی پہلی جلد میں مفتی اعظم تاثراتی مضمون "میرے والد میرے شیخ" میں رقمطراز ہیں:

"حضرت والد صاحبؒ کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا بڑا ذوق تھا اور آپ مصارفِ خیر میں حصہ لینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ انفاق کا یہ معمول تنگی وفراخی ہر حالت میں جاری رہا اور اس کے لیے جو طریق کار اپنایا ہوا تھا وہ بڑا سبق آموز اور لائق تقلید ہے۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک معین حصہ فوراً مصارف خیر میں خرچ کرنے کے لیے علیحدہ فرما لیتے اور طے کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو بیسواں حصہ (پانچ فی صد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے: مثلاً انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے۔۔۔۔ صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا، جس پر صدقات و مبرات لکھا رہتا تھا۔ تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراخی کا۔ آمدنی کا مذکور حصہ آپ فوراً اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے اور جب تک یہ حصہ صدقات و مبرات کے تھیلے میں نہ چلا جاتا، اس وقت تک اس آمدنی کو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اگر دس روپے بھی کہیں سے آئے ہیں تو فوراً اس کے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر: ۱/ ۴۵۹)

اسی طرح البلاغ مفتی اعظم نمبر کی دوسری جلد میں مفتی عبدالرؤف سکھروی کے والد صاحب مفتی عبدالحکیمؒ اپنے مضمون "حضرت مفتی اعظم کا اندازِ تربیت" میں حضرت کے ملفوظات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نماز کی ادائیگی کی ظاہری و باطنی اصلاح کرے اور کچھ نہ کچھ انفاق بھی کیا کرے"۔

حضرت مولانا تھانویؒ اپنی کمائی کا ایک تہائی خیرات کردیا کرتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اپنی کمائی کا ایک خمس (یعنی پانچواں حصہ) خیرات کرتے تھے۔ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ کو دیکھا کہ ان کے پاس تین چپاتیاں آتی تھیں، ان میں ڈیڑھ چپاتی خود تناول فرماتے، ایک چپاتی خیرات کردیتے تھے اور آدھی کسی کو ہدیہ کردیتے تھے۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر: ۸۹۱/۲)

اس ساری بات سے اس طریق کار کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ کہ کئی بزرگوں نے یہ طرز اپنانے کا اہتمام کیا۔ ویسے تو ہر شخص صدقہ کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ صدقہ کرتا ہی رہتا ہے لیکن اس التزام اور اس طرح کی پابندی کا فائدہ یہ ہوگا کہ ساری کی ساری آمدنی مکمل طور پر صدقے کی چھلنی سے چھن کر آئے گی اور گویا کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی آرہا ہے، اس کے ایک ایک پیسے کا صدقہ دیا جارہا ہے، اس طریق کار سے برکت بھی ہوگی اور صدقہ کا اہتمام بھی رہے گا کیونکہ کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا کہ جب اس کے پاس مال آیا ہو اور اس نے اس کا صدقہ نہ دیا ہو۔

اگر انسان زیادہ اوسط متعین نہیں کرسکتا تو کل آمدنی کا ایک فیصد ہی متعین کرلے یعنی کہ اگر کسی کی ماہانہ آمدنی کل ملا کے بیس ہزار روپے بنتی ہو اور اس نے ایک فیصد صدقہ متعین کیا ہوا ہے تو کل 200 روپے بنیں گے۔ اب ہوسکتا ہے کہ وہ ماہانہ بنیاد پر مذکورہ رقم سے زیادہ ہی صدقہ کیا کرتا ہو لیکن اگر یہ طریقہ اپنالیا تو ہر ہر رقم میں سے صدقہ کشید ہو کر وہ آمدنی پاکیزہ اور بابرکت ہوتی جائیگی۔ اور صدقہ میں بھی کبھی تعطل نہیں آئے گا۔

اگر اس طریق کار پر عمل کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قوی امید ہے کہ صدقے کے ظاہری و باطنی فوائد پوری طرح حاصل ہوں گے اور مال کی محبت بھی دل میں جگہ نہ بنا پائے گی۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح انفاق کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

موسم سرما نیکیوں کا موسم بہار

نیکیوں کے طلبگاروں کے لیے موسم سرما بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چار بڑے بڑے اعمال اس میں بکثرت اور بآسانی کیے جا سکتے ہیں:

(۱) روزہ:

روزے کو دین اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ موسم سرما میں دن چھوٹا اور موسم ٹھنڈا رہتا ہے اور بھوک و پیاس کا احساس کم ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے۔

موسم سرما سے فائدہ اٹھانے کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی:

"ٹھنڈی (اور آسان) نیکی یہ ہے کہ سردی کے موسم میں روزہ رکھا جائے"۔

(سنن ترمذی: ۷۹۷)

سیدنا ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سردی کا موسم مومن کے لیے بہار کا موسم ہے۔ اس کے دن چھوٹے ہوتے ہیں تو وہ روزہ رکھ لیتا ہے اور راتیں طویل ہوتی ہیں تو وہ تہجد پڑھتا ہے"۔ (سنن کبریٰ للبیھقی: ۸۴۵۶)

(۲) نماز تہجد:

تہجد اور شب بیداری نیک بندوں کا شیوہ ہے۔ موسم سرما کی راتیں لمبی ہوتی ہیں۔ عام طور پر نماز عشا سے لے کر نماز فجر تک 10 گھنٹے کا طویل وقت ہوتا ہے جو آرام اور نیند پوری کرنے کی بشری ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ بندہ اگر رات کو دیر سے بھی سوئے تو بھی تہجد کے لیے بآسانی بیدار ہو سکتا ہے۔

موسم سرما کی اس قدرتی خصوصیت سے فائدہ اٹھانے کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ سے توجہ دلائی: "سردی کا موسم مومن کے لیے بہار کا موسم ہے کہ اس

کی راتیں لمبی ہوتی ہیں جن میں وہ تہجد ادا کرلیتا ہے اور دن چھوٹے ہوتے ہیں جن میں وہ روزے رکھ لیتا ہے"۔

(۳) سردی میں وضو کے ذریعے گناہوں کی معافی:

وضو اور طہارت نماز کے لیے شرط ہے۔ وضو کرنا بڑے ثواب کا کام ہے بالخصوص موسم سرما میں وضو کے ذریعے گناہوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تمھیں ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف کردے اور تمھارے درجات بلند کردے؟" "یارسول اللہ! ضرور بتائیں"۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سردی کی مشقت اور ناگواری کے باوجود کامل وضو کرنا"۔ (صحیح مسلم: ۶۱۰)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس شخص کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، جو سرد رات میں اپنے بستر اور لحاف سے اٹھتا ہے، پھر وضو کرکے نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ میرا بندہ اتنی تکلیف کیوں برداشت کر رہا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں یہ آپ کی رحمت کا امیدوار ہے اور آپ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے ایسا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اس کو اپنی رحمت کا مستحق بنادیا اور اپنے عذاب سے بچادیا"۔ (طبرانی: ۳۸۳۲)

(۴) صدقہ وخیرات:

سخت حاجت وضرورت کے وقت صدقہ خیرات کی اہمیت وفضیلت بڑھ جاتی ہے۔ موسم سرما میں غریبوں کو گرم لباس اور لحاف وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، نیز ٹھنڈے علاقوں میں موسم سرما کے دوران آمدنی کے ذرائع میں کمی کی وجہ سے لوگ کھانے پینے کی اشیا کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سب سے افضل عمل یہ ہے کہ کسی مومن کے دل کو خوش کردو، اس طرح کہ اسے لباس فراہم کردو یا اس کی بھوک مٹادو یا اس کی ضرورت پوری کردو"۔ (المعجم الاوسط: ۵۰۸۱)

شدید سردی کی دُعا:

سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص شدید سردی کے دن یہ پڑھے:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مَا اَشَدَّ بَرْدَ ھٰذَا الْیَوْمِ، اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنْ زَمْھَرِیْرِ جَھَنَّمَ

تو اللہ تعالیٰ جہنم سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے تیرے طبقہ زمہریر سے پناہ مانگی ہے، میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے پناہ عطا کردی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول! طبقہ زمہریر کیا ہے؟آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسا مقام ہے جس میں کافر کو ڈالا جائے گا اور اس کی سردی کی شدت کی وجہ سے اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ۳۰۶)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک عملی اور جامع سیرت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پوری نسل انسانی کے لیے قیامت تک آئیڈیل ہے۔ انسانی سوسائٹی میں فرد، خاندان، قوم اور عالمیت کے ہر دائرے کی جزئیات اور نفسیات تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ ہیں، اس لیے جوں جوں یہ تہیں کھلتی جائیں گی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کے نت نئے پہلو وقت کی ضروریات کے ساتھ اُجاگر ہوتے رہیں گے اور یہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔

اجتماعیت قومیت اور خاندان کے دائرے میں اصولی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی زندگی کی جزئیات تک میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ نسل انسانی کی ایسی جامع اور کامل رہنمائی کرتی ہے کہ کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، قرن اول کے ایک مسلم دانشور صحابیِ رسول سلمان فارسیؓ سے کسی غیر مسلم دانشور (یہودی) نے بطور تعریض یہ بات کہی تھی کہ آپ کے پیغمبر تو پیشاب پاخانے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔اس مسلمان دانش ور نے جواب میں فرمایا کہ جس بات کو تم اعتراض کے طور پر پیش کر رہے ہو، وہی تو سیرت طیبہ کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی اپنے پیروکاروں کو ہدایات دیتے ہیں تاکہ کسی اور طرف دیکھنے کا محتاج نہیں رہے۔

اسی حوالے سے بظاہر ایک چھوٹی سی بات پر نظر ڈالیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

"دو، لعنت کا مستحق بنانے والے کاموں سے بچو، ایک یہ کہ لوگوں کی عام گزرگاہ اور دوسرا سائے والی کسی جگہ میں پیشاب پاخانہ نہ کرو"۔

بظاہر یہ چھوٹی سی اور جزوی سی بات ہے لیکن اس کے پیچھے اسلام کا یہ عظیم اصول اور فلسفہ کارفرما ہے کہ کسی بھی ایسے کام سے گریز کرنا چاہیے جو دوسرے لوگوں کے لیے کسی درجے میں اذیت یا تکلیف کا باعث بن سکتا ہو بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے

لوگوں کو چھوٹی چھوٹی اذیتوں سے بچانے کے عمل کو ایمان کے شعبوں میں شمار کیا ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں ، جن میں سب سے اعلیٰ درجہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت ہے اور سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ آدمی راستے میں پڑی ہوئی کوئی ایسی چیز وہاں سے ہٹادے جو گزرنے والوں کے لیے اذیت کا باعث بن سکتی ہو اور حیا بھی ایمان کا شعبہ ہے"۔[مسلم]

انسانوں کے باہمی تعلقات ، میل جول، معاملات اور ربط و مفاہمت میں ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھنا ، باہمی ادب واحترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا، ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھنا اور دوسروں کو ترجیح دینا، اخلاقیات کے اہم ترین پہلو ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر خود کو اخلاقیات کے پیغمبر کے طور پر پیش کیا ہے:

میں اخلاقیات کی خوبیوں کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔[موطا: باب حسن الخلق]

قرآن کریم جو ابدی کتابِ ہدایت ہے، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات، فرامین اور اسوہ حسنہ سے متعلقہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور جو کچھ تمھیں رسول اللہ ﷺ دیں، تم اسے لے لو اور جن چیزوں سے وہ منع کریں، ان سے تم رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو ، بلاشبہ اللہ سخت پکڑ والا ہے"۔ [الحشر:۷]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق یہ واضح قرآنی حکم ہم سب کے لیے راہ ہدایت ہے، آپ کا ہر حکم ہماری ہدایت کا سبب اور دنیاوی واخروی فلاح و فوز کی بنیادی ہے۔ یہی قرآنی حکم ہمیں حدیث میں بھی ملتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تمھیں میں کوئی حکم کروں تو تم جہاں تک ہو سکے اس کی تعمیل کرو، اور جب میں تمھیں کسی بات سے منع کروں تو اس سے باز آجاؤ"۔[ابن کثیر]

قرآن حکیم ہی میں دوسرے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو بھی ہمارے لیے نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

"(اے مومنو!) بے شک تمھارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، اُس شخص کے لیے جو اللہ سے ملنے اور یومِ آخرت کے آنے کی امید رکھتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے"۔ [احزاب:۲۱]

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هٰذِهِ الْاٰيَةُ الْكَرِيْمَةُ اَصْلٌ كَبِيْرٌ فِى التَّاسِىِّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِىْ اَقْوَالِهٖ وَاَفْعَالِهٖ وَاَحْوَالِهٖ [ابن کثیر]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اس صورت میں ہماری راہنمائی کرسکتا ہے جب ہم اسے بند کتابوں سے نکال کر اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں اور پھر دوسرے مرحلے میں اسے اپنی زندگیوں کا جز قرار دے دیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور حیات طیبہ کا ایک ایک جزا اپنے اپنے مقام پر اس قدر وسعت، معنوی بلندی، گہرائی و گیرائی اور اس قدر کمال رکھتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک کل کی مانند نظر آتا ہے، اور اپنی خوبیوں اور برکتوں کے اعتبار سے وہ دیگر بہت سی خوبیوں پر اتنی فوقیت رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے ایک ایک جز کے چراغ میں نہ جانے کتنے ہی آفتاب و ماہتاب گم ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ مکمل طور پر عمل کی معنویت سے آراستہ ہے، اور اس کا صحیح معنی میں امتیاز یہی ہے کہ اس میں کسی قسم کا ابہام و اشکال وارد نہیں ہو سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کاغذی پھولوں کی طرح نہیں، جن کی خوشبو تخیل و تصور کی محتاج ہو، نہ وہ کتابی فلسفے کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے ثبوت کے لیے دلائل کی تلاش ضروری ہو، بلکہ وہ معروضی حقائق سے براہ راست متعلق ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کسی بھی پہلو سے کوئی بھی بات شرح و تشریح کی محتاج نہیں، وہ اپنی شرح خود آپ ہے۔

معروضی اور عملی سیرت:

انسانی مزاج کا یہ خاصہ ہے کہ جب کسی شعبہ زندگی میں قدم رکھتا ہے تو فطری طور پر وہ اس امر کا خواہاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اس شعبے کا ایسا کامل اور مثالی نمونہ موجود ہو جسے دیکھ کر وہ اپنے لیے راہ عمل متعین کر سکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا کمال یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کرکے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، اور دین و دنیا کی بھلائیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں اپنے دامن میں سمیٹ سکتا ہے، اس لیے کہ زندگی کے ہر شعبے ، حیات انسانی کے ہر موضوع ،اخلاق وآداب کے ہر پہلو اور اصول و قوانین کے تمام بنیادی اسباق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نظر آتے ہیں۔

دراصل انسانی فطرت یہ ہے کہ اس کو نصیحت کے الفاظ سے زیادہ ناصح کا اپنا عمل متاثر کرتا ہے۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا بنیادی سبب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے وسائل کو درس بعد میں ملتا تھا،اس درس کی عملی کیفیت اس کے سامنے پہلے آجاتی تھی ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ہمیں جو عظیم الشان مگر حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے اس میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی عملیت کارفرما ہے ،ایک صحابی رسول کے سوال پر جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تو قرآن ہے۔ تو مفہوم یہی تھا کہ اگر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ اور انداز حکیمانہ کو جاننے کے خواہشمند ہو تو قرآن کریم پر نظر ڈالو اور اس کا مطالعہ کرو، کیونکہ قرآن اور صاحب قرآن ایک ہی سرمدی صداقت کے دو رخ ہیں جسے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ایک علم ہے تو دوسرا عمل ، یا ایک آفتاب ہدایت ہے تو دوسری آفتاب ضیا پاشی کرتی ہوئی تجلی۔

غصہ:

مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ غصہ نہ کرو، چنانچہ فرمایا:

"طاقتور وہ نہیں جو مد مقابل کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے"۔[بخاری کتاب الادب]

اب ایک عام شخص کے لیے یہ قول اس وقت تک دلیل نہیں بن سکتا، جب تک اس کے سامنے صاحب قول کا اپنا اسوہ نہ ہو، ورنہ اچھی باتوں کی تلقین تو کوئی بھی کر سکتا ہے اور ہمارے معاشرے میں تو دوسروں کو نصیحت کرنا سب سے آسان اور سستا کام ہے، مگر جب اس ہدایت کے سننے کے بعد ہمارے سامنے یہ امر آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل خود اس کے بالکل مطابق تھا تو عمل کی راہ ہمارے لیے خود بخود سہل اور آسان ہو جاتی ہے۔

غزوہ احد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے، آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کفار کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا فرمائیے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہی فرمایا کہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، بلکہ مجھے تو ہادی ورحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے، اور پھر بددعا کی بجائے ان کے لیے دعا فرمائی:

"اے اللہ میری قوم کو ہدایت نصیب فرما، کیوں کہ وہ مجھے حقیقت میں جانتے نہیں۔"

[الشفاء لقاضی عیاض]

عفو ودرگزر:

اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو اور معاف کرنے کی تلقین کی، تو ساتھ ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش فرما دیا۔ ورنہ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ امن کے نام پر پوری کائنات کو تہس نہس کیا جا سکتا ہو، ایسا کون شخص ہوتا، جو انتقام اور انتقامی کاروائیوں کی مخالفت کرتا؟ مگر ہادی برحق رحمت عالم نے پہلے تو ایک جانب عفو ودرگزر کی تلقین کی، اور پھر اپنا عمل بھی نمونہ عمل بنا کر اقوام عالم کے سامنے پیش فرما دیا۔

چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جانب تو اپنی جان کے دشمنوں اوراپنے عزیزترین ساتھیوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے قاتلوں تک کو یہ کہہ کر پروانہ معافی بخش دیا:

لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ [احمد]

اور پھر فوراً ہی مجمع عام میں یہ اعلان بھی فرمادیا:

اَلَاوَاِنَّ کُلَّ دَمٍ وَمَالٍ وَمَاثَرَةٍ کَانَتْ فِی الْجَاھِلِیَّةِ تَحْتَ قَدَمَیَّ ھٰذِہٖ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ، وَاِنَّ اَوَّلَ دَمٍ یُوْضَعُ دَمُ رَبِیْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبْ [مسلم]

"آگاہ ہو جاؤ کہ بلا شبہ دور جاہلیت کا ہر خون اور مال و منصب سب قیامت تک کے لیے میرے پاؤں تلے پامال ہے اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں میں سے معاف کرتا ہوں، وہ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے"۔

اس طرح اب کوئی اس ہدایت کی معروضیت کے بارے میں انگشت نمائی نہیں کرسکتا۔

کنجوسی اور بخل سے بچنا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں کو یہ ہدایت فرمائی، فرمایا:

اَنْفِقِیْ وَلَاتُحْصِیْ، فَیُحْصِیَ اللّٰہُ عَلَیْکِ -[بخاری کتاب الزکوٰۃ]

"مال خرچ کرو اور گن گن کر نہ رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالی بھی تمھیں گن گن کر دینے لگے"۔

تو اپنے حکم میں معروضیت پیدا کرتے ہوئے اسے اپنے عمل سے آراستہ بھی کردکھایا، خود کبھی مال سنبھال کر نہیں رکھا۔ بلکہ مال کو اللہ کی راہ میں لٹانے کا جذبہ اس قدر وقیع ہوتا تھا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند درہم بھی رات بھر اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کیا۔

ایک بار صرف دو اشرفیاں پاس بچیں، تو اس کے خیال سے رات بھر نیند نہیں آئی، سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا یہ تو معمولی بات ہے صبح خیرات کردیجیے گا، تو فرمایا کیا خبر صبح تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔

ایک بار خلاف معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز کے بعد فوراً اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور پھر فوراً ہی واپس تشریف لے آئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَكَرِهْتُ اَنْ يَّحْبِسَنِيْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِهٖ

"مجھے (دوران نماز) خیال آیا کہ گھر میں سونے کا ایک ٹکڑا پڑا ہے ایسا نہ ہو کہ گھر ہی میں پڑا رہ جائے، اس لیے گھر جا کر اسے خیرات کرنے کے لیے کہہ آیا ہوں"۔

اعتدال:

ایک جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا یہ عالم تھا، اور دوسری جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور بات بیان فرمائی، آپ نے فرمایا:

"ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جس میں درہم و دینار کے سوا کوئی چیز فائدہ مند نہ ہوگی"۔

اس سے صحابہ کرامؓ نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ ضرورت کے بقدر مال جمع کر لینا چاہیے، تاکہ ضرورت میں کام آسکے، چنانچہ حضرت مقدام بن معدیکربؓ نے اس سے یہی مفہوم سمجھا۔اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خوبی و جامعیت سے معاشرت و معیشت کے یہ مختلف الجہات پہلو جمع فرمادیے۔ سخاوت، اعتدال، مصلحت پسندی و منصوبہ بندی سب ہی کا خلاصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمادیا۔

جامع اور کامل سیرت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی ہماری عملی زندگی میں اہمیت یہی ہے کہ یہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے۔اسی بنا پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ: ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ فرما کر جب خالق ارض و سما نے کتاب ہدایت قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت دی تھی، تو اس میں اسوۂ حسنہ اور سنت نبوی کے قیام وبقا کا پہلو بھی شامل تھا، کیونکہ یہ قرآن سے الگ ہونے کے باوجود بعینہٖ اسی طرح اس سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ شرح کا متن سے ایک خصوصی ربط واتصال ہوتا ہے، ایسا ربط واتصال کہ متن کے بغیر شرح کا اپنا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا عملی درس یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کے تمام فریق اپنی اپنی حدود کی بھرپور رعایت کریں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ کی صرف ایک جانب اور رخ بیان نہیں فرمایا بلکہ ہر رخ اور ہر جانب کی وضاحت کرکے حدود متعین کر دیے ہیں۔

والدین اور اولاد:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ایک طرف والدین کے بارے میں فرمایا:

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ ۔[ترمذی]

"کوئی والد اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی طرح تعلیم دے"۔

اور اولاد کو برابر کی توجہ دینے کا حکم فرمایا تو دوسری جانب اولاد کو بھی والدین کا مقام پہچاننے، ان کی اطاعت کرنے، اور ان کی نافرمانی سے بچنے کی ترغیب دی فرمایا:

اِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ ۔[بخاری کتاب الادب]

"اللہ تعالی نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے"۔

اور دوسری روایت میں والدین کی خدمت کو جہاد کا درجہ عطا فرمایا۔

رشتوں اور حقوق کا خیال:

اس طرح اہل قرابت سے تعلقات کے بارے میں ایک طرف تو یہ فرمایا گیا کہ صلہ رحمی نہ کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔اور دوسری طرف خونی تعلقات ختم کرنے والوں کے عزیز واقارب کو یہ کہہ کر رد عمل میں تعلقات ختم کرنے سے باز رکھا کہ:

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ وَاَعْرِضْ عَمَّنْ ظَلَمَكَ ۔[مسند احمد]

"جو تم سے توڑے تم اس سے جوڑو، اور جو تمھیں محروم کرے اسے دے دو اور جو تم پر ظلم کرے تم اس سے اعراض کرو"۔

تعلیم و تعلم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی یہ ہمہ جہتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا یہ تنوع ہر پہلو سے نمایاں ہے۔جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیمی معاملات میں ہدایات جاری فرماتے ہیں تو سب سے پہلے اساتذہ کے طبقے کو فرمایا جاتا ہے کہ

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ

علم سیکھو اور اسے لوگوں کو سکھاؤ۔

اور علما کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى اَدْنَاكُمْ

"عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر"۔

اور علم چھپانے پر وعید سنائی کہ:

"ایسے شخص کو روز محشر آگ کی لگام ڈالی جائے گی"۔

اور اس کے ساتھ ساتھ طالب علم کو بھی اس کا مقام بتایا، اس کے لیے سب سے پہلی ہدایت یہ فرمائی کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔مزید فرمایا کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔اور پھر طلبہ اور تمام چھوٹوں کو اپنے بڑوں کی عزت و تکریم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا اور نیکوں کا حکم نہیں کرتا، اور برائیوں سے منع نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں"۔

اسی طرح انھیں یہ تاکید بھی کی کہ ان کا حصول علم محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر علم کے ساتھ عمل نہیں ہوگا، تو یہ اپنے علم کے ساتھ ناانصافی ہے، اور فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بُرا شخص وہ عالم ہوگا جس نے اپنے علم سے نفع نہیں اٹھایا۔ [مشکوٰۃ کتاب العلم]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا کمال، جامعیت اور ہمہ جہتی صرف چند امور میں نہیں، ہر شعبہ زندگی کے بارے میں دی گئی ہدایات میں یہ جامعیت نمایاں ہے۔

مالک اور مزدور:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جانب آجر کو یہ فرماتے ہیں:

اَعْطِ الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عِرْقُہ ۔[بیہقی]

"مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کرو"۔

وہیں مزدور کے بارے میں فرمایا کہ: "بہترین کمائی ہاتھ کی کمائی ہے جبکہ وہ خیر خواہی کرے گا"۔[مسند احمد] اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کی کمائی کو خیر خواہی کے ساتھ مشروط کر دیا، تاکہ آجر اور مالک کے حقوق کی بھی نگہبانی ہو سکے۔

مہمان اور میزبان کے حقوق:

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جانب میزبان کو فرمایا:

مَنْ کَانَ یُوْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ جَائِزَتَہ۔ [ترمذی]

"جو شخص اللہ تعالی اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے"۔

دوسری جانب مہمان کو بھی تنبیہ فرمادی:

اَلضِّیَافَۃُ ثَلَاثَۃُ اَیَّامٍ مَاکَانَ بَعْدَ ذَالِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ [ترمذی]

"مہمانی تین دن کی ہے، اس کے بعد مہمان پر صدقہ ہوگا"۔

اللہ کا حق اور بندے کا حق:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ اور امت کے سامنے پیش کردہ اسوہ حسنہ میں انسان کو اس کے نفس کے حقوق کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے اور اس کے حقوق کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں مسلسل شب بیداری اور نفلی روزوں میں اس قدر زیادتی سے بھی منع فرمایا، جس سے اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی متاثر ہو اور دیگر معاملات میں بھی خلل واقع ہو، فرمایا:

"تمھارے بدن کا بھی تم پر حق ہے اور تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، اور تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے"۔[بخاری کتاب الصیام]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے بھی ایک دوسرے پر حقوق واضح کیے ہیں ایک روایت میں فرمایا:

”مؤمن مؤمن کاآئینہ ہےاور مؤمن مؤمن کابھائی ہے،وہ نقصان دہ چیز سے بچتاہےاوراس کی غیر حاضری میں اس کی حفاظت کرتاہے“۔[ابوداؤد]

اورایک روایت میں فرمایاکہ:

”اپنے بھائیوں سے (خواہ مخواہ) بحث نہیں کیاکرواورنہ اس سے ایسی دل لگی کروکہ جواسے ناگواراہو،نہ اس سے کوئی وعدہ کروجوتم پورانہ کرسکو“۔

اسی طرح ہمارے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کاجواسوۂ حسنہ آتاہےوہ نہ صرف یہ کہ ہراعتبار سے جامعیت کاشاہکارہے ،بلکہ وہ عملی طورپرہمیں دعوتِ عمل بھی دیتاہے اوردرحقیقت آج کے دورمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری عقیدت اور تعلق وخاطرکادرست اورحقیقی مظہر بھی یہی امر ہے کہ ہم عملی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدرمناسبت رکھتے ہیں ،اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اورافعال ہماری زندگیوں میں کس قدر موجودہیں؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسوۂ حسنہ کی جامعیت کوسامنے رکھتے ہوئے ہر شخص اپنے لیے اسے اپنی عملی زندگی میں سمولینے کانظام وضع کرےاوراس پردل وجان سے عمل پیراہو کر ہر شخص سنتِ نبوی کی عملی تصویر بن جائے۔ یہی درسِ سنت ہے، یہی پیغامِ سیرت ہے، یہی ملت کی ضرورت ہے،اسی میں خیر وفلاح مضمرہے،اوراسی میں کامیابی وراحت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی یہی وہ خوبی ہے، جواسے ہمہ گیریت عطاکرتی ہےاور جوعلم وعمل میں ہم آہنگی پیداکرتی ہوئی ذہنوں کوبراہِ راست متاثر کرتی ہےاور قلوب واذہان میں جاگزیں ہو کر پیغام سیرت پر عمل پیراہونے کی تحریک پیداکرتی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی برکتوں سے مالامال کرےاور ہم سب کوسیرت طیبہ کی ضیاپاش کرنوں سے استفادہ کرنے کی توفیق عطافرمائیں۔آمین

"سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ہی جامع و مستند سیرت

ویسے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر مختلف اوقات وایام میں سال بھر کانفرنسیں، سیمینارز اور جلسے منعقد ہوتے ہیں لیکن ماہ ربیع الاول کی آمد سے ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک مسلمان کے لیے سال کے ۱۲ مہینے، مہینے کے ۳۰ دن، دن کے ۲۴ گھنٹے اور گھنٹے کے ۶۰ منٹ اور ہر لحظہ ربیع الاول ہی ربیع الاول ہے۔ اس میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور دنیا میں تشریف آوری پر خوشی کی اظہار اور اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس اظہار تشکر کے ساتھ ساتھ اہم بات پیامِ میلاد کو ہر وقت اور ہر لحظہ یاد رکھنا فرض ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی پیامِ میلاد کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ یہی کامیابی کا راز ہے۔

الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ایک مسلمان کی عقیدت ومحبت اس کے ایمان کا حصہ اور اس کی فطرت کا لازمی جز ہے۔ ایک مسلمان اور مومن کے لیے اپنے آپ کو جاننا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جاننا ضروری ہے۔ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتا وہ اپنے ایمان اور اسلام کو کیسے جان سکتا ہے۔ مومن اپنے وجود ایمانی میں سراسر وجود پیغمبر کا محتاج ہے عیاذ باللہ اگر وجود پیغمبر سے قطع نظر کر لی جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی مومن کا وجود ایمانی باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے:

النبی اولی بالمومنین من انفسھم [احزاب]

"نبی، مومنین کے حق میں ان کی جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

بقول محدث اعظم مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ:

کیونکہ مومن کا وجود ایمانی آفتاب نبوت کا ایک معمولی سا عکس اور پرتو ہے اور ظاہر ہے کہ پرتو کو جو قرب اور تعلق اپنے اصل منبع یعنی آفتاب سے ہو سکتا ہے وہ آئینہ سے نہیں

ہو سکتا۔ مومن کو جو ایمان پہنچتا ہے وہ نبی کے واسطے سے پہنچتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان نبی سے قریب ہے اور مومن سے بعید ہے اس لیے کہ نبی، ایمان کے ساتھ متصف بالذات ہے اور مومن ایمان کے ساتھ متصف بالعرض ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مومن اپنے ایمان کے جاننے سے پہلے اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانے تاکہ اسی راستے پر چلے اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دے۔" [سیرت المصطفیٰ]

قرآن کریم کی بہت سے سورتیں انھیں انبیا کے نام سے موسوم ہوئیں جن کی سیرت اس سورت میں بیان کی گئ ہے جیسے سورۂ یونس اور سورہ ہود اور سورہ یوسف اور سورہ ابراہیم وغیرہ اور سورہ لقمان اور سورہ کہف حضرت لقمان اور اصحاب کہف کے نام سے موسوم ہوئیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیا اور عُلما و صلحا کی سیرت اور تاریخ کس درجہ اہم اور ضروری ہے۔ سیرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات کا علم ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے فضائل وکمالات معلوم ہوں گے جس سے ایمان میں زیادتی اور قوت پیدا ہوگی اور بہت سے آیات اور احادیث کے معانی معلوم ہوں گے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ اگر سیرت کو پڑھیں گے اور اس کا مطالعہ کریں گے تو ان کے حق میں سیرت کا علم دعوتِ ایمان اور دعوت الی الحق کا ذریعہ ہوگا ان شاء اللہ۔ امتوں نے اپنے انبیا کی اور قوموں نے اپنے سادات اور کبرا کی سیرتیں اور تاریخیں لکھیں مگر وہ سب ناتمام ہیں۔ جن قوموں کا یہ حال ہو کہ جس کو وہ صحیفہ آسمانی اور کتاب ربانی سمجھتے ہوں وہی ان کے پاس محفوظ نہ ہو اور یہ تک معلوم نہ ہو کہ کس پر اترا اور کب اترا اور کہاں اترا اور کس طرح اترا۔ اور جس کو اپنے اپنے مقتدا اور پیشوا سمجھتے ہوں اس کی قبر تک کا نشان بھی ان کو معلوم نہ ہو وہ اپنے اس مقتدا کی مکمل سیرت اور سوانح حیات کہاں پیش کر سکتے ہیں۔ پوری زندگی کے حالات اور واقعات تو بڑی چیز ہیں وہ اپنے پیشوا کا ایک کلمہ بھی ایسا نہیں پیش کر سکتے جس کی سند ان کے پیشوا تک متصل اور مسلسل ہو۔

بحمد اللہ یہ شرف صرف امت محمدیہ (علی صاحبہ الف صلوٰۃ والف الف تحیۃ) کو حاصل ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے ہر قول اور ہر فعل کو متصل اور مسلسل سند کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہی

اور صرف یہی ایک امت ہے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہے۔ عہد نبوت سے لے کر اس وقت تک کوئی لمحہ اور کوئی لحظہ ایسا نہیں گزرا کہ جس میں یہ امت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع ہوئی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا اور تمام مذہبی رہنماؤں میں اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ کے حالات زندگی دیکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز کا حکم دیتے سنا یا کسی چیز سے منع کرتے سنا، ان کی ایک عظیم تعداد تقریباً ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جنھوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہوئے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہؓ میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا دی تھیں تاکہ ان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد کے آنے والوں کو ملیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کیے اور یہ ذخیرۂ علم بھی ان لوگوں تک پہنچا جنھوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔

پھر جن صحابہؓ نے سیرت کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد، بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ جب آخری حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا، جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔ اتنے آدمیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریر سنیں جو اس حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے اہم موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہنچے ہوں گے تو وہاں ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں نے ان سے اس سفر کے حالات اور حج کے احکام دریافت نہ کیے ہوں۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کے اس دنیا میں گزر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال اور احکام وہدایات ان لوگوں سے پوچھتے ہوں گے جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنے تھے۔

صحابہؓ سے جو روایات بعد کی نسلوں کو پہنچی تھیں، ان کے بارے میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کوئی بات کہتا، اس کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ بات کس سے سنی ہے اور اوپر سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے وہ بات سنتا اور آگے بیان کرتا رہا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کی پوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں تاکہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ اگر روایت کی پوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتیں لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابل اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔

آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی اور سند بھی صرف یہی نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں۔

کیا انسانی تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالات زندگی اس قدر مستند طریقے سے منقول ہوئے ہیں؟ اور کیا اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لیے ان ہزارہا آدمیوں کے حالات پر کتابیں لکھ دی گئی ہوں جنھوں نے اس ایک

شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟ موجودہ دور کے عیسائی اور یہودی علماء احادیث کی صحت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کر رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور ان کے پیشوایان دین کے حالات کے سرے سے کوئی سند ہی نہیں ہے۔ اسی جلن کے باعث انھوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کے معاملہ میں علمی دیانت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے، بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان کیسا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی، مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا، اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی، اپنے گھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح رہتے تھے، اپنی بیویوں اور بچوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ کیسا تھا، اپنے دوستوں اور دشمنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ کیسا تھا، کس اخلاق کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اخلاق کیا تھا، کس چیز کا حکم دیا، کس کام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا، کس کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے تمام حالات ہمیں ملتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جج بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پوری پوری روداد یں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہوئے دیکھتے، اس سے منع فرماتے تھے اور جو کام

صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصب کے بغیر، پورے علم ویقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیا علیہ السلام اور پیشوایان مذاہب میں سے صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہستی ہیں جن کی طرف نوع انسانی، ہدایت ورہنمائی کے لیے رجوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ جو ہدایت کے لیے درکار ہیں، نہایت مستند و معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جامع اور کامل بھی ہے جس طرح کلام اللہ بحر بے کناں ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بھی اختتام نظر نہیں آتا۔

مشہور مستشرق الیس سپر نگر (Alias Springer) جنھوں نے "مغازی" کی تدوین کرکے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا اعجاز یہ ہے کہ اس پر چودہ سو سال سے لوگ لکھ رہے لیکن پھر بھی اس کا اختتام نظر نہیں آرہا اور اس کے علاوہ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ اُس کی کوئی نسبت پیدا ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان صاحب علم و قلم کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری کی طویل فہرست میں اپنا نام شامل کرے اگرچہ آخر میں کیوں نہ ہو۔"

جب تک یہ دنیا قائم ہے، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صاحبان علم ودانش اپنے اقلام معطر کرتے رہیں گے لیکن سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اکمل طور پر احاطہ کرنا کسی صورت ممکن نہیں۔

سیرت، جامعیت اور اقسام

سیرت النبی کی جامعیت:

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اور طریقہ کار گویا قرآن پاک پر عمل کرنے کا طریقہ کار ہے۔اگر قرآن صامت، اللہ کی کتاب ہے،اور انسانوں کے عمل کرنے کے لیے ہے تو اس پر عمل کرنے کا طریقہ کار بھی انسانوں کے سامنے آنا چاہیے، اور قرآن کا عملی نمونہ بھی انسانوں کے لیے ہونا چاہیے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف نظری ہدایت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنی رحمت کاملہ اور فضل خاصہ سے ایک عملی نمونہ بھی دنیا میں بھیجا جس کو آج ہم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ اور قرآن مجسم کا رویہ، جو قرآن نے کہا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ قرآن نے کہا، لہٰذا ان دونوں میں گہری نسبت پائی جاتی ہے۔پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی اس طرح کامل سیرت ہے جیسے قرآن پاک کامل کتاب ہے۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے بارے میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں ایک اہم وصف ارشاد فرمایا تھا کہ لَا تَنقَضِیِ عَجَائِبُہُ یعنی قرآن کے عجائب و غرائب بھی کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

قرآن سے ہمیشہ نئے نئے مطالب اور نئے نئے معانی نکلتے چلے جائیں گے اور ہر آنے والا دن قرآن پاک کے حقائق اور معارف کی ایک نئی دنیا لے کر آئے گا،اسی طرح صاحب قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ارشادات میں پنہاں حقائق اور معارف بھی کم از کم ہم محدود انسانوں کی بساط کے لحاظ سے لامتناہی ہیں، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو ترا وجود ہے الکتاب

اقبال کا یہ شاعرانہ انداز کوئی مبالغہ نہیں ہے، یہ وہی بات ہے جو ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فرمائی تھی کہ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآنَ۔ آپ کے اخلاق عین قرآن تھے یعنی آپؐ کے اخلاق وہی کچھ تھے جو قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک اگر قرآن صامت یعنی خاموش قرآن ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود گرامی قرآن ناطق بولتا، اور گھومتا پھرتا قرآن ہے۔ جس طرح قرآن صامت کے عجائب و غرائب لامتناہی ہیں تو اسی طرح قرآن ناطق کے عجائب و غرائب کیسے متناہی ہو سکتے ہیں۔

تمام بانیانِ مذاہب اور مؤسسین ادیان جو اس وقت دنیا میں رائج ہے، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ اور شخصیت ہی واحد تاریخی شخصیت ہے جو پوری طرح اور ہر پہلو سے تاریخ کی سرچ لائٹ میں دنیائے انسانیت کے سامنے ہیں، جس کا ہر ہر گوشہ نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخیت اور حقیقی شخصیت کے بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آنے والے بہت سے بانیان مذاہب کے وجود کے بارے میں خود ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں کے حلقوں میں بہت سے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کے نام سے آج جو مجموعے ہمارے سامنے ہیں وہ ان مقدس شخصیات کی حیات طیبہ، سوانح اور خدمات کے بارے میں یا تو تقریباً خاموش ہے یا بہت ہی سرسری اور متضاد معلومات پر مشتمل ہیں، وہ معلومات جو ان کتابوں سے ان عظیم الشان انبیا اور معلّمین انسانیت کے بارے میں ملتی ہے وہ انتہائی اجمالی اور سطحی ہے۔

اس کے مقابلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیات طیبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی حیات مبارکہ کے دور سے لے کر آج تک مسلسل نہ صرف غور و خوض کیا جارہا ہے اور لکھا جارہا ہے، نہ صرف اپنے، بلکہ اپنے اور پرائے دونوں داد تحقیق دے رہے ہیں۔ معلومات اور مصادر کی فراوانی اور توسیع کی کیفیت یہ ہے کہ سیرت کے نام پر آج پورے کتب

خانے قائم ہیں، سیرت کے نام پر ادارے اور مسندیں قائم ہیں، سیرت کے مختلف موضوعات پر تحقیق اور مطالعہ کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ سیرت ایک مستقل فن اور علم بن چکا ہے۔ یقیناً سیرت ایک لامتناہی اور متلاطم سمندر ہے۔ پھر علم سیرت محض ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قوم، ایک ملت، اور ایک الٰہی پیغام کے آغاز اور ارتقاء کی ایک انتہائی اہم، انتہائی دلچسپ اور انتہائی مفید داستان ہے۔

ایک مغربی مستشرق نے جو دوست نہیں، جو اپنا نہیں بلکہ ایک دشمن ہے نے یہ اعتراف کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کا سلسلہ لامتناہی ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت اور باعث شرف ہے، اللہ تعالیٰ یہ عزت اور شرف ہمیں بھی بخش دیں۔

آج سیرت ایک ایسا وسیع اور جامع علم ہے جس کے بہت سے حصے اور شاخیں ہیں۔ بہر حال سیرت ایک لامتناہی، کامل، جامع اور مختلف النوع موضوعات پر مشتمل علم ہے جس کی مزید شاخیں اور سیرت کے اندر مزید اقسامِ سیرت موجود ہیں جس پر علمائے اسلام اور سکالروں نے الگ الگ شاخ اور سیرت کے الگ الگ قسم پر مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ علم سیرت کی یہ وسعت خود اپنی جگہ آپؐ کا ایک معجزہ ہے۔اس کے ان اقسام اور شاخوں میں سے چند اہم یہ ہیں۔

کتب سیرت کے مختلف مناہج اور اقسام

تاریخی، واقعاتی، یا لوک سیرت:

اس سے مراد سیرت کی وہ قسم اور شاخ ہے جس میں عوامی انداز میں واقعاتی طور پر ابتدا سے آخر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بیان کرنا ہے۔ جس پر اہل علم قدیم زمانے سے چھوٹی بڑی کتابیں لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو سیرت کے بنیادی حقائق سے واقف کرانا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، فضیلت اور بزرگی لوگوں کے سامنے آجانا اور اس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ایمانی اور محبت کا رشتہ استوار کرنا ہے۔

تعلیماتی سیرت:

سیرت کے اس قسم کا تعلق وہ معلومات یا وہ شعبے ہیں جو علم کی نشر و اشاعت تعلیم و تعلم سے متعلق ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم کائنات اور معلم انسانیت کی حیثیت سے اس فریضے کو کس طرح انجام دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت تعلیم، اسلوب تعلیم اور طرز تعلیم کیا تھی وغیرہ۔

روحانیاتی سیرت:

اس سے مراد بنیادی طور پر تزکیہ اور اصلاح نفوس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایات کیا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیہ نفس، روحانی پاکیزگی اور تربیت کے لیے کیا کچھ کیا اور کیا اقدامات اختیار کیے۔

ادبیاتی سیرت:

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور مکاتیب کا ادبی اعتبار سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا عربی زبان کے اسالیب، ساخت، طریق ادا اور طرز بیان پر کیا اثر پڑتا ہے اور عربی زبان کو آپؐ نے کون کون سے نئے اسالیب عطا فرمائے، عربی کو کیا رونق بخشی۔

نفسیاتی سیرت:

اس قسم کی سیرت میں ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی اس کے پیچھے کیا کیا حکمتیں تھی، مخاطبین کے ذہن، نفسیات خیالات اور تصورات کا کیسے خیال رکھ کر بات ارشاد فرمائی۔ دعوت و تبلیغ میں مخاطب کے ذہن اور مزاج کو سامنے رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا چیزیں پیش نظر رکھیں اور کن باتوں کا اور تدریج کا خیال رکھا۔

جعرافیائی سیرت:

اس سے مقصود یہ بات ہے کہ جس جغرافیائی ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماتھے ،اور جہاں یہ ساراکام ہو رہا تھا وہ علاقہ کیا تھا، اس کا جعرافیہ کیا تھا، اس میں کون سے شہر تھے، کہاں کہاں کتنے فاصلے پر واقع تھے۔

کلامیاتی سیرت:

سیرت کی اس قسم سے مراد وہ موضوعات ہے جو علم کلام اور عقائد سے متعلق ہیں جو اصلاً سیرت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کے معانی اور مطالب کو سمجھنے کے لیے علم کلام کا مطالعہ ضروری ہے، علم کلام کے مباحث کے بغیر ان سے واقفیت دشوار ہے۔ جیسے نبوت و رسالت کی حقیقت و ضرورت ،وحی کی حقیقت و ضرورت، ختم نبوت، معجزات، معراج وغیرہ عنوانات پر کلامی بحث کرنا۔

فقہیاتی سیرت:

اس سے مراد سیرت کی روشنی میں احکام شریعت کو جاننا ہے۔بظاہر اگرچہ فقہ اور سیرت دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ فقہ کا دائرہ کار قانون اور شریعت کے اصول ہیں اور سیرت کا دائرہ کار عموماً تاریخ اور رسول اللہ کی سوانح عمری ہے۔ لیکن حقیقت میں ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ فقہ سے چونکہ مراد ایک گہری اور عمیق فہم ہے تو قرآن پاک کے احکام میں گہری فہم، سنت مبارکہ کی گہری فہم، سیرت طیبہ کی گہری فہم، جب تک ان تینوں چیزوں کی گہری فہم حاصل نہ ہو، تب تک ان تینوں مصادر ہدایت میں گہری بصیرت حاصل نہیں ہوتی، اُس وقت تک شریعت کے قوانین اور احکام پر عمل کرنا بھی آسان نہیں۔ اس لیے فقہ اور سیرت میں انتہائی اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔

شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر، نزاکت اور حکمت سیرت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس اعتبار سے سیرت ہی کی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔ آج بیسویں صدی کی ابتدا سے فقہ السیرۃ کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز متعارف ہو گیا ہے۔

اس فقہ السیرۃ سے مقصد محض سیرت کے واقعات بیان کرنا، محض سیرت کی تاریخی تفصیلات سے اعتنا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ سیرت کے ان تاریخی واقعات اور تفصیلات میں جو سبق پنہاں ہے ،اس کو نمایاں کیا جائے، جو بصیرتیں اور حکمتیں سیرت پاک کے واقعات میں پوشیدہ ہیں، ان کو سامنے لایا جائے اس طرح کے کاوش کا نام فقہ السیرۃ یا فقہیات سیرت ہے۔

اجتماعیاتی یا سیاسیاتی سیرت:

اس سے مراد ہے کہ سیرت نبوی کا مطالعہ اجتماعیت کے نقطہ نظر سے کیا جائے ، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقدامات اور فیصلوں کا اجتماعی پس منظر کیا تھا، کس ماحول اور کس پس منظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا، مدینہ منورہ میں اجتماعیت کس رنگ کی تھی، خاندان اور قبائل کون کون سے تھے۔اس میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔مدینہ کی زندگی اور معاشرت کیا تھی،مکہ کی شہری ریاست کیا تھی اور پھر مدینہ میں ریاست کیسے اور کن کن اقدامات سے وجود میں آئی۔ پھر اس ریاست میں حکومت کس نوعیت کی تھی، کون کون سے شعبے اور نظم قائم تھے وغیرہ، تو اس اجتماعی اور سیاسی پہلو پر سیرت نبوی کے مطالعہ کو اجتماعیات سیرت یا سیاسیات سیرت کہتے ہیں۔

میثاق مدینہ یا مدنی ریاست کا مرتب دستور

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ تشریف آوری پر تین کاموں میں سے پہلا کام مسلمانوں کے لیے ایک کثیر المقاصد ادارہ اور ایک دینی مرکز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر ہوئی جس سے مسلمانوں کو اپنی عبادت تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ معاملات طے پانے کے لیے ایک اپنا بااختیار جگہ مل گئی۔ اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست کے قیام میں اس دینی مرکز اور ادارے کی ضرورت اور افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

ہجرت کے بعد اگر مکہ والے مسلمانوں کو نہ چھیڑتے تو وہ آرام سے مدینہ میں اپنی زندگی بسر کرتے رہتے، لیکن انھوں نے مسلمانوں کو مدینہ پر حملہ کرنے کی دھمکیاں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مسلمانوں یعنی مھاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کیے تاکہ مھاجرین کو شہر مدینہ کے معیشت میں داخل کیا جائے اور ان کے بسر کا انتظام کیا جائے تاکہ ایک تو وہ سوسائٹی پر بوجھ نہ بنے اور دوسرا مہاجرین بھی معاشی مسائل سے دوچار نہ ہو اور وہ اطمینان قلب حاصل کرکے دعوت دین اور اقامت دین کے لیے یک سو ہو جائیں، یہ کام انصار کے فراخ دلی اور مہمان دوستی کے باعث بہت جلد اور آسانی سے ممکن ہوا۔

تیسرا کام میثاق مدینہ کا قیام ہے۔ اسلام سے پہلے مدینہ میں کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی بلکہ قبائلی نظام تھا اور آپس میں خانہ جنگی میں مبتلا تھے، ہجرت سے قبل ایک جنگ ان کے درمیان شروع ہوئی تھی، یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی جو کئی سال جاری رہی اور اوس وخزرج کے قبائل آپس میں شمشیر آزما ہوئے تھے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا، کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی۔ اسی جنگ سے مایوس ہو کر اور اس سے پریشان ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دے رکھی کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہیے چنانچہ کچھ کی رائے اوس کے ابوعامر راہب پر تھی اور بعض لوگوں کی تجویز کے مطابق عبداللہ بن ابی ابن سلول جو بعد میں رئیس المنافقین

کے نام سے مشہور ہوا سر براہی کے لیے منتخب تھا، لیکن بات ابھی تک زیر غور تھی کیونکہ بعض لوگ متفق تھے اور بعض لوگ متفق نہیں تھے۔ البتہ مدینہ کے سر براہ کے انتخاب پر تاج پوشی کے لیے مدینہ کے یہود سناروں کو تاج بنانے کا آڈر دیا گیا تھا۔

اسی اثنا میں ہجرت کا واقعہ پیش آگیا اور جتنے انصاری صحابہؓ یعنی اوس اور خزرج تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے لے سوچی جا رہی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تیسرے کام یعنی قیام ریاست اور میثاق مدینہ کے کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مدینہ شہر اور ارد گرد کے تمام عناصر اور قبائل کا ایک بہت بڑا جلسہ اور مشترکہ اجلاس بلایا جس میں مسلمان، مہاجر، انصار، مسلم و غیر مسلم، مدینہ کے مشرک جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے یہود، عیسائی سب شریک ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشترکہ حکومت قائم کرنے کی رائے پیش کی۔ تمام شرکا نے اس رائے کو اکثریت کے ساتھ قبول کیا سوائے چند لوگوں کے، جن میں سے ایک عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور دوسرا ابو عامر راہب اور اُس کے خاندان کے لوگ کیونکہ وہ انجیل کا عالم تھا اور اس نے انجیل میں پڑھا تھا کہ آخری نبی آئے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر وہ خفا ہوا کہ نبی تو مجھے ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں عالم ہوں اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو امی ہے وغیرہ۔

الغرض اکثریت کی اتفاق رائے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے کئی نکات پر مشتمل دستور پیش کیا جس کو میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دستور کی چند اہم باتیں یہ تھی۔

پہلی دفعہ حکمران اور رعایت کے حقوق کو تحریری طور پر عمل میں لایا گیا۔ دستور مرتب کر کے پھر تمام لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا یہاں خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جو ایک اُمی شخص کے ہاتھوں وجود میں آئی۔

ا۔ یہ مملکت ساری دنیا کے مقابل میں ایک مستقل خود مختار مملکت ہو گی۔

۲۔ اس مملکت میں مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی ہوں گے۔
۳۔ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہو گی۔
للمسلمین دینھم و للیھود دینھم۔
۴۔ مملکت کا سر براہ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق مقرر کیے گئے۔ چند مہینوں میں آپ کی فیاضی عقلمندی، عدل پسندی لوگوں کو معلوم ہوا۔

اس دستور میں دفاع کے سلسلے میں دو باتیں اہم اور قابل ذکر ہیں۔

۵۔ امن اور جنگ نا قابل تقسیم چیزیں ہیں، اگر امن ہو تو تمام مدینہ والوں اور تمام قبائلوں کے لیے اور اگر جنگ ہو تو بھی تمام کا۔ ایسا نہیں کہ چند قبائل لڑتے رہے اور چند کا صلح ہو۔ امن اور جنگ کی مرکزیت اور نا قابل تقسیم ہونا ایک اہم چیز تھی۔
۶۔ گر جنگ کے لیے باہر جانا پڑے تو اس میں کون شریک ہوں اور کون شریک نہ ہوں، یہ اختیار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گا گویا کہ آپ کا اختیار کمانڈر ان چیف سے بھی زیادہ تھا کہ نہ صرف آپ جنگی انتظام کریں گے بلکہ جنگ کا سیاسی پہلو پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار ہو گا کہ اُن لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خارج کر سکتے ہیں کہ جو مشتبہ ہو اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہے۔
۷۔ یہ بھی صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور ہوں تو ہر محلّہ، قبیلہ مدافعت براہ راست کریں گے اور اس میں تمام محلے اور قبائل ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔
۸۔ فوج کے اخراجات ہر محلّہ اور قبیلہ خود برداشت کرے گا کیونکہ اس وقت حکومت کے پاس فوج کے دینے کے لیے وطیفہ کا انتظام موجود نہیں تھا اور نہ بیت المال کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جنگ میں شریک ہونے والے افراد کے پاس اسلحہ بھی اپنا، خرچہ بھی اپنا، تاکہ حکومت پر خاص بوجھ نہیں پڑے گا لیکن پھر بھی فوج کی مرکزی بھاگ دوڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی۔ یہ سن ایک ہجری کا واقعہ تھا۔
۹۔ عدل اور فیصلوں کا انتظام عدالت ابتدائی قبیلہ وار ہو گی یعنی ہر قبیلہ اپنا مسئلہ اپنے قبیلے کے سردار کے پاس لائے گا۔ اگر مسئلہ دو مختلف فریقوں کی ہو تو اس صورت میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں یا اپنا کوئی اور حکم مقرر کرلیں، لیکن یہ صراحت ہے کہ اگر قبیلہ کے سربراہ کے فیصلہ سے کوئی مطمئن نہ ہوا تو آخری اپیل حضورؐ کی عدالت میں کیا جائے گا یعنی آپ کی ذات اقدس عدالت عظمیٰ منصور ہو گی۔

۱۰۔ دستور میں مسلمانوں کے لیے یہ صراحت ہے کہ قانون ساز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، یعنی قومی انتظام اور عدالت عظمیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں تھا۔ مطلب یہ کہ مسلمان صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت پر فیصلہ کریں گے۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مدینہ تشریف لانے کے بعد تیسرا کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مؤرخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام ابو داوٗدؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور مؤرخین میں کئی افراد نے اس کے لیے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للانصار والمهاجرين يا بين الانصار والمهاجرين۔ کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔

یہ چارٹر یا فیصلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے بات کی اور چارٹر کی تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں سے ابتدائی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت انسؓ کے گھر میں ہوئی تھی۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرماتھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا گھٹنا حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے جب یہ معاہدہ لکھا جارہا تھا۔

اس کے بعد جب یہ معاہدہ مکمل ہو گیا۔ عام طور پر قدیم اور جدید مؤرخین میں سے اکثر کا کہنا یہ ہے کہ یہ معاہدہ جو اس وقت 47 یا 52 دفعات پر مشتمل ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ معاہدہ دو الگ الگ اوقات میں کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک ہی معاہدہ

ہے اور ایک ہی وقت میں کیا گیا ہے۔ جدید مصنفین میں سے مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ اور کئی اور حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ دو الگ الگ دستاویزات تھیں جو دو مختلف اوقات میں مرتب ہوئیں اور بعد میں ان کو املا کر کے ایک کر دیا گیا۔ پہلے پچیس دفعات تو ہجرت کے بالکل ابتدائی دنوں میں مرتب ہوئیں اور یہ مہاجرین اور انصار کے مختلف قبائل کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا۔ دوسرا حصہ غزوہ بدر کے بعد مرتب ہوا۔ اس کے رو سے یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہوئے۔ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں ایک جگہ دو کتابوں کا حوالہ ہے۔ کتابه صلی اللہ علیه وسلم لمهاجرين والانصار اور کتابه صلی اللہ علیه وسلم لليهود۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم مصنفین میں سے ابن منظور افریقی بھی اس کو دو دستاویزات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ امام ابو داؤد نے بھی اپنی کتاب الخراج والفی والامارة، جو سنن ابو داؤد کا ایک حصہ ہے، اس کے باب نمبر 21 میں جس کا نام ہے باب کیف کان اخراج الیھود من المدینه المنورة۔ کہ یہودیوں کا اخراج مدینہ منورہ سے کب اور کیسے ہوا۔ اس میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ حضور علیہ السلوۃ والسلام نے کیسے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک کتاب تحریر فرمائی تھی اور یہ کہ غزوہ بدر کے بعد یہودی بھی اس چارٹر میں شامل ہو گئے تھے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو الگ الگ معاہدے تھے جو بعد میں ایک دستاویز میں جمع کر دیے گئے تھے۔ اس کی دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے 52 قرار دی ہیں۔ وینسنک جو مشہور ڈچ مستشرق تھے، انھوں نے 47 دفعات قرار دی ہیں۔ بعض اور مصنفین نے 56 دفعات قرار دی ہیں۔

یہ تحریر یا دستاویز مدینہ کی ریاست کے لیے ایک آئینی دستاویز تھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ اور ول ہاوزن اور کئی دوسرے جدید مصنفین نے بجا طور پر اس کو انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور کہا ہے۔ یقیناً یہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری اور مدون دستور ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے تحریری دستور مرتب کر کے نافذ کیا گیا ہو۔

دستور اور میثاق کے چند مختصراً امور ذکر کرنے کے بعد اصل دستور کچھ اس طرح ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیه وسلم بین المومنین

و المسلمين من قريش و يثرب و من تبعهم فلحق بهم و جاهد معهم انهم امة واحدة من دون الناس۔ اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ ایک چارٹر ہے جو پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا ہے۔ یہ ان مومنین اور مسلمین کے درمیان ہے۔ جن کا تعلق قریش اور یثرب سے ہے اور ان تمام لوگوں سے جو بعد میں ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کے ساتھ آملیں۔ اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔ یہاں دو فریقین کا ذکر آگیا کہ یہ وہ پارٹیاں ہیں جن کے درمیان یہ چارٹر جاری کیا گیا۔

یہ چارٹر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سربراہ ریاست دیا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک قبائلی نظام میں ایک ریاست قائم ہو رہی ہے۔ پہلی مرتبہ ایک ایسی امت قائم ہو رہی ہے جو مختلف قبائلی وابستگیوں سے ماورا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک دینی عقیدہ کی بنیاد پر ایسی وحدت قائم کی جاری ہے جو رنگ و نسل سے بالاتر ہے۔ ان دفعات سے یہ باتیں خود بخود سامنے آتی ہے۔

ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک مدینۃ النبی کا نام زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے دستاویز میں یثرب لکھا گیا ہے۔ بعد کی بعض دستاویزات میں مدینہ کا لفظ شامل ہے۔ جو قبائل اس دستاویز میں شامل ہوئے آگے چل کر ان کی فہرست الگ الگ دفعات میں بیان کی گئی ہے۔ یہودی قبائل ابتدا میں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے۔ خود کئی عرب غیر یہودی قبائل بھی شروع شروع میں اس دستور یا چارٹر میں شامل نہیں تھے۔ اوس کے بہت سے گروہ شروع ہی میں شامل ہو گئے، چار قبائلی گروپ شامل نہیں ہوئے۔ یوں مدینہ کے یہ لوگ غزوہ خیبر کے بعد شامل ہوئے۔ یہ جو بارہ چودہ میل چوڑا علاقہ تھا اس میں جو منتشر گاؤں یا آطام تھیں ان کا بیشتر حصہ اس میں شامل ہو گیا اور جو لوگ شامل نہیں ہوئے ان میں سے بعض نے اس کی مخالفت کی اور بعض نے سکوت اختیار کیا، لیکن بالادستی عملاً سب نے اس کی تسلیم کر لی۔

پہلی دفعہ سے سے یہ بات بھی واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ بنیادی طور پر قریش کے مسلمانوں اور انصار کے مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ انھی کو امت واحدہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ بقیہ لوگ ضمناً اس میں شامل ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی معاہدہ، حلف یا

ولا کے نتیجے میں قریش یا انصار کے ساتھ تھے۔ یا کچھ ایسے غیر قریشی مہاجرین جو مکہ مکرمہ میں آباد تھے اور ان کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔ مثلاً حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، یہ حضرات خود قریشی نہیں تھے، لیکن مختلف قریشی قبائل سے وابستہ تھے۔ وہ سب اس کے تحت شامل ہیں۔

اس کے بعد جو بقیہ دفعات ہیں ان میں بعض غیر مسلم مدنی قبائل کو بھی شامل کیا گیا۔ وہ غیر مسلم جن میں بعد میں پہلے مشرکین اور پھر یہودی بھی شامل ہو گئے۔ یہ بطور شہریان ریاست کے شامل ہوئے اور بطور افراد امت کے شامل نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں کہا گیا کہ ہم امۃ مع المومنین۔ ان کو امۃ من المومنین نہیں کہا گیا بلکہ امۃ مع المومنین کہا گیا۔

اس معاہدہ کے ابتدائی حصہ کے نفاذ کے بعد غزوۂ بدر تک بیشتر یہودی اس میں شریک نہیں رہے۔ کچھ قبائل تو پہلے شامل ہوئے تھے۔ غزوہ بدر کے بعد بقیہ یہودی شامل ہو گئے، البتہ کچھ یہودی قبائل آغاز ہی سے اس میں شامل تھے۔ ان کے بار میں الگ سے دفعات رکھی گئیں۔ ایک دفعہ تھی **وانه من تبعنا من يهود فان له النصر والاسوة غير مظلومين ولا متناصرين عليهم**، جو یہودی ہمارے اس معاہدہ میں ہماری پیروی کریں گے ان کو بھی اس طرح سے مدد فراہم کی جائے گی اور ان کو وہی مساوات فراہم کی جائیں گی جو قریش اور انصار کو دی جارہی ہے۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔ **وان اليهود ينفقون مع المومنين ما داموا محاربين**، یہ جملہ دو مرتبہ آیا ہے۔ اگر یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لیے کہا جائے گا تو وہ جنگ کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا بھی دفاع ہو گا۔ اپنے دفاع کے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے دفاع کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس سے بھی واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ امت واحدہ کے فرد نہیں تھے۔ اگر امت واحدہ کے فرد ہوتے یا ان کو امت واحدہ میں شامل سمجھا جاتا تو وہ اپنے دفاعی اخراجات کو خود ادا کرنے کے پابند نہ ہوتے۔

اس کے بعد آگے چل کر ایک ایک کرکے یہودی قبائل اس معاہدہ میں شامل ہوتے گئے۔ ان میں سے اکثر کی نشاندہی اس دستاویز کے متن میں کی گئی ہے۔ سات قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان قبائل کو وہ تمام مراعات دی گئیں جو ابتدا میں مسلمانوں کی دی گئی تھیں۔ اس دستاویز میں ایک دفعہ ایسی ہے جو تقریباً ہر قبیلہ کے حوالہ سے دہرائی گئی۔ آٹھ دس مرتبہ اس کو دہرایا گیا ہے۔ وہ ہے **المھاجرون من قریش علی ربعتھم یتعاقلون بینھم معاقلھم الاولیٰ**۔ یہی بات انصار کے بارے میں بھی ہے کہ وہ اپنے سابقہ طریقہ کار پر کاربند ہیں گے اور دیت کی ادائیگی آپس میں حسب سابق کرتے رہیں گے۔ گویا سوشل سیکورٹی کی ذمہ داری ہر قبیلہ کی اپنی ہو گی اور وہ اس نظام کے بدستور پابند ہوں گے جو ان کے قبیلے میں پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ بات مہاجرین کے ساتھ ساتھ، انصار کے آٹھ اور تمام یہودی قبائل سے بارے صراحت سے کہی گئی اور ان الفاظ کو ایک ایک کرکے دہرایا گیا۔

25 دفعات پر مشتمل پہلے جز کی آخری دفعہ میں یہ تھا کہ **و انکم مھما اختلفتم من شئی فانما مردہ الی اللہ عزوجل و الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم**۔ اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے تو اس کا آخری فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد علیہ الصلوۃ والسلام کریں گے۔ گویا شریعت کی بالادستی اور اختلافی امور یعنی غیر منصوص امور میں حضور علیہ الصلوۃ و السلام کی ذات مبارکہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس میں تمام شہریوں کو مساوات کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس سے پہلے عرب کے ماحول میں مساوات نہیں ہوتی تھی۔ بعض قبائل کا حق زیادہ ہوتا تھا اور بعض کا کم ہوتا تھا۔ یہاں تک تھا کہ اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا تو آدھی دیت دی جائے گی اور اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے تو پوری دیت دی جائے گی۔ فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا تو دگنی دیت ادا کی جائے گی۔ فلاں قبائل کا سردار مارا جائے گا تو قاتل قبیلہ کے چار سرداروں کو مارا جائے گا۔ اس طرح کے رائج الوقت نظام میں پہلی مرتبہ مساوات انسانی ایک قانونی اصول کے طور پر اختیار کی گئی۔ **سواسیۃ لا فرق بین صغیر و کبیر غنی و فقیر**۔ یہ سب برابر ہوں گے، چھوٹے اور بڑے اور غنی اور فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہو گا۔ پھر مزید وضاحت کے لیے کہا گیا کہ **تتکافو دماءھم و دیتھم واحدۃ**۔ ان سب کے

خون ایک دوسرے کے برابر ہوں گے اور دیت سب کی ایک ہی جیسی ہو گی۔ پھر فرمایا گیا کہ **ذمة الله واحدة**، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گارنٹی دی گئی ہے وہ سب کے لیے برابر ہے اور ایک جیسی ہے۔ **ان المومنین یحمی کل من الاخر**، سب اہل ایمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی طرح سے پہلی مرتبہ قبائلی تعصّبات سے بالاتر ہو کر جنگ اور صلاح کا اختیار ایک مرکزی حکومت کو دیا گیا۔ اس سے پہلے ہر قبیلہ بلکہ ہر فرد آزاد تھا کہ جب چاہے جنگ شروع کرے اور جس کے خلاف چاہے ہتھیار اٹھائے۔ اس ضمن میں دستاویز میں یہ کہا گیا کہ **سلم المومنین واحدة**، مسلمانوں کی مصالحت اور امن کا نظام ایک ہو گا۔ **لا یسالم مومن دون مومن**، کوئی ایک صاحب ایمان ایک صاحب ایمان کو چھوڑ کر کسی سے جنگ یا صلح کا معاملہ نہیں کرے گا **الاعلی سواء وعمل بینهم**، سوائے اس کے کہ سب کے لیے ایک جیسا نظام ہو اور عدل کے ساتھ سب کے لیے ایک جیسا نظام اختیار کیا جائے گا۔

یہودی جب اس چارٹر میں غزوہ بدر کے بعد شامل ہو گئے تو ان کے لیے بعد میں 24 مزید دفعات کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں پہلی دفعہ میں ہے **وان یهود بنی عوف امه مع المومنین**، بنی عوف کے یہودی مسلمان کے ساتھ ساتھ ایک الگ امت ہوں گے، **للیهود دینهم و للمسلمین دینهم** - یہودیوں کا اپنا دین ہو گا اور مسلمانوں کا اپنا دین ہو گا۔ دونوں جنگ کے دوران اپنے اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

یہ میثاق جو سنہ دو ہجری میں جاری ہوا۔ انسانی تاریخ میں پہلا تحریر اور مدون دستور ہے۔ حجاز اور عرب کی تاریخ میں بھی پہلی مرتبہ ایسی دستاویز مرتب ہوئی۔ صحابہ کرام کے پاس اس دستاویز کی نقلیں موجود رہیں۔ صحابہ کے خاندانوں میں ان نقول کی بہت اہتمام سے حفاظت کی جاتی تھی۔ امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں ایک صاحب کے پاس میں نے اس کی نقل دیکھی ہے۔ امام بیہقی کا انتقال 458ھ میں ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ 458ھ تک اس کی نقلیں صحابہؓ کے خاندانوں میں موجود تھیں۔

الغرض مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بلکہ باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک ریاستی نظم و نسق قائم کیا گیا، اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ و ابتلا کی روایت ختم ہو گئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔

اس میثاق اور معاہدے کے نتیجے میں مسلمانوں کا یہ پہلا اسلامی ریاست اور مملکت مدینہ منورہ میں قائم ہوا۔ جو آہستہ آہستہ صحابہ کرامؓ، بنو امیہ، بنو عباس کے دور تک لاکھوں مربع میل تک ایک عظیم خلافت کی شکل اختیار کر گیا (الحمد للہ علی ذالک)۔ لیکن افسوس جو چند صدیوں پہلے خلافت مغلیہ اور خلافت عثمانیہ کے زوال پر عارضی وقت کے لیے اختتام پزیر ہوا جس کی سزا تمام مسلمانان عالم آج تک بھگت رہے ہیں۔

انسانی حقوق کا پہلا اور عالمی چارٹر (منشور)

مغرب میں انسانی تاریخ کے تاریک دور اور روشن دور کی تقسیم کا واضح تصور موجود ہے اور ان میں حد فاصل انقلاب فرانس کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ انقلاب جو یورپ میں جمہوری دور کا نقطہ آغاز ثابت ہوا، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں رونما ہوا اور اس نے مغربی دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ چنانچہ مغرب میں انقلاب فرانس سے پہلے کے دور کو تاریک دور اور قرون مظلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جبکہ انقلاب فرانس کے بعد کا دور روشنی، علم، انسانی حقوق اور تمدن کا دور کہلاتا ہے۔

اسی طرح اہل اسلام میں بھی دور جاہلیت اور دور اسلام کی تقسیم کا ایک واضح تصور موجود ہے۔ چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کے کسی بھی واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے دور جاہلیت کا واقعہ کہا جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بعد کا دور علم، روشنی اور حقوق کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مغرب نے جس طرح دنیا کی اقوام و طبقات اور انسانی سوسائٹی کے افراد کے باہمی تعلقات کی حدود کار اور ان کے باہمی حقوق اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی دستاویزات میں بیان کی ہیں، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلاب فرانس سے کم و بیش بارہ سو سال قبل ان حقوق و معاملات کی نشاندہی فرمادی تھی جو قرآن کریم کی بیسیوں آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینکڑوں ارشادات میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اور اس کے لیے بطور خاص "خطبہ حجۃ الوداع" کا حوالہ دیا جاتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے چند ماہ قبل حج کے موقع پر منٰی اور عرفات کے میدانوں میں صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

یہ خطبہ حجۃ الوداع سینکڑوں احادیث نبویہ میں بکھرا ہوا موجود ہے۔ اس اجتماع میں شریک صحابہ کرام میں سے جس کو جو جملہ یاد رہا، اس نے اپنے ذوق کے مطابق اسے روایت

کردیا۔ بہت سے اصحاب علم نے اس تاریخی خطبے کو مجتمع کرنے کے لیے مختلف اوقات میں کام کیا اور اس کے متعدد مجموعے کتابچوں اور مقالات کی صورت میں ہمارے علمی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ آج دنیا میں انسان کی معاشرتی ذمہ داریوں اور حقوق کے حوالہ سے اقوام متحدہ کا ہیومن رائٹس چارٹر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ سیاسی طور پر ایک بڑے سمبل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور بعض حوالوں سے وہ سمبل ہے بھی، جبکہ بہت سے حوالوں سے یہ اسلامی تعلیمات سے ٹکراتا بھی ہے۔ لیکن اگر ہم اس ارتقا کو دیکھیں جو تیرہ، چودہ سو سال میں ہوا ہے، یعنی تیرہ سو سال بعد دنیا جن اصولوں پر آئی ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی رہنمائی کے یہ اصول تیرہ، چودہ سو سال پہلے ہمیں بڑی وضاحت کے ساتھ عطا فرمائے تھے۔ اور یہ انسانی برادری کے حوالے سے تھے، کسی علاقائی یا نسلی حوالے سے نہیں تھے۔

آج لوگ گلوبلائزیشن اور انٹرنیشنلزم کا نعرہ لگاتے ہیں جبکہ نسل، رنگ، وطن اور قومیت سے بالاتر ہو کر سب سے پہلے جس شخصیت نے دنیا کو خطاب کیا ہے، اس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سب سے پہلی دعوت دی تو یہ کہہ کر مخاطب ہوئے: **یاایھا الناس قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا** (مسند احمد، رقم: ۱۵۴۴۸) اے لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ آپ کے مخاطب عرب اور مکی تھے۔ یہ بالکل ابتدائی دعوت تھی، ابھی دو چار لوگ ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اس وقت بھی حضورؐ نے نہ عرب کا ٹائٹل اختیار کیا، نہ قریش کا، نہ علاقے کا، بلکہ کہا: ایھا الناس۔ لہٰذا دنیا میں سب سے پہلے گلوبلائزیشن کی بات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ آپؐ نے قوم، نسل اور جغرافیہ سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کو مخاطب کیا اور صرف مخاطب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے اصول بتائے ہیں، اس کے ضوابط بتائے ہیں، اخلاقیات بتائی ہیں، اور پھر عملی طور پر ایک سوسائٹی بنا کر دکھائی ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبۂ مبارک حجۃ الوداع بین الاقوامیت کا پہلا اور سب سے جامع منشور تھا۔ آج بھی ہمارے لیے اور دنیائے انسانیت کے لیے یہی منشور رہنما

منشور ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اس کو پیش کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہاں پر اولین عالمی منشور یعنی خطبہ حجۃ الوداع کے دفعات پر اختصاراً تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) مساوات:

نہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے، بزرگی اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

(۲) اخوت:

ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(۳) حسن سلوک:

غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کا خیال رکھو اور انھیں وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو۔

(۴) حقوق کی ادائیگی:

حقدار اور وارث کو اس کا حق ادا کرو۔

(۵) نسب کی حفاظت:

بچوں کے نسب کی حفاظت کرو اور انھیں والدین کی طرف منسوب کرو۔

(٦) جان، مال اور عزت کا تحفظ:

تمھارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح عرفہ کے دن، ذی الحجہ کا مہینہ اور مکہ مکرمہ کی سرزمین کو حرمت وتقدس حاصل ہے۔

(۷) امانت کی حفاظت:

امانت کی حفاظت کرو، نیز قرض اور ادھار پر لی ہوئی چیز حسب وعدہ واپس کرو۔

(۸) سود کے خاتمے کا تاریخی اعلان:

دور جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا، میں اپنے خاندان عباس بن عبد المطلب کا پورا سود ختم کرتا ہوں۔

(۹) عورتوں کے حقوق کی تاکید:

تم پر عورتوں کا حق ہے کہ تم انھیں اچھے طریقے سے کھلاؤ پلاؤ کیونکہ وہ تمھاری پابند ہیں اور اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا۔

(۱۰) عورتوں کو نصیحت:

عورت ہرگز کسی دوسرے مرد سے تعلقات قائم نہ کرے اور شوہر کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے جانی ومالی خیانت کی مرتکب نہ ہو۔

حقوق نسواں کا عالمی چارٹر

آج حقوق نسواں کے نام پر مغربی تہذیب کو مسلط کیا جارہا ہے اور حقوق نسواں کے علمبردار ہی عورت کی عصمت وناموس کے سب سے بڑے دشمن ثابت ہورہے ہیں۔ آج سے چودہ سوسال قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃالوداع کے موقع پر حقوقِ نسواں کے حوالے سے ایسی معتدل اور جامع ہدایات ارشاد فرمائیں جو مرد وعورت دونوں کے لیے قابل قبول اور مشعل راہ ہیں۔

صحیح احادیث کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

خبردار! تمھارے لیے عورتوں سے حسن سلوک کی وصیت ہے، کیونکہ وہ تمھاری پابند اور ماتحت ہیں۔ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کے تحت ان کے ''ستر'' تمھارے لیے حلال ہوئے۔

عورتوں پر جو حقوق مردوں کے واجب ہیں۔ وہ یہ ہیں:

نیکی کے کاموں میں خاوندوں کی نافرمانی نہ کریں۔ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں۔ وہ تمھارے بستر پر کسی دوسرے شخص کو نہ آنے دیں۔ وہ تمھارے گھر میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو، مگر یہ کہ تمھاری اجازت سے ہو، کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

دیکھو! مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں، مثلاً:

کھانے پینے، پہننے اوڑھنے (خوارک ولباس) کے بارے میں ان سے اچھا سلوک کرو۔

حسب حیثیت ان کی خوارک، لباس، رہائش، نان نفقہ مردوں کے ذمہ ہے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ کا شہری نظام

نبی کریمؐ کی آمد سے قبل مدینے میں کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ تمام نظام کا آغاز آپؐ ہی نے فرمایا اور اسے ترقی دی اور اس کے تسلسل اور ارتقا کے لیے اصول وضوابط متعین کیے۔آپؐ نے اس نظام کی بنیاد ان اصولوں پر رکھی جو بعد میں چل کر ترقی یافتہ تہذیب کی بنیاد بنے۔

آپؐ نے جدید ترین خطوط پر مدینہ شہر کی منصوبہ بندی فرمائی۔رہایشی سہولتوں اور آمد ورفت میں آسانی کے حوالے سے بھی اصول وضوابط متعین فرمائے،راستوں کو کشادہ رکھنے کی ہدایت فرمائی،نئے محلے قائم کیے اور کسی ایک مقام پر آبادی کو مرتکز کرنے کے بجائے حکم دیا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آبادیاں قائم کی جائیں۔اجتماعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مدینہ میں یہودیوں کے بازار کے مقابل اسلامی اصولوں پر ایک نئے بازار کی بنیاد رکھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ اس بازار کا دورہ فرماتے،اوزان وپیمانہ جات کا جائزہ لیتے اور کاروبار کرنے والوں کو غلطی پر ٹوکتے اوران کی اصلاح فرماتے۔

کسی بھی شہر کی آباد کاری میں عدالت، ہسپتال، گیسٹ ہاؤس، سڑکیں، پارک، تعلیم گاہیں، سیکریٹریٹ اور عبادت گاہوں کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی منصوبہ بندی کرتے وقت ان تمام ضروریات وسہولیات کو بھی ترجیحی حیثیت دی اوران کے انتظام وانصرام کا باقاعدہ انتظام فرمایا۔

حدود کا تعین:

اگرچہ مدینہ منورہ کی ارضی حدود کا تعیّن اہل علم وسیر کے درمیان متفق علیہ امر نہیں ہے لیکن آپؐ نے شہر مدینہ کی حدود کا جو تعین کیا وہ درج ذیل ہے: مشرق اور مغرب میں لاوے کی پہاڑیاں اور حرہ کا میدان، شمال میں جبل ثور اور جنوب میں جبل عیر مدینہ کی حدود اربعہ قرار پائے۔رسول پاکؐ نے مکہ کی طرح مدینہ کو بھی حرم قرار دیا۔ صحیح مسلم کی روایت

ہے: المدینة حرم ما بین عیر وثور۔مدینہ عیر سے ثور تک حرم ہے۔جبل ثور اُحد کے پیچھے ہے یہ مکہ کے ثور کے علاوہ ہےاور جبل عیر ذی الحلیفہ کی میقات کے پاس مکہ کی طرف ہے۔

مسلمانوں کی آبادکاری کا انتظام:

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ہی جب مہاجرین بڑی تعداد میں مدینہ پہنچنا شروع ہوئے تو ان کی آبادکاری کا مسئلہ سامنے آیا۔ کچھ مہاجرین کی آبادکاری کا انتظام تو مدینہ میں موجود ان کے واقف کاروں کی جانب سے ہوگیا، لیکن سب افراد کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ اس مسئلے کے مکمل حل کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مّکی اور مدنی مسلمان خاندانوں کے سربراہوں کا ایک بڑا اجلاس بلوایااور انھیں تاکید و نصحیت کی۔ جس کی رُو سے ہر صاحبِ حیثیت مدنی خاندان کے سربراہ کو ایک مّکی خاندان کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا اور اس کے ساتھ مؤاخاتی طور پر سلوک روا رکھنا تھا۔ اجلاس فوری طور پر تقریباً۱۸۶مکی حضرات کی مؤاخاة انصاری صحابہ سے قائم فرمادی۔

اس کے بعد کے مدنی دور میں جن آبادیوں کے افراد متفرق طور پر ایمان لاتے یا کسی جگہ کی چھوٹی آبادی ایمان لاتی تو ان کو مدینے میں لاکر بسایا جاتا،اور ان کی تعلیم وتربیت اور معاش کا انتظام کیا جاتا۔اس طریقے سے رفتہ رفتہ مدینے کی مسلم آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یہ تمام آبادکاری ایک مخصوص انتظام وانصرام کے تحت ہوئی۔ہر آبادی کی ایک مسجد تھی،مارکیٹ تھی اور بعض بستیوں میں اپنا قبرستان تک بھی موجود تھا۔

ہر شہری کے لیے مکان:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ بات یہ تھی کہ ہر شہری کو علیحدہ مکان دستیاب ہو،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من سعادة المرء الدار الوسیع والمرکب الھنی

انسان کی خوش حالی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں کشادہ مکان اور قابو کی سواری بھی ہے۔

چنانچہ مہاجرین مکہ کو ابتدا میں انصار کے ساتھ ان کے گھروں میں ٹھہرایا گیا، بعد میں نبی کریمؐ نے ان کے لیے قطعہ اراضی کی فراہمی اور مکانات کی تعمیر کا منصوبہ بنا کر ان کو اپنے گھروں میں آباد کیا۔ اس آباد کاری کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے افتادہ زمین کو استعمال کیا اور انصار کی طرف سے ہبہ کردہ آباد جگہوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ اس آبادکاری میں حضرت حارثہ بن نعمانؓ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کام کے لیے نبی کریمؐ کو اپنی زمین اور مکانات ہبہ کیے۔

آبادی میں اضافے کا حل:

مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے سبب مدینے کی آبادی بڑھنے لگی۔ آبادی میں اضافے سے شہر کی زمین رہائش کے لیے کم اور پہلے کی بہ نسبت مہنگی ہوتی چلی گئی۔ اس دشوارای اور مشکل کو حل کرنے کے لیے رسول پاکؐ نے ایک سے زیادہ منزلہ عمارات بنانے کا مشورہ دیا۔ خود رسول پاکؐ ہجرت کے بعد سات ماہ تک حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے دو منزلہ مکان میں قیام فرما ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کثیر الاولاد تھے، ان کے لیے ان کا مکان چھوٹا پڑتا تھا۔ انھوں نے رسول پاکؐ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اُوپر کی منزل تعمیر کرو اور اللہ سے کشادگی کی دُعا بھی کرو"۔

شہروں کی آبادکاری:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں کسی بھی شہر کی حد بندی کی زیادہ سے زیادہ حد پانچ سو ہاتھ مقرر فرمائی اور ارشاد فرمایا: اگر شہر کی آبادی اس سے بڑھ جائے تو دوسرا شہر آباد کیا جائے۔ عہد نبویؐ کے اختتام تک مدینہ شہر کی حدود مغرب میں بطحان تک، مشرق میں بقیع تک، اور شمال مشرق میں بنی ساعدہ کے مکانات تک پھیل چکی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے رسول کریمؐ نے ایک موقعے پر فرمایا: جب مدینے کی آبادی سلع تک پہنچ جائے تو تم مدینہ چھوڑ دینا اور شام چلے جانا۔ ان احکامات اور واقعات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول پاکؐ مدینہ شہر کی آبادی اور اس کے وسائل میں تناسب قائم رکھنے کے لیے غیر ضروری طور پر بڑھنے سے روکنے کے حق میں تھے اور دوسرے شہر آباد کرنے کی ہمت افزائی

فرماتے تھے۔ یہ وہی پالیسی تھی جس پر بعد میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے عمل کرتے ہوئے کوفہ اور بصرہ جیسے نئے شہر آباد کیے۔

عبادگاہ اور مرکزی سیکرٹریٹ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر فرمائی۔ یہ مسجد ہمارے زمانے کی عام مسجدوں کی طرح محض ایک عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ وہ اسلامی ریاست کا سیکرٹریٹ بھی تھی اور عبادت گاہ بھی، تعلیم گاہ بھی تھی اور حسب ضرورت وہاں خیمہ نصب کرکے ہسپتال کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

مسجد نبویؐ جائے وقوع کے اعتبار سے مدینے کے وسط میں واقع ہے۔ جب رسول پاکؐ مکہ سے ہجرت کرکے تشریف لائے تو قباء، بنوسالم اور کئی محلوں کے لوگوں نے دست بستہ اپنے یہاں قیام کی پیش کش کی، مگر حضوراقدسؐ قبیلہ بنونجار میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر فروکش ہوئے جو آج صحن مسجد کا حصّہ ہے۔

اس جگہ کے انتخاب کی حکمت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ہم مدینے کی شاہراہوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہی ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی رہائش گاہ اور سیکرٹریٹ بھی تھا۔ جہاں منصوبہ بندی کی جاتی، جہاں سے فوج کشی کی جاتی، جہاں سے مبلغین اور معلّمین بھیجے جاتے، جہاں حساب کتاب رکھا جاتا اور جہاں سے مختلف گورنروں اور دیگر ممالک کے سربراہوں سے خط وکتابت کی جاتی تھی۔

مرکزِ تعلیم:

وہیں ایک چبوترے پر صفہ کی تعلیم گاہ بھی بنادی گئی، جس کی حیثیت مرکزی اقامتی درس گاہ یا اعلیٰ تعلیمی ادارے کی تھی، کیوں کہ مسلمانوں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ ابتدائی تعلیم اپنے محلوں کی مساجد میں حاصل کریں۔ صفہ کی حیثیت تعلیم گاہ کے علاوہ نادار مسلمانوں کی پناہ گاہ کی بھی تھی۔ دن میں پانچ مرتبہ لوگوں سے رابطے کے لیے مؤذن کا تقرر کیا گیا۔

عہد نبویؐ میں تعلیم کو بڑی اہمیت دی گئی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ معلم کتاب وحکمت، محسن انسانیت پر نازل ہونے والی اوّلین وحی کا اوّلین لفظ اقراء یعنی پڑھیے

تھا۔ قرآنِ حکیم نے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں کتاب و حکمت اور اس چیز کی تعلیم دیتے ہیں جو تم نہ جانتے تھے۔ (البقرۃ ۲:۱۵۱)

ہجرت سے قبل اگرچہ کوئی متعین تبلیغی ودعوتی مرکز نہ تھا جہاں رہ کر مسلمانوں کے لیے اطمینان وسکون کے ساتھ اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ممکن ہوتا۔ اس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی متحرک درس گاہ اور تبلیغی مرکز تھی۔ تاہم ہجرت سے قبل مدینہ منورہ میں ہی تبلیغی مرکز قائم ہوچکے تھے۔ جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے قائم کیا گیا تھا۔ قبل از ہجرت اسلام کی تبلیغ میں تیزی بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد آئی تھی۔ اس دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معصب بن عمیرؓ کو مبلغ اسلام بنا کر انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج میں بھیجا تھا۔ ان کی محنت سے وہاں کے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس دور میں پہلا تبلیغی مرکز مسجد بنی زریق تھی۔ اور تیسرا مرکز مدینہ کے شمال میں کچھ فاصلہ پر نقیع الخضمات نامی علاقے میں واقع تھا۔ یہ مرکز درحقیقت حضرت اسعد بن زرارہؓ کے مکان میں قائم تھا۔

ان درس گاہوں کے علاوہ اس زمانے میں مدینہ منورہ کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں تعلیمی مجالس اور حلقے جاری تھے۔ جن میں بطور خاص، بنونجار، بنوعبدالاشہل، بنوظفر، بنوعمروبن عوف، بنوسالم وغیرہ کی مساجد میں اس کا انتظام تھا، اور عبادہ بن صامت، عتبہ بن مالک، معاذ بن جبل، عمر بن سلمہ، اسید بن حضیر، مالک بن حویرث رضوان اللہ اجمعین ان کے ائمہ اور معلّمین تھے۔

ان تمام مراکز تعلیم ودعوت کی موجودگی کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حکمت وبصیرت نے فیصلہ کیا کہ تعلیم وتربیت کا مرکز ایسا ہونا چاہیے جہاں ہر روز مقررہ اوقات پر مسلمانوں کا اجتماع ہو اور اس اجتماع کی حیثیت گویا فرض وواجب کی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کو منتخب کیا۔ اس اعتبار سے مسجد نبویؐ اسلام کا پہلا

مرکز تعلیم وتربیت ہے۔اس مقصد کے حصول کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ کے ایک کنارے پر ایک جگہ مخصوص کرلی، جسے اس کے سائبان کی وجہ سے ”صفہ“ کہتے تھے۔ یہ دراصل ایک کھلی اقامتی درس گاہ تھی، جس میں ہر چھوٹا بڑا شخص تعلیم وتربیت حاصل کرتا تھا، چاہے وہ اس میں اقامت گزیں ہو یا نہ ہو۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جنھوں نے اپنی کُل زندگی دین اسلام سیکھنے کے لیے وقف کردی تھی، تعلیم وتربیت کے حصول کے لیے اس میں اقامت گزیں ہوگئی۔انھیں اصحاب صفہؓ کہتے تھے۔اس اعتبار سے اگر مسجد نبویؐ کی اس درس گاہ کو عصر حاضر کی اقامتی اور کھلی درس گاہوں کا پیش خیمہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

بازار اور تجارتی مراکز کا قیام:

شہری آبادی کی معاشی، سماجی اور یومیہ ضروریات پوری کرنے کے لیے شہر میں مارکیٹ اور تجارتی مراکز کا قیام بھی ناگزیر ہے۔ رسول پاکؐ نے اس بنیادی ضرورت کو محسوس فرمایا، کیوں کہ بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کرکے مدینہ میں آباد ہوگئے تھے، جن کے پاس زمین جائیداد نہیں تھی، وہ تجارت پیشہ تھے اور ان کے معاشی استحکام کا ذریعہ تجارت ہی ہوسکتی تھی اور اس کے لیے بازار اور مارکیٹ کا فروغ شہری ریاست کی اہم ضرورت بن گئی تھی۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں دو اُمور کی طرف توجہ فرمائی۔ ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت اور ملازمت کے مقابلے میں تجارت کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اسے فروغ دینے کی ضرورت واضح فرمائی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان دار تاجر کو اجر کے لحاظ سے صدیقین، شہدا اور انبیاء علیہم السلام کے ہم رُتبہ قرار دیا۔

تجارت کرنے والے افراد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعائیں کیں اور بھیک مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی کی۔ نیز تجارت میں جھوٹ بولنے ، دھوکا دینے اور بدمعاملگی کرنے پر پابندی لگائی، تاجروں کو یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ مالی اُمور کی نزاکت کے سبب اکثر تاجر روزِ قیامت گناہ گاروں کی صف میں ہوں گے، مگر سچے اور متقی تاجروں کا ان سے

استثنا فرمادیا، فرمایا: ”بلاشبہہ قیامت کے دن (اکثر) تاجر گناہ گار اُٹھائے جائیں گے، سوائے ان کے جو اللہ سے ڈرے اور انھوں نے نیکی کی اور سچ کو اپنا شعار بنایا“۔

مدینہ کی مرکزی مارکیٹ:

آپؐ نے وسط مدینہ میں ایک مرکزی مارکیٹ بنوائی، جسے سوق المدینہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت مدینے کی مشہور اور بڑی مارکیٹ قینقاع تھی جو یہودیوں کے علاقے میں تھی۔ وہاں وہ گاہکوں کا استحصال کرتے اور ان کی عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بد تمیزی بھی کرتے۔ اسی وجہ سے وہ جلاوطن بھی کیے گئے۔

رسول پاکؐ نے اس کے مقابلے میں مدینے کی مرکزی جگہ پر مسجد نبویؐ اور بقیع کے نزدیک سوق المدینہ بازار بنوایا۔ اس زمانے میں قینقاع کی مارکیٹ کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی کئی مارکیٹ تھیں، مثلاً زبالہ مارکیٹ، جسر مارکیٹ، صفاجت مارکیٹ وغیرہ۔ مگر رسول پاکؐ نے بازار مدینہ کو سپر مارکیٹ کی حیثیت دی۔ جہاں ضرورت اور تجارت کی ساری چیزیں مہیا ہوں۔ رسول پاکؐ نے اس سپر مارکیٹ کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے قینقاع کے بازار کے ساتھ متعدد مقامات کا معائنہ فرمایا اور بالآخر مدینہ بازار کے محل وقوع کا تعین فرمایا۔

حضرت عطا بن سیارؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے مارکیٹ بنانے کا ارادہ فرمایا تو پہلے قینقاع کے بازار تشریف لے گئے۔ پھر سوق المدینہ کی جگہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں سے اشارہ فرمایا کہ یہ تمھاری مارکیٹ ہوگی۔

حضرت عباس بن سہیلؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ساعدہ تشریف لائے اور فرمایا: میں تمھارے پاس ایک ضرورت سے رُکا ہوں۔ تم لوگ اپنے قبرستان کی جگہ مجھے دے دو، تاکہ میں وہاں مارکیٹ بناؤں۔ بعض لوگوں نے اپنے حصے کی زمین دے دی اور بعض نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہاں ہماری قبریں ہیں اور ہماری عورتوں کے نکلنے کی جگہ ہے، مگر بعد میں باہم گفت وشنید سے وہ جگہ حضورؐ کے حوالے کر دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں مارکیٹ بنادی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مارکیٹ کی مرکزیت، وسعت اور عوامیت کو برقرار رکھنے کے لیے فرمایا: "یہ تمھارا بازار ہے، نہ تو اس کو کم کرو اور نہ اس میں ٹیکس لگاؤ"۔

اس حکم نامے کی حکمت یہ تھی کہ اگر بازار کی جگہ تنگ ہوگی یا اس میں خرید وفروخت پر ٹیکس لگے گا تو بیوپاریوں کی کثرت نہ ہوگی، لہٰذا ان دونوں باتوں سے گریز کیا جائے۔ رسول اللہ نے اس مارکیٹ میں خرید وفروخت کرنے کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے بازار میں سامان لانے والا مجاہد فی سبیل اللہ کے مانند ہے اور بازار میں سامان روکنے والا اللہ کی کتاب میں سرکشی کرنے والے کے مانند ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: سامان روکنے والا مجرم ہے۔

مدینہ کی مارکیٹ کی وسعت اور مرکزیت بعد میں بھی برقرار رہی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک لوہار نے اس مارکیٹ میں ایک بھٹی لگالی، تو حضرت عمرؓ نے اسے منہدم کردیا اور فرمایا کہ تم رسول اللہؐ کی مارکیٹ کا دائرہ تنگ کر رہے ہو۔

مارکیٹ منتظمین کا تقرر:

مقام منتظمین میں بازار کے منتظم کا ذکر بھی ملتا ہے جو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شہر مدینہ اور دوسرے بازاروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار واختیار بہ طور سربراہِ مملکت قائم تھا۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لیے ایک مخصوص منتظم بازار کا تقرر کیا تھا، اور وہ حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد بنواُمیہ کے خاندان سعیدی کے ایک فرد حضرت سعید بن سعید اُموی کو مکہ کے بازار کا منتظم مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی مثال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ منتظم مستقل ہوتے تھے اور ان کو اس خدمت کا معاوضہ بھی ملتا تھا۔

سرکاری مہمان خانہ:

نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہر کی بلدیاتی تنظیم میں اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ سرکاری مہمانوں اور آنے والے وفود کے لیے مہمان خانوں کا انتظام کیا جائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنے اور دین اسلام کو سمجھنے کے لیے آئے دن نومسلموں اور مہمانوں کی آمد ہوتی تھی۔ ان مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام انصار کے

گھروں میں کیا جاتا اور بعض اوقات انھیں مسجد نبویؐ میں بھی ٹھہرایا جاتا، خصوصاً صفہ کے مدرسے میں۔ بعد میں جب خوش حالی آئی اور مہاجرین کے مکانات تعمیر ہونے لگے تو باقاعدہ طور پر سرکاری مہمان خانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک بڑا گھر بنایا۔ ان کے اس بڑے گھر کو مہمان خانہ بنادیا گیا۔ نورالدین سمہودی تحریر کرتے ہیں: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو ٹھہرایا کرتے تھے، چنانچہ اس گھر کو مہمان خانہ بھی کہا جاتا تھا۔

مدنی زندگی کے آخری دنوں میں، بالخصوص ۹ ہجری میں، جب مفتوحہ ممالک کے وفود کی آمد کثرت سے ہونے لگی، جن کی تعداد بعض اوقات ۲۰۰ تک پہنچ جاتی تھی، تو بعض بڑی حویلیوں کو مہمان خانہ بنا کر ان کے قیام وطعام کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس طرح رسول پاکؐ نے آنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی کے لیے انصار کی روایتی مہمان نوازی کے جذبے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ مہمان خانے بھی قائم فرمائے۔

سڑکوں اور گلیوں کا معیار:

آبادی میں اضافے کے ساتھ جب شہر گنجان ہونے لگا تو گلیاں اور راستے بھی تنگ ہونے لگے۔ رسول پاکؐ نے ہدایت فرمائی کہ راستوں کو اتنا چوڑا رکھا جائے: ”جب تم راستوں کی توسیع کرو تو انھیں سات گز چوڑا رکھو (تاکہ) لدے ہوئے دو جانور بآسانی آمنے سامنے گزر سکیں۔

اس بات سے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورویہ ٹریفک اور بلدیاتی منتظمہ کا تصور دیا۔ سڑکیں شہر کے ڈھانچے کا ایک اہم حصہ ہوتی ہیں، انھیں ہر ممکن حد تک وسیع ہونا چاہیے تاکہ آنے جانے کے نظام میں کوئی خلل نہ پڑے۔

صفائی کا اہتمام:

بلدیاتی انتظام میں صحت وصفائی بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کے تحت اس بات کو یقینی بنانا شامل ہے کہ سڑکوں، گلیوں اور محلوں میں غلاظت اس طرح جمع نہ ہو جائے کہ وہ صحت اور ماحول کے لیے خطرہ بن جائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر، آنگن اور

ماحول کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ شہری صفائی کے اس معاملے کو حضورؐ نے نظر انداز نہیں کیا۔ آپؐ نے جہاں صفائی کو نصف ایمان قرار دیا وہاں اس کے لیے عملی اقدامات بھی فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ کی صفائی کے لیے ام محجن نامی ایک حبشی عورت کو مقرر فرمایا۔ ابتدائی دور میں رفع حاجت کے لیے بالعموم مدینہ کے مرد وخواتین جنگل میں نکل جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضروری مسئلے پر بھی توجہ فرمائی۔ سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سڑکوں اور سایہ دار درختوں اور ادھر ادھر رفع حاجت کرنے سے منع فرمایا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے گھروں کے ساتھ بیت الخلا بنانے کی تعلیم وترغیب دی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ واقعہ افک کا تذکرہ کرتے ہوئے ام مسطح کے ساتھ ایک شب باہر نکلنے کی بابت فرماتی ہیں: ''یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ہمارے گھروں سے متصل بیت الخلا نہیں بنے تھے، اور ہم اوّلین عربوں کی طرح باہر جاکر پاکی حاصل کرتے تھے۔

روشنی کا انتظام:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ میں چراغ جلانے کے لیے ایک شخص کا تقرر فرمایا جو رضاکارانہ طور پر روزانہ مسجد نبویؐ میں چراغ جلاتا تھا۔ روایت میں ہے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہماری مسجد کو کس نے روشن کیا؟ تمیم نے عرض کیا: میرے اس غلام نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اس کا نام کیا ہے؟ اس نے عرض کیا! فتح۔ (اس پر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کا نام سراج (چراغ) ہے۔ ملک عرب میں بلدیاتی اور ریاستی سطح پر صفائی اور عوامی مقامات پر روشنی، سینی ٹیشن اور اسٹریٹ لائٹس کے منظّم انتظام کی جانب یہ پہلا قدم تھا۔

ہسپتال کا قیام:

امام بخاریؒ نے باب الخیمۃ للمرضی فی المسجد قائم کرکے یہ واضح کیا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہسپتال کے قیام کو بھی اپنی اوّلین توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے لیے مسجد نبویؐ کے صحن میں خیمہ نصب کیا جاتا، جہاں مریضوں کا علاج ہوتا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی جانے والی صحت وصفائی کی تعلیم نے بیماری کو کم سے کم کردیا تھا۔ اس کے باوجود جو لوگ بیمار ہوتے تھے، ان کا علاج کرانے پر زور دیا گیا اور ان کے لیے مسجد نبویؐ میں شفاخانہ کا انتظام کیا گیا۔

تفریح گاہوں کا قیام:

صحت مند ماحول اور معاشرے کی فراہمی شہری حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب شہروں کی منصوبہ بندی میں پارک اور سیر گاہ کو آج غیر معمولی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ ضرورت عہد نبویؐ میں بھی نظر آتی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لیے مدینہ شہر کے باہر وادی عقیق کو منتخب فرمایا تھا۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیر گاہ حمی النقیع کے نام سے بنوائی، جو گھوڑوں کی چراگاہ بھی تھی۔ وہاں پیڑ پودے اس کثرت سے لگوائے گئے کہ وہ خوب صورت تفریح گاہ بن گئی۔ باغات، پانی اور شادابی کے سبب یہ جگہ سیر گاہ مدینہ کہلائی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم آرام کے لیے وہاں تشریف لے جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جگہ بے حد پسند تھی۔

ایک مرتبہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب وادی عقیق کی سیر سے لوٹے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا میں وادی عقیق سے آرہا ہوں، کتنی موزوں جگہ ہے اور کتنا میٹھا اس کا پانی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر کیوں نہ ہم لوگ وہاں منتقل ہو جائیں؟ تو حضورؐ نے فرمایا، اب یہ کیسے ممکن ہے، لوگوں نے مدینے میں گھر بنالیے ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں جو اہل ثروت تھے، وہ وہاں جا کر اپنے محلات تعمیر کر لیتے تھے۔ یہ گویا ان کے لیے، سمر ہاؤس تھے۔ اہل مدینہ کے لیے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ایک خوب صورت عطیہ تھا۔

شہر کی تزئین اور شجر کاری:

رسول پاکؐ نے مدینہ کی ٹاؤن پلاننگ کرتے وقت صرف اس کی آباد کاری اور سہولیات کی فراہمی کا ہی خیال نہیں رکھا بلکہ شہر کی زینت و رونق اور خوب صورتی کو بھی پیش نظر رکھا۔ اسی وجہ سے یہاں کے قلعوں کو مسمار کرنے اور بلا ضرورت درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ محدث بیہقی فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی زینت اور خوب صورتی کو پیش نظر رکھا تا کہ یہ شہریوں کے لیے سکونت کی اچھی جگہ رہے۔ اسی لیے آپؐ نے مدینے کے قلعوں اور گڑھیوں کو مسمار کرنے سے منع فرمایا۔“ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے قلعوں کو مسمار کرنے سے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ وہ مدینے کی زینت ہیں۔

مقامی بلدیاتی منتظمین کا تقرر:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کا بلدیاتی نظام چلانے کے لیے مقامی طور پر منتظمین کا بھی تقرر فرمایا تھا۔ یہ منتظمین بے شمار تھے۔ ان مقامی منتظمین میں شہر مدینہ کے نقیب بھی شامل ہیں۔ ان کی انتظامی ذمہ داری بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ ان کی تعداد شروع میں ۱۲ تھی جن میں نو خزرج اور تین اوس کے تھے۔ بعد میں بعض کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں کو مقرر کیا گیا جن کی کل تعداد ۱۸ تھی۔ ان میں سے خزرج کے ۱۲ افراد تھے۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ خزرج کے نقیب الانقبا تھے مگر ہجرت کے فوراً بعد ہی ان کی وفات ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عہدہ جلیلہ بنفس نفیس سنبھال لیا۔

حرفِ آخر:

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت صرف ایک روحانی پیشوا، مذہبی رہنما اور معلم اخلاق ہی کی نظر نہیں آتی بلکہ ایک مفکر، منتظم اور منصوبہ ساز کی بھی نظر آتی ہے۔ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی تعمیر کی اَن گنت صلاحیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت کی تھیں اور پھر اپنے فیضانِ خاص سے بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی فرمائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بیک وقت دینی و دنیاوی دونوں لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب رہنما اور حکمران ثابت ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال شہری آبادکاری اور تعمیرات کے سلسلے میں آپؐ کی وہ منصوبہ بندی ہے جس کی کچھ جھلکیاں اُوپر پیش کی گئی ہیں۔

ریاست مدینہ کا شعبہ تعلیم اور دیگر شعبہ جات

اسی طرح مدینہ منورہ میں شروع میں نو مساجد اور بعد میں چالیس مساجد قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مساجد میں درس و تدریس کا انتظام بھی تھا۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ اس پورے درسی نظام کے سربراہ تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اس ریاست کے پہلے وزیر تعلیم تھے تو شاید درست ہو گا۔ وہ تمام مساجد میں خود تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں جہاں قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی، اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد مسجد میں ایک مخصوص حصہ تعلیم گاہ کے طرز پر مختص کر دیا جسے صفہ کہتے ہیں خود براہ راست صفہ میں جو صحابہ زیر تعلیم تھے، ان کی نگرانی عبادت بن صامت فرمایا کرتے تھے۔ صفہ مسجد نبوی میں ایک حصہ تھا جہاں صحابہ کرام بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ باہر سے آنے والے صحابہ کرام اکثر و بیشتر صفہ میں ٹھہرتے تھے جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ یہ صحابہ کرام وہ تھے جو بعد میں بڑے بڑے فاتحین اور سردار بنے۔ فاتح شام حضرت عبیدہ بن الجراح بھی صفہ میں مقیم رہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی بھی ایک زمانے میں صفہ میں مقیم رہے۔ مشہور راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ بھی صفہ میں مقیم رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفہ میں ملنے والی تربیت کس انداز کی تھی۔

مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج پہلے سے تھا۔ سوید بن صامت۔ جو حضرت لقمان حکیم کے حکمت نامہ سے واقف تھے اور اس کو پڑھتے بھی تھے۔ مدینہ منورہ میں بہت سے صحابہ تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کئی حضرات ایسے تھے جو کامل کہلاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بندوبست اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہجرت کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کفار مکہ میں جو قیدی جنگ بدر میں ہاتھ آئے تھے ان میں سے بہت سوں نے مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ یہ ان کا فدیہ تھا جس کے بدلے میں ان کو رہا کر دیا گیا۔ جو حضرات مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے ان میں ایک نمایاں نام حضرت معاذ بن جبلؓ کا بھی ہے۔ جیسے جیسے دوسرے علاقے فتح ہوتے گئے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تعلیم کے لیے لوگوں کو بھیجتے رہے۔ عمرو بن حزمؓ کو سترہ سال کی عمر میں یمن بھیجا تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ لِیُفَقِّهُمْ فِی الدِّیْنِ وَ یُعَلِّمُهُم الْقُرْآنَ، تاکہ ان کو دین کی سمجھ سکھائیں اور قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو فتح مکہ کے بعد کچھ دن کے لیے مکہ میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر کو ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ تعلیم قرآن کے گشتی معلّمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بھی مقرر فرمائے اور مدینہ میں بھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو تعلیم قرآن کے لیے عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں میں بھیجا گیا تھا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مدینہ منورہ کی مسجدوں اور تعلیمی مراکز میں جو صحابہ تعلیم دیا کرتے تھے ان میں زید بن ثابت، ابیّ بن کعب، حضرت ابو درداء، اسید بن حضیر، خالد بن سعید بن العاص، حضرت ابو عبیدہ، عمرو بن حزم اور معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کے نام بڑے نمایاں ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن سعید بن العاصؓ جو ایک مہاجر صحابی تھے مسجد نبوی میں کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وَكَانَ كَاتِبًا مُحْسِنًا، وہ بہت اچھے کاتب تھے۔ وہ بچوں کو کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بھی خوش نویسی کے استاد تھے اور خوش نویسی سکھایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے فن اور تجربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کے لیے یہودیوں کے مدارس میں بھیجا۔ منجنیق میں مہارت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام کو یمن بھیجا۔ مدینہ منورہ میں دار القراء کے نام سے ایک بڑا مکان تھا جہاں بڑی تعداد میں قرآن پاک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ وہاں بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ ٹھہرا کرتے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں ملتا ہے کہ جب مدینہ آئے تو اس مکان میں ٹھہرے جس کو بعد میں دار القرا کہا گیا۔ حضرت عبد اللہ بن ام مکتومؓ بھی اس مکان میں ٹھہرے۔

قرآن پاک، دین اور فقہ کے ساتھ ساتھ جن دوسری چیزوں کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی فہرست التراتیب الاداریہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ چیزیں شامل ہیں، فلکیات، تیر اندازی، تیراکی، عربی زبان و ادب، طب، قیافہ، طریقہ حرب، تجارت، ترجمہ اور مختلف زبانیں۔

مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مفتی اور قاضی بھی مقرر فرمائے تھے۔ اس زمانے میں مفتی اور قاضی کا منصب ایک ہی ہوتا تھا۔ خلفائے اربعہ عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، ابیؓ بن کعب، معاذ بن جبل اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم اجمعین مدینہ منورہ کے مفتی اور قاضی بھی تھے۔ ان میں حضرت ابو ہریرہؓ، ابو درداءؓ، حذیفہ بن الیمانؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور سلمان فارسیؓ کے اسمائے گرامی بھی نمایاں ہیں۔

دستاویزات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں کہ حضور نے دستاویزات کا شعبہ قائم فرمایا تھا، صحابہ کرام کو اس پر مقرر کیا۔ یہ سب حضرات بلا معاوضہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن الارقم الزہریؓ حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے اور تنخواہ نہیں لی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے پورے کام کا اندازہ لگا کر ایک تخمینہ لگایا اور ان کو تیس ہزار درہم تنخواہ بقایا جات سمیت دینی چاہی لیکن انھوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ: اِنَّمَا عَمِلْتُ لِلّٰہِ اِنَّمَا اَجْرِیَ عَلَی اللّٰہِ، میں نے تو یہ سب کام اللہ کے لیے کیے ہیں اور اللہ ہی سے اس کا اجر لوں گا۔

مدینہ کی ریاست میں ایک شعبہ اور بھی تھا جس کو آپ شعبہ مراسلات اور وثائق بھی کہہ سکتے ہیں۔ شعبہ مراسلات اور وثائق کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خط کتابت اور دوسرے سرداروں اور حکمرانوں سے مراسلت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس شعبہ میں سب سے نمایاں خدمات حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابتؓ انجام دیا کرتے تھے۔

اس شعبہ میں عربی کے علاوہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی دستاویزات تیار کی جاتی تھیں۔ عبرانی زبان اُن یہودیوں میں مروج تھی جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، جبکہ خیبر کے یہودیوں میں سریانی زبان مروج تھی، کیونکہ ممکن ہے کہ اُن کی علمی زبان سریانی تھی۔

وہاں سے جو تحریر آتی تھی وہ سریانی میں آتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب عربی زبان میں جاتا تھا۔ جب ان کا خط آتا تھا تو پڑھنے کے لیے کسی یہودی کو بلاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ سے فرمایا کہ مجھے یہودیوں پر بھروسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ترجمہ کرکے بتا دیں۔ اس لیے تم جاکر سریانی سیکھ لو۔ وہ یہودیوں کے ایک مدراس میں گئے جو یہود کے مدرسہ کو کہتے ہیں۔ انھوں نے سترہ دنوں میں سریانی زبان سیکھ لی اور واپس آگئے۔ وہ سریانی کے علاوہ بھی کئی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کیا کرتے تھے۔ دستاویزات کا ریکارڈ بھی رکھا کرتے تھے۔

یہ بات بہت سے سیرت نگاروں نے نقل کی ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی تھی۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عرب کے یہودی خط وکتاب تو عربی ہی میں کرتے ہوں گے۔ لیکن ان کا رسم الخط عبرانی یا سریانی ہو گا۔ شاید اسی لیے حضرت زید بن ثابتؓ نے سترہ دنوں میں یہ زبان سیکھ لی ہو گی۔ بہر حال عام انداز کی مراسلت حضرت زید بن ثابتؓ کے ذمہ تھی۔ جب کوئی اہم معاہدہ ہوتا تھا تو عموماً سیدنا علی بن ابی طالبؓ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ سمیت کئی معاہدے سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

وزارت خارجہ، کے ماتحت ایک شعبہ مہمانداری بھی تھا۔ اس کے سربراہ کچھ زمانے تک حضرت بلالؓ رہے۔ پھر ایک صحابی معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی، جو حضرت ابو ہریرہ کے قبیلہ کے تھے، اس شعبہ کے نگران ہوئے۔ ان کو آپ افسر مہمانداری یا کہہ لیں کہ چیف آف پروٹوکول تھے۔ دار الکبریٰ کے نام سے ایک بڑا مکان تھا۔ یہ مکان حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے مدینہ میں اپنی تجارت چل پڑنے کے بعد بنایا تھا۔ انھوں نے حضور کے کہنے پر یہ مکان خالی کرکے شعبہ مہمانداری کو دے دیا۔ یہاں باہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جب تعمیر ہو رہا تھا تو کئی مرتبہ حضور اس کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس مکان میں کھجوروں کے کئی درخت بھی تھے اور حضور کے مہمان اس مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

ایک اور مکان تھا جو ایک خاتون رملہ بنت حارث کا تھا۔ انھوں نے بھی ایک بہت بڑا مکان بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ باہر سے آنے والا کوئی وفد یا کسی قبیلہ کا سفیر اس مکان میں بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب بنو حنیفہ کا وفد آیا تو اس میں اسی آدمی تھے۔ وہ سب کے سب حضرت رملہؓ کے مکان میں ٹھہرے۔ دو وقت کا کھانا انھی کی طرف سے آتا تھا۔ کھانے کی تفصیل بھی موجود ہے کہ ایک وقت کا کھانا دودھ اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرے وقت کا کھانا گوشت اور گھی پر مشتمل ہوتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اس انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ ۹ ہجری میں خالد بن سعید بن العاصؓ چیف آف پروٹوکول تھے۔

ایک مرتبہ چار سو آدمیوں پر مشتمل قبیلہ مزینہ کا وفد آیا۔ وفد کا مقصد پہلے سے موجود معاہدہ کی تجدید اور از سر نو اسلام میں داخل ہونا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروقؓ سے جو وزیر خارجہ تھے، ان کی دیکھ بھال اور مہمان داری کا بندوبست کرنے کے لیے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ بڑے وفد کے لیے زیادہ ذمہ دار شخص سے کہا جائے گا۔ چھوٹے وفد کے لیے کم ذمہ داری والے افسر سے کہا جائے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اپنے وزیر خارجہ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی۔ جب وفد کی روانگی کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق سے فرمایا کہ ان کو جاتے وقت خاصی مقدار میں زاد راہ دے دینا۔

حضرت عمر نے عرض کیا کہ اتنے زیادہ لوگوں کو خاصی مقدار میں زاد راہ میں کہاں سے دے دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہیں سے بھی دے دو۔ یہ تفصیلی روایت موجود ہے۔ حضرت عمر مختلف جگہوں پر گئے اور جائزہ لیا کہ چار سو آدمیوں کو کیا زاد راہ دوں۔ واپس آکر حضور سے شکایت کی کہ اتنے زاد راہ کا انتظام مشکل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رملہ بنت حارث کے جس مکان میں وفد کو ٹھہرایا ہے اس میں بہت کچھ عمدہ کھجوریں لگتی ہیں وہی توڑ کر دے دو۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں سیڑھی لگا کر وہاں گیا تو دیکھا کہ کھجوریں اتنی نہیں تھیں کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے لیے کافی ہوتیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ حضور نے جیسے فرمایا ہے اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدمی کو کھجوریں توڑنے پر لگایا اور ایک دوسرا آدمی ٹوکریاں بھرنے لگا۔ باہر لیجا لیجا کر بنی مزینہ کے لوگوں کو دیتے رہے۔ چار سو آدمیوں کا زاد راہ

مکمل ہو گیا اور درختوں میں کھجوریں جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ میں نے جا کر حضور کو اطلاع کر دی کہ سب کو زادراہ مل گیا۔

رملہ بنت حارث کے مکان کے بارے میں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ بہت بڑی حویلی تھی۔ دار گھر کو نہیں بلکہ حویلی کو کہتے ہیں جس میں کئی گھر ہوں۔ اس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور وفود عرب کو اس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک وقت میں کئی کئی وفود آ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے اس کے علاوہ کبھی کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ کا مکان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ضرورت اگر باقی رہتی تو مسجد نبوی کے صحن میں اور باہر خیمے لگوا کر مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔

شعبہ وزارت کے ساتھ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت دفاع بھی تھی۔ عسکریات کا شعبہ تھا۔ اس بارے میں کچھ لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور چل پڑتا تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین فرصت میں جو کام کیے ان میں ایک مردم شماری کا کام تھا۔ مردم شماری میں تمام بالغ مسلم خواتین اور حضرات کے نام لکھے گئے۔ پھر جب کوئی غزوہ یا دستہ بھیجا جاتا تھا تو شرکا کے نام باقاعدہ لکھے جاتے تھے اور فہرست بنتی تھی۔ اس کا ریکارڈ بنتا تھا۔ ایک نقل مرکز میں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کوئی جگہ ہو گی جہاں پر یہ ریکارڈ رکھا جاتا رہا ہو گا۔ کچھ صحابہ کرام اس کے نگران اور منتظم بھی ہوتے ہوں گے۔ اس دستاویز کی ایک نقل دستہ کے کمانڈر کے پاس ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے گئے تو ۳۰ ہزار صحابہ کرام ساتھ تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار، حنین اور طائف میں ۲۱ ہزار ساتھ تھے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ دس بارہ ہزار افراد کا ہجوم بغیر کسی ترتیب کے ساتھ ہو جاتا ہو۔ یہ سب کام ایک ترتیب کے مطابق ہوتا تھا۔ دستے ہوتے تھے۔ ہر دستے کا الگ کمانڈر ہوتا تھا۔ الگ پرچم اور پاس ورڈ ہوتا تھا۔ فہرست مرتب ہوتی تھی۔ کئی اور مقامات پر بھی ان نقلوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی نے کہا کہ میرا نام فلاں فلاں غزوے میں لکھا جا چکا ہے۔ اکتتب فی غزوۃ کذا و کذا۔ ایک نوجوان نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں اسے پہلے حج کرادوں، جبکہ میں فلاں غزوہ میں لکھا جا چکا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ غزوہ سے چلے جاؤ اور بیوی کو حج کراؤ۔ ان کی تسلی نہیں ہوئی ہو گی۔ بھیس بدل کر دوبارہ حاضر ہوئے اور وہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیوی کو حج کے لیے لے جاؤ۔ تیسری مرتبہ جب اسی طرح کیا تو حضور نے پہلے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر فرمایا کہ پہلے بیوی کو حج کرواؤ اس کے بعد غزوہ کرنا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر غزوہ میں جانے والے شرکا کی ایک فہرست بنتی تھی۔ اس کے مطابق لوگ جاتے تھے اور اس کے مطابق ساری کاروائی ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو طرح کے ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ کچھ ہتھیار تو وہ ہوتے تھے جو ہر فرد کے اپنے ذاتی ہوتے تھے۔ عرب میں قبائلی معاشرہ تھا۔ ہمارے ہاں کے قبائلی معاشرہ میں بھی ہر فرد کا ذاتی اسلحہ الگ ہوتا ہے۔ عرب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس ذاتی اور انفرادی اسلحہ کے علاوہ کچھ بڑا اسلحہ تھا جو ریاست کی ملکیت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں یمن کی طرح جو علاقے زیادہ متمدن اور بڑے تھے وہاں دو بڑے ہتھیار بھی استعمال ہوتے تھے۔ ایک منجنیق اور دوسرا دبابہ کہلاتا تھا۔ میں نے ایک جگہ منجنیق کی تصویر دیکھی ہے اس کو آپ موجودہ دور کے ٹینک یا توپ کا ایک ابتدائی ماڈل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ فوج کے راستہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ اس کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک بہت بڑا وزنی پتھر لے کر قلعوں کی دیواریں توڑنے کے لیے دور سے پھینکا جاتا تھا۔ تاکہ قلعہ بند دشمن کے قلعہ کی دیوار توڑ کر اندر داخل ہوا جائے۔ یہ بہت سادہ سی چیز ہوتی تھی۔ اس میں ایک بڑے پتھر کو رسیوں اور بانسوں کے زور سے بہت قوت کے ساتھ دور تک مارا جاسکتا تھا۔ اس سے قلعہ کی دیوار ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ یہ چیز عرب کے شہروں یعنی مکہ، طائف، مدینہ وغیرہ میں نہیں تھی۔ یمن میں ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابہ کرام کو یمن سے منجنیق چلانے کا طریقہ سیکھنے اور ایک منجنیق خرید کرلانے کے لیے بھیجا۔ وہ اس

کو بنانے اور چلانے کی تربیت بھی حاصل کر کے واپس آئے۔ غیر مسلموں سے بڑے ہتھیاروں کے بنانے کی تربیت حاصل کرنا، ڈاکٹر عبد القدیر خان کی طرح سے ہالینڈ سے سیکھ کر آنا، یہ صحابہ کرام کی سنت ہے۔ صحابہ کرام یمن سے منجنیق بھی لائے، اس کو بنانے اور استعمال کرنے کی تربیت بھی لے کر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طائف کی فتح میں استعمال بھی کیا۔

دوسرا اسلحہ دبابہ تھا۔ آج کل عربی میں ٹینک کو دبابہ کہتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں دبابہ سے مراد ایک ایسی سواری تھی جس کو لکڑی یا لوہے کی چھت کے ذریعے اوپر سے ڈھانپ دیا جاتا تھا اور اس پر کوئی ایسی چیز لگا لیا کرتے تھے جس پر تیر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب قلعہ میں داخلہ کے لیے یا کسی اور طریقے سے دشمن کے قریب جانا ہوتا تھا تو دبابہ سے دشمن پر تیروں کی بارش ہوتی تھی اور دبابہ خود تیر اندازوں سے محفوظ رہتا۔ دبابے میں تین چار سپاہی بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ قلعہ کے قریب جا کر اس کا دروازہ یا دیوار توڑنے کی کوشش کرتے۔ آپ اس دور کے دبابہ کو آج کی بکتر بند گاڑی کا پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل ابن ہشام نے بھی لکھی ہے اور الروض الانف نے بھی لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم فرمایا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض افراد مستقل طور پر بعض قبائل میں اس کام پر مامور تھے کہ وہ اس قبیلہ میں اسلام کے خلاف جو بھی تیاریاں ہو رہی ہوں اس کے بارے میں معلومات سے اسلامی ریاست کو مطلع کیا کریں۔ چنانچہ حضرت عباسؓ کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش مکہ کی تیاریوں سے حضور کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ اس کی درجنوں مثالیں ہیں اور کتاب المغازی میں واقدی نے تقریباً ہر صفحہ پر ایک آدھ بات ایسی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سراغ رسانی کا ایک منظّم اور موثر شعبہ موجود تھا۔

امور خارجہ اور عسکریات کے علاوہ جو سب سے اہم شعبہ تھا وہ صیغہ عدل وقضا تھا۔ اسلام آیا ہی عدل کے لیے ہے۔ اسلام کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو

جائیں۔ اس لیے پہلی چیز جس کی طرف میثاق مدینہ میں بھی بار بار اشارہ موجود ہے اور حضور کے انتظامات میں بھی نظر آتا ہے کہ جو پہلا کام کیا گیا وہ عدل و قضا کا بندوبست تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین عدالت کی تھی۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو بے پناہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو نبی اور سربراہ ریاست کے طور پر دو حیثیتیں تھیں۔ دونوں حیثیتوں میں حضور علیہ السلام کو آخری عدالت اپیل کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل میں الگ الگ قاضی بھی مقرر فرمائے۔ بعض افراد کو معلم اور قاضی دونوں کی ذمہ داریاں دیں۔ چنانچہ مشہور حدیث کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا گیا۔ اس طرح سے مختلف قبائل میں جو قاضی مقرر تھے وہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ confirmation کے لیے بعض صورتوں میں مدینہ منورہ بھیجا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ قاضی کو پتہ نہیں چلا کہ اس معاملہ میں صحیح حکم کیا ہے، یا ان کو تامل ہوا تو انھوں نے توثیق کے لیے اپنا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج دیا۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از خود suo moto کاروائی کیا کرتے تھے اور خود ہدایت دیتے تھے کہ فلاں معاملہ کا فیصلہ اس طرح کرو۔

حضرت عتاب بن اُسید جو مکہ مکرمہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے سامنے قبل از اسلام کے ایک سودی معاملہ سے متعلق دعویٰ کا مقدمہ آیا۔ مدعی کا دعویٰ تھا کہ یہ تو سود کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اس لیے سود کی حرمت کے باوجود بھی مجھے اپنے سابقہ واجبات کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ عتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا اور تفصیل بتا کر حضور سے رہنمائی کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ریفرنیس بھیجے جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عدالتوں کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار ایک قبائلی سردار کا قتل ہو گیا۔ قاتلین نے دیت ادا کی اور اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی گئی کہ دیت ادا کر دی گئی ہے۔ یہ بات خواتین کے لیے شاید خاص دلچسپی کی ہو گی کہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں اس مقتول کی بیوہ کو دیت میں حصہ دیا گیا ہے یا نہیں۔ اس خیال کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے اس علاقہ کے گورنر کے نام ایک نامہ مبارک لکھا کہ فلاں مقتول کی دیت اور ترکہ میں اس کی بیوہ کو اس کا حصہ دلایا جائے اور مجھے اطلاع دی جائے کہ یہ کام ہو گیا یا نہیں۔ اس طرح سے حضور نے ایک موثر اور مرکزیت کا حامل صیغہ عدالت قائم فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور قاضی کے جو فیصلے کیے وہ الگ سے جمع کیے گئے ہیں۔ اقضیۃ الرسول کے نام سے ایک قدیم ترین کتاب ہے جو اسپین کے ایک بزرگ محمد بن الفرج الاندلسی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دربار رسول کے فیصلے کے نام سے ملتا ہے۔

امام ابو بکر بن ابی شیبہ مشہور محدث ہیں۔ امام ابو داؤد اور امام ترمذی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مسند ابن ابی شیبہ ان کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ انھوں نے بھی اقضیۃ الرسول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کئی کتابیں اور بھی اس موضوع پر ملتی ہیں۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے بر صغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے بھی ایک کتاب اسی موضوع پر لکھی تھی۔ پاکستان میں حال ہی میں ہماری یونیورسٹی کے سابق ریٹائرڈ جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان کی رہنمائی اور تعاون سے ایک کتاب دس بارہ جلدوں میں تیار ہو رہی ہے۔ اس کی پہلی جلد چھپی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے تمام فیصلے اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں جمع کیے گئے ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام ن جن لوگوں کو قاضی مقرر فرمایا ان میں سیدنا عمر بن الخطابؓ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی موجودگی میں مدینہ میں مقدمات کے فیصلے حضرت عمر کرتے تھے۔ یمن کے ایک علاقے میں حضرت علی بن ابی طالبؓ اور ایک دوسرے علاقے میں حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا تھا۔

آج Ombudsmann کا ادارہ موجود ہے۔ اومبڈزمین کے ادارہ کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تصور سویڈن سے آیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس ادارہ کا آغاز سویڈن میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور

حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ دیوان مظالم دراصل ایک اعلیٰ سرکاری عدالت تھی جو اعلیٰ سرکاری حکام اور با اثر لوگوں کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف شہریوں کی شکایات سنا کرتی تھی۔ حضور کے زمانے میں اس کا بندوبست بعض علاقوں میں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے اس کو باقاعدہ شکل دی۔ اس کے بعد دنیائے اسلام کے بیشتر مسلم ممالک میں یہ ادارہ قائم رہا۔ اسپین سے اس کو یورپیوں نے سیکھا۔ وہاں سے بعض پادری غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس ادارہ کے بارے میں واقفیت حاصل کر کے گئے۔ انگلستان میں پارلیمنٹری کمیشن اور سویڈن میں اومبڈزمین کے نام سے یہ ادارہ بنایا گیا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔

صیغہ احتساب بھی اسی زمانے میں قائم ہوا تھا جس کو ہمارے صوبہ سرحد میں حسبہ کے نام سے قائم کرنے کی نیم دلانہ کوشش کی گئی۔ جس کو ہمارے اخبار والے حسبہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ حسبہ نہیں ہے بلکہ ح کے زیر سے حسبہ ہے۔ یہ احتساب سے متعلق ایک ایسا نیم عدالتی ادارہ ہے جو اس کام کے لیے قائم کیا جاتا تھا کہ عام معاشرتی اخلاق کا تحفظ کرے اور اسلام کے معاشرتی اخلاق کی بارے میں نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں انجام دے۔ یہ ادارہ بھی حضور نے قائم فرمایا تھا۔

یہ وہ عدالتی ادارے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائے۔ مدینہ منورہ میں جو غیر مسلم رہتے تھے ان سے بھی ریاست کے امور میں کام لیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایسی ذمہ داریاں جو ریاست کے strategic interests سے متعلق ہیں، یا شریعت کی فہم اور تعبیر سے متعلق ہیں وہاں غیر مسلم کو مقرر نہیں کیا جاتا تھا، لیکن جو فنی مہارت کے معاملات ہیں وہاں غیر مسلموں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اہم ترین مواقع پر غیر مسلموں سے کام لیا۔ جب حضرت ابو بکر صدیق کی معیت میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے

تھے اور ہر عرب قبیلہ سو اونٹوں کے لالچ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھا تو حضور کو راستہ بتانے کے لیے جو آدمی رکھا گیا وہ عبد اللہ بن اریقطؓ ایک غیر مسلم تھا۔ اس غیر مسلم پر حضور نے اعتماد کیا اور وہ نہایت قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا۔ اگر وہ سو اونٹوں کی لالچ میں آکر حضور کو گرفتار کرانا چاہتا تو اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب دیکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کو چنا اس نے ایک دوسرے راستے سے حضور کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضور کے دربار کے سفیر رہے۔ جب وہ بطور سفیر پہلی مرتبہ بھیجے گئے تو اس وقت وہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ بات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی فرانسیسی سیرت کی جلد اول میں لکھی ہے۔

اسی طرح سے کئی اور غیر مسلم حضرات سے کام لیا گیا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ غیر مسلموں سے ایسی اطلاع مل جاتی تھی جس کا دینا ان کی نیت میں نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے موقع پر تشریف فرما تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اب تجارتی قافلہ سے نہیں بلکہ قریش کے لشکر سے ہی مقابلہ ہوگا۔ ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ لشکر میں کتنے آدمی ہیں۔ حضور نے دو صحابہ کرام کو اس غرض کے لیے بھیجا کہ دشمن کی تعداد کا پتہ لگائیں۔ وہ کوشش کے باوجود صحیح تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ ایک لڑکا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس کو مشکوک سمجھ کر ساتھ لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ صحابہ نے لڑکے سے قریش کی فوج اور قافلہ کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرام کا خیال تھا کہ یہ لڑکا تجارتی قافلہ میں شریک ہے اور اس کے بارے میں معلومات کو چھپا رہا ہے۔ لڑکا کہنے لگا کہ میں نے قافلہ نہیں دیکھا، البتہ قریش کا لشکر دیکھا ہے۔ صحابہ نے اس پر کچھ سختی کی تو اس نے تسلیم کیا کہ ہاں میں نے قافلہ کو دیکھا ہے اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ سچ بول رہا تھا تو تم اس کو مار رہے تھے جب اس نے جھوٹ بول دیا تو تم نے چھوڑ دیا۔ اس نے قافلہ کو نہیں بلکہ لشکر ہی کو دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے قریش کے لشکر کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میں ان کو دودھ فراہم کرنے گیا تھا۔ پوچھا کہ لشکر میں کتنے آدمی تھے تو اس نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم

نہیں۔ صحابہ کرام نے پھر کہا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا تم نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ بتاؤ کہ کتنے اونٹ ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک دن میں نے دیکھا نو اونٹ ذبح ہوئے تھے اور ایک اور دن دیکھا دس اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں اور واقعی وہ ساڑھے نو سو تھے۔ ان کی تعداد بعینہٖ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہی نکلی۔

یہ شعبہ جو حضور نے معلومات اور سراغ رسانی کا قائم فرمایا اس میں تین ذیلی شعبے تھے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے لا تجسسوا، ایک دوسرے کا تجسّس نہ کرو۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس میں تو جاسوسی سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا جاسوسی کا شعبہ کیسے اسلامی ہو سکتا ہے۔ عربی زبان میں تین الفاظ ہیں۔ ۱: تجسّس، ۲: تحسس، ۳: تعسس۔ تحسس کا مطلب ہے کسی مقصد یا ہدف کی خاطر مثبت چیز کا پتہ لگانا۔ یا بنی اذهبوا فتحسسوا من یوسف، اے بیٹو جاؤ اور یوسف کے بارے میں پتہ چلاؤ۔ ایک تعسس ہوتا ہے جو کسی جرم کو روکنے کی خاطر اور کسی برائی کو وجود میں آنے سے پہلے پیش بندی کے لیے کیا جاتا ہے۔ تجسّس وہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سوچی ہو اور اس برائی کے لیے تجسّس کی جائے۔ یہ تجسّس ہے جس کی ممانعت ہے۔ تعسس اور تحسس کی ممانعت نہیں ہے۔ وہ سنت اور سیرت سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں کی آبادیاں مدینہ کے باہر بھی تھیں۔ جو قبائل اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے بعض مراعات عطا فرمائیں۔ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا کہ من کان علی یهودیته او علی نصرانیته فانه لا یبلیٰ عنها۔ جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم ہے اس کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے نجران کے عیسائیوں کو ایک چارٹر عطا کیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ان کو تمام حقوق اور مراعات دیے جائیں گے۔ ان کے پادریوں اور گرجوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ وہ اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے۔ لیکن وہ اسلامی شریعت کی بالادستی قبول کریں گے۔ مسلمانوں کو ٹیکس دیں گے اور سود کا کاروبار کیا تو یہ

معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ گویا اگر ربا کا کاروبار کروگے تو تمھاری شہریت منسوخ کر دی جائے گی۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروق کو اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربٰو کا کاروبار کر رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ تم لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے یہ معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔

حضور علیہ السلام کے زمانے میں جو علاقائی نظم و نسق قائم ہوا اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تو ان قبائل سرداروں کو آپ نے اپنے نمائندے کے طور پر تسلیم کر لیا۔ بہت کم صورتیں ایسی ہوں گی کہ کسی نئے آدمی کو مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر صورتوں میں اسی آدمی کو مقرر کیا گیا۔ بعض صورتوں میں حضور نے دو چیزوں کی یقین دہانی بھی کرائی۔ انه لا یومر علیکم من لیس منکم، جو شخص تمھارے قبیلے سے نہیں ہے اس کو تم پر امیر مقرر نہیں کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی کرائی کہ تمھارے حکمران تمھارے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ باہر سے حکمرانوں کا مقرر کیا جانا غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ دوسری یہ یقین دہانی فرمائی کہ تمھارے جو اپنے وسائل جنگلات اور پانی وغیرہ کی صورت میں ہیں وہ تمھارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور کوئی ان کو تمھاری رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کر سکے گا۔ یہ بھی غلط فہمی کا ذریعہ بنتا ہے کہ ہمارے وسائل دوسروں کے قبضہ میں چلے جائیں۔ کسی علاقہ کے لوگوں کو یہ بدگمانی یا خیال ہو جائے کہ ہماری دولت فلاں کھا گیا یا فلاں کھا گیا تو اس سے ریاست کی بقا اور وحدت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ بہت درپیش رہتا ہے۔ اگر پہلے دن سے ہی یہ دو باتیں طے ہوتیں کہ تمھارے صوبے پر تمھارے ہی آدمی کو مقرر کیا جائے گا۔ تمھارے وسائل تمھارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور تمھاری ہی اجازت سے استعمال ہوں گے تو شاید پاکستان نہ ٹوٹتا۔ اور نہ آج صوبائی خود مختاری اور غیر خود مختاری کا مسئلہ نہ ہوتا۔

دور نبوی کا نظام مواخات

اسلام کی نظر میں تمام مومن رشتہ اخوت میں جڑے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: "تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں"۔ (الحجرات: ۱۰: ۴۹)۔ اسی رشتے کی بنا پر اسلام تمام اہل ایمان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرے برادرانہ تعلقات قائم کریں اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون بنیں۔ اس مضمون کا خصوصی موضوع وہ نظام مواخات ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جو تین کام کیے ان میں سے ایک ہے یعنی اپنے صحابہ کرامؓ کے درمیان اخوت قائم کیا تھا۔ اس نظام کے ذریعے ان کے مابین وہ مخصوص حقوق و فرائض وجود میں آئے تھے جو عام اہل ایمان کے آپس کے حقوق و فرائض سے بڑھ کر ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

مشہور مورخ اور جغرافیہ دان بلاذری لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے ہی مکے میں مسلمانوں کے درمیان اس بنیاد پر نظام مواخات قائم فرمادیا تھا کہ وہ حق کی پاسداری کے لیے ایک دوسرے کے مدد و معاون بن کر رہیں گے، چنانچہ جن صحابہ کرامؓ کے درمیان مکہ میں مواخات قائم کر دی گئی تھی، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

- ✓ حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ
- ✓ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ
- ✓ حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ
- ✓ حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ
- ✓ حضرت عبید اللہؓ بن حارث اور حضرت بلال حبشیؓ
- ✓ حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص
- ✓ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ
- ✓ حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود حضرت علیؓ کے ساتھ رشتہ مواخات مستحکم فرمایا۔

مکہ سے جن لوگوں نے مدینہ ہجرت کی، انھیں مختلف معاشی، معاشرتی اور صحت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات تو سب لوگ جانتے ہیں کہ مہاجرین اپنے اہل و عیال اور اپنا بیشتر مال و دولت مکے ہی میں چھوڑ کر آگئے تھے۔ یہ لوگ تجارت میں تو مہارت رکھتے تھے جو قریش کا خاص امتیازی وصف تھا، لیکن زراعت اور صنعت کے شعبوں سے یہ حضرات قطعاً نا آشنا تھے، جب کہ مدینے کا معاشی نظام تمام کا تمام زراعت اور صنعت پر ہی قائم تھا۔

تجارت کے لیے چونکہ سرمایہ درکار ہوتا ہے، اس لیے مہاجرین فوری طور پر ایک نئے معاشرے میں اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ مدینے کی نوزائیدہ ریاست بے شمار مسائل سے دوچار تھی جن میں سرفہرست مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا۔ مہاجرین اس علاقے میں نو وارد اور اس معاشرے سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال اور تمام احباب کو مکے میں چھوڑ آئے تھے جن کے ساتھ اب ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مدینے میں شدید قسم کی تنہائی کا شکار تھے اور اپنی سرزمین کی یاد سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نئے شہر کی آب و ہوا بھی ان کے پرانے وطن سے مختلف تھی جس کی وجہ سے کچھ مہاجرین بخاری میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں فوری توجہ کی ضرورت تھی، اور ایسا عارضی حل چاہیے تھا جو میزبانی کی عمومی رسوم ہی تک محدود نہ ہو۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کی مدد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انھوں نے ایثار اور خلوص کی وہ اعلیٰ مثالیں قائم کیں جو کتاب اللہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی مستحق قرار پائیں: اور وہ (انصار) انھیں اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ خود فاقے ہی سے ہوں (الحشر ۹: ۹۵)

انصار مدینہ نے سخاوت اور فیاضی کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے تمام نخلستان اپنے اور اپنے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر لیں گے، کیوں کہ یہ نخلستان آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ان نخلستانوں کا انتظام اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں، لیکن ان کا جو پھل اترے، اس میں اپنے مہاجر بھائیوں کو بھی شریک کر لیا کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے تھے کہ مہاجرین زراعت کے کاموں میں حصہ لیں۔ اس کی دو وجوہ تھیں، ایک وجہ تو یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مہاجرین سے جہاد اور تبلیغ کا کام لینا چاہتے تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مہاجرین زراعت سے مکمل طور پر نابلد تھے جس کا اظہار بھی ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے مدینے کی زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

اسی طرح انصار نے اپنی تمام اضافی اراضی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہمارے مکانات بھی آپ کے لیے حاضر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مہاجر صحابہ کرامؓ کے لیے اس زمین پر کچھ مکانات تعمیر کرائے جو انصار نے پیش کی تھی اور کچھ اس زمین پر جو کسی کی ملکیت نہیں تھی۔

انصار کے اس فیاضانہ برتاؤ نے مہاجرین کے دل موہ لیے۔ وہ انصار کی سخاوت اور فیاضی کا برملا اعتراف کیا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے انصار جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے، وہ بہترین لوگ ہیں۔ اگر ان کے پاس تھوڑا ہے تب بھی وہ مدد کرنے سے نہیں چوکتے اور اگر ان کے پاس زیادہ ہو، تب بھی ایثار میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ انھوں نے ہر ضرورت میں بڑھ چڑھ کر ہماری مدد کی ہے، یہاں تک کہ اپنی خوشیوں میں ہمیں اس حد تک شریک کیا ہے کہ ہمیں لگتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے تمام تر اجر و ثواب کے مستحق وہی قرار پائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: نہیں! بلکہ جب تک تم ان کی تعریف و توصف کرتے رہو گے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو گے، (یعنی تم بھی ثواب کے مستحق گردانے جاؤ گے۔ مہاجرین کے لیے انصار کے تمام تر مالی ایثار اور فیاضی کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں مہاجرین کو قانونی طور پر ایک باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ بالخصوص مہاجرین کا مرتبہ اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ ان کے مسائل کو اس طرح حل کیا جائے کہ وہ خود کو انصار کے اوپر بوجھ محسوس نہ کریں۔ بنابریں مواخات کے نظام کو ایک

قانونی حیثیت دے دی گئی۔ مواخات کو قانونی حیثیت دینے کی تاریخ کے متعلق جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قانون سازی ہجرت کے پہلے برس ہی عمل میں آ گئی تھی۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا یہ قانون مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران میں نافذ کیا گیا یا اس کے بعد۔ ابن عبد البرؒ کے خیال میں ہجرت کے پانچویں مہینے کی کسی تاریخ کو مواخات کے نظام کو قانونی شکل دی گئی، جبکہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد اور جنگ بدر سے پہلے یہ کام ہوا، تاہم وہ بھی کسی خاص تاریخ کا تعین نہیں کرتے۔

روایات میں آتا ہے کہ اس قانون کا باقاعدہ اعلان حضرت انسؓ بن مالک کے گھر پر کیا گیا۔ یہ مواخات انصار اور مہاجرین کے درمیان کرائی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو بھائیوں کی جوڑیاں تشکیل دے دیں، جن میں سے ایک کا تعلق انصار سے اور دوسرے کا مہاجرین سے تھا۔ مواخات ۱۰۹ اشخاص کے مابین کرائی گئی جن میں سے ۵۴ افراد مہاجرین میں سے اور ۵۴ انصار میں سے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ کوئی مہاجر ایسا نہیں بچا تھا جس کا بھائی چارہ کسی انصاری سے قائم نہ کر دیا گیا ہو۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام قدیم مآخذ اس پر متفق ہیں کہ مواخات مہاجرین اور انصار کے درمیان کرائی گئی تھی۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے قیام کے لیے جو قانون بنایا گیا، اس کے نتیجے میں باہم بھائی بننے والے دو اشخاص کو ایک دوسرے کے اوپر خاص حقوق حاصل ہو گئے تھے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ وہ باہم معاونت کیا کریں گے، اور یہ باہمی معاونت کسی خاص معاملے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ زندگی کے تمام مسائل پر محیط تھی۔ خواہ وہ مادی مسائل ہوں یا روحانی۔ ایک دوسرے کی مدد اور دیکھ بھال سے لے کر باہمی محبت اور دوستانہ روابط تک اس تعاون کے دائرے میں شامل تھے، یہاں تک کہ مواخات کے نظام میں یہ امر بھی شامل تھا کہ دو افراد جو آپس میں بھائی قرار دیے گئے ہیں، قطع نظر دیگر رشتہ داروں کے، وہ ایک دوسرے کی وراثت کے بھی حقدار ہوں گے۔ ان تمام حقوق نے مواخات کے رشتے کو اتنا گہرا اور اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ خونی اور نسلی تعلق بھی اس کے آگے ماند پڑ گیا تھا۔

انصار اس بات پر خوش تھے کہ انھیں اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرنے اور ان کے لیے قربانی دینے کا موقع ملا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انصار نے دل کی گہرائیوں سے مواخات کی پاسداری کی اور اس پر عمل درآمد کرنے میں اپنے انتہائی جذبات کا اظہار کیا۔

ان میں سے ایک منفرد اور یگانہ روزگار مثال حضرت سعدؓ بن ربیع (انصاری) اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف (مہاجر) کی ہے۔ حضرت سعدؓ نے پورے جذبہ اخوت کے ساتھ اپنے مواخاتی بھائی عبد الرحمٰن سے کہا: میرے پاس جتنی دولت ہے، میں اسے اپنے اور تمھارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لوں گا۔ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کے ساتھ بھی تم نکاح کرنا چاہو، میں اسے طلاق دینے کے لیے تیار ہوں، تم مقررہ میعاد گزرنے کے بعد اس سے شادی کر لینا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے اسی جذبے کے ساتھ جواب دیا: اللہ تمھارے مال اور تمھاری بیویوں کو تمھارے لیے باعث برکت بنائے، مجھے بازار کا رستہ دکھا دو۔ جب حضرت عبد الرحمٰنؓ بازار سے لوٹے تو ان کے پاس مکھن اور پنیر تھا جو انھوں نے اپنی تجارت میں نفع کے طور پر کمایا تھا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے چہرے پر زرد رنگ کی خوشبو کے آثار دیکھے تو پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ عبد الرحمٰن میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے انصار کی ایک خاتون سے شادی کر لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو ولیمے کا اہتمام کرو، چاہے ایک بکری ہی ذبح کر لو۔

بلاشبہ اس بے مثال اخوت اور باہمی خلوص کی تصویر دیکھ کر انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے جس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کی۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کا شریفانہ اور غیرت مندانہ رویہ اور اپنے مواخاتی بھائی سے فائدہ نہ اٹھانے کا جذبہ بھی اسی قدر قابل تحسین ہے جس قدر ابن ربیعؓ کی فیاضی اور ایثار قابل قدر ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ ایک لائق اور تجربہ کار تاجر تھے اور اپنی نئی اجتماعی زندگی میں اپنا مقام خود پیدا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کی مالی حالت اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ انھوں نے نہ صرف شادی کر لی، بلکہ سونے کی کچھ مقدار بھی اپنی اہلیہ کو مہر کے طور پر ادا کی، اور پھر ایک وقت آیا کہ ان کے کاروبار میں بہت برکت پیدا ہوئی اور ان

کے مال میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ ان کا شمار مسلمانوں کے دولت مند ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ عسرت کے دنوں میں بھی انھوں نے مانگنے سے ہمیشہ اجتناب کیا اور اپنے ہاتھ کو اوپر والا ہاتھ ہی بنائے رکھا جو دینے پر تو آمادہ رہتا ہے، مگر لیتا کبھی نہیں۔

آخر میں حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جو نظام مواخات قائم کیا گیا تھا اور اسے قانونی حیثیت دی گئی تھی وہ ہمیشہ نا قابل تنسیخ رہے گا، البتہ اس نظام میں سے وراثتی حقوق منہا کر کے منسوخ کر دیے گئے تھے۔ ہر زمانے میں مسلمان اس نظام کو اپنے ہاں قائم کر سکتے ہیں۔اس کی بنیاد باہمی تعاون، ہمدردی، اور مشاورت پر ہو گی اور اس کے نتیجے میں چند ایسے مخصوص حقوق ایک دوسرے پر عائد ہوں گے جو عام اخوت اسلامی کے حقوق سے بڑھ کر ہوں گے۔

مسلمانوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کا مکمل مظاہرہ اسی طرح ہو سکتا ہے، جب وہ ضرورت کے وقت ایمان اور اسلام کے رشتے کو ترجیح اور فوقیت دیتے ہوئے اپنے تمام دیگر معاشرتی ، علاقائی اور قومی تعلقات اور تعصّبات کی قربانی دیں۔

مسجد نبویؐ اور اس کا نظام

مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے حوالے سے پچھلے کالم میں یہ تذکرہ ہوا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جو تین کام کیے تھے ان میں سے پہلا کام مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر تھی اس مضمون میں تعمیر مسجد اور بعد میں اس مسجد میں جو نظام رائج تھا اور مسجد نبوی کا ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا تھا، اس پر تبصرہ ہوگا۔

الغرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو آپ قبیلہ بنو عمرہ کے مسکن قباء میں اترے اور یہاں سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی تاکہ صحابہ کرام اس میں جمع ہوں، نمازیں ادا کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشاورت ہوتی رہے۔ قبا اس بستی کا پرانا نام ہے کیونکہ یہاں قبا نام ایک کنواں تھا۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن قیام فرمایا ہے، اس مسجد کا قرآن مجید میں اس طرح تذکرہ ہوا ہے۔

”جو مسجد روز اول سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں، اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں“۔ (سورۃ توبہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد کے قبلے کی جگہ میں پہلا پتھر رکھا، پھر حضرت ابو بکرؓ پھر حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ نے پتھر رکھے۔ پھر انصار اور مہاجرین اس کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور جلد ہی اس کی تعمیر مکمل کرالی۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پتھر اور مٹی اٹھانے میں شریک تھے۔ اس طرح بہت جلد سادہ سی مسجد قبا تیار ہو گئی۔ اس کا فرش پتھروں کا، منبر کھجور کے تنے کا اور چھت کھجور کے پتوں کی تھی اور اکثر حصہ کھلا ہوا تھا۔ مسجد قبا کی فضیلت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصلوۃ فی مسجد قباء کعمرۃ۔ مسجد قبا میں نماز ادا کرنا ایسے ہے جیسے ایک عمرہ کرنا اور فرمایا: من تطھر فی بیتہ ثم اتی مسجد قباء فصلی فیہ صلوۃ کان لہ کاجر عمرۃ۔ ”ایک شخص نے اپنے گھر میں وضو کیا پھر مسجد قبا آکر اس میں نماز پڑھی تو اس کے لیے ایک عمرے کا اجر ہے“۔

مسجد قبا کی بنیاد رکھنے کے بعد آپ مدینہ کے وسط میں تشریف لائے اور موجود روضۃ مبارک کی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کے بیٹھنے پر قیام اختیار کیا اور فوری طور پر مسجد تعمیر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مختصر طور پر اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ کے وسط میں تشریف لائے اور جہاں آپ کی اونٹنی قصوا بیٹھی تھی تو آپ نے وہاں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر شروع کی۔ یہ زمین کا ٹکڑا سہل اور سہیل نامی دو انصاری یتیم بچوں کی ملکیت تھی جو حضرت اسعد بن زرارہ کی پرورش میں تھے جو نقیب محمدی تھے، زہیری نے اعلان المساجد میں لکھا ہے کہ حضرت اسعد اس جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔ اس میں کھجوروں وغیرہ کا کھلیان ہوتا تھا نیز اس میں چند کھجوروں اور غرقد کے درخت اور کچھ مشرکین کی قبریں تھیں اور یہ ناہموار جگہ تھی۔ آپ نے ان سے اس کے سودے کی بات کی تو انھوں نے اس کو ہبہ کرنا چاہا۔ نیز قبیلہ بنو نجار نے قیمت ادا کرنے کی اجازت چاہی، لیکن آپ نے یہ دونوں باتیں منظور نہیں فرمائیں اور سونے کے دس دینار پر اسے خرید لیا، یہ رقم حضرت ابو بکرؓ نے ادا کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے مل کر مسجد کی تعمیر شروع کی اس کی تعمیر میں کچھ پتھر، کچی اینٹیں، اور کھجور کے تنے استعمال کیے، یہ تنے ستونوں کے طور پر کھڑے کیے گئے اور چھت کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے بنائی گئی تھی، جسجد کی تعمیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اینٹ، پتھر خود بھی اٹھا کر لاتے تھے اور اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے: اللھم لاعیش الا عیش الاخرۃ۔ فاغفر الانصار والمھاجر۔ الہٰی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، تو انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔ اور صحابہ بھی اینٹ اور گارا ڈھوتے ہوئے یہ شعر رجز میں پڑھتے تھے:

لان قعدنا والرسول یعمل فالعمل العمل المضل

رسول اللہ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ بڑی ہی گمراہی کا کام ہے۔

مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں اور تین گز بلند تھی۔ ابتدا میں یہ مسجد ستر ہاتھ لمبی اور ساٹھ ہاتھ چوڑی بنائی گئی اور تین دروازے یعنی باب جبریل، باب نساء، اور باب رحمت رکھے گئے جو آج تک اس جگہ پر انھیں ناموں سے مشہور ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو ہر بستی میں، ہر قبیلے اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل میں کوئی بطن ایسا نہیں تھا جس میں کافی تعداد میں خاندان اور افراد مسلمان نہ ہو گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو مسجدیں قائم ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے کا فاصلہ بارہ پندرہ میل ہو اور چوڑائی آٹھ دس میل ہو تو وہاں کے سب رہنے والوں کے لیے مسجد نبوی میں پانچ وقت حاضری ممکن نہیں تھی۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت تھا اور طبیعت مبارک چند لمحوں کے لیے بہتر ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ اٹھا کر مسجد نبوی میں دیکھا تو صحابہ خوش ہوئے۔ عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب صحت مبارک اچھی ہو رہی ہے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر جانے کی اجازت مانگی کیونکہ وہ کئی دن سے گھر نہیں گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ہجرت کے بعد ایک انصاری خاتون خارجہ بنت زید سے شادی کی تھی، ان کا مکان مسجد نبوی سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ قبا کے قریب عوالی نام کی ایک بستی تھی جس میں "سنخ" نامی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں آپ نے جانے کی اجازت مانگی۔ یہ جگہ مسجد نبوی سے ساڑھے تین چار کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اسی طرح سے مختلف صحابہ کرام مختلف جگہوں پر قیام پذیر تھے اور ہر جگہ ایک نہ ایک مسجد موجود تھی۔ ان نو مسجدوں کی تعداد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ سالہ مدنی زندگی میں غزوہ بدر کے بعد سے لے کر دنیا سے تشریف لے جانے تک اضافہ ہوتا رہا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں چالیس مساجد قائم ہو چکی تھیں، جن کا تذکرہ مورخین اور سیرت نگاروں نے کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرح مسجد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فرمودات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی عملی سیرت سے مسجد کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ حضرات مسجد کی ضرورت اور اس کے پیغام و مقام سے خوب واقف تھے۔ لہٰذا انھوں نے مسجد کے بارے وہی طریقہ اور وطیرہ

اختیار کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس لیے ان کی زندگیوں میں مسجد کے بارے کچھ باتیں مشترکہ پائی جاتیں ہیں۔ تمام صحابہ کی مسجد سے گہری وابستگی تھی، مسجد تعمیر کرنا، آباد کرنا، مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا، مسجد سے متعلق کاموں کا انجام دینا اور ہر طرح سے اس کا حق ادا کرنا ان کا شیوہ تھا۔

صحابہؓ نے مساجد کی تعمیر میں خصوصی حصہ لیا۔ چنانچہ اپنی حویلیوں (ایک خاندان کے گھروں کا مجموعہ) محلوں اور باغات میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس طرح وہ صحابہ جو حکومتی ذمہ داریوں اور کلیدی عہدوں پر تھے انھوں نے خاص طور دار الحکومت کے ساتھ مساجد تعمیر کرائیں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی درجنوں مسجدیں مدینہ منورہ میں تعمیر ہو چکی تھیں۔ یہ تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ے بعد کئی گنا بڑھ گئی۔

آج بھی صحابہ کرام کے نام سے سینکروں وہ مساجد موجود ہیں جن کی بنیاد انھوں نے رکھی تھی۔ یہ مساجد ہر اس خطے میں پائی جاتی ہے جہاں ان کے بابرکت قدم پڑتے تھے اور صحابہ کے نام سے تو لاکھوں مسجدیں دنیا میں قائم و دائم ہیں۔ یہ مسجد کی تعمیر میں ان کی دلچسپی و شغف کا مظہر ہے۔

جب مسلمان مجاہدین جہاد کے لیے جاتے تو جہاں چھاؤنی بناتے وہاں پہلے مسجد بناتے بعض اوقات عارضی قیام ہوتا تو سرکنڈوں کی مسجد بنالیتے اور وہاں سے کوچ کرتے تو اسے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ جہاں انھوں نے مستقل آبادیاں قائم کیں وہاں انھوں نے سب سے پہلے بستی کے مرکز میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ سب کچھ قرآن و حدیث کی تعلیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کا نمونہ تھا کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کا مرکز مسجد بن گئی۔ چنانچہ امیر المومنین عمر بن خطابؓ کے زمانے میں جب عتبہ بن غزوان نے بصرہ فتح کیا تو سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کے پاس ہی دار الامارۃ بنایا اور اس کے ارد گرد پلاننگ کر کے ہر قبیلے کو علیحدہ پلاٹ دیے اور ہر ایک کے محلے میں مسجد اور قبرستان کی جگہ متعین کی۔

سعد بن ابی وقاصؓ نے ۱۷ھ میں کوفہ فتح کیا تو سب سے پہلے جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کے آگے سنگ مرمر کے ستونوں پر سایہ کے لیے ایک چھتری بنائی۔ یہ مسجد شہر کے وسط میں تھی۔ اس مسجد میں چالیس ہزار افراد کے نماز ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ اس سے دو سو ہاتھ دور دار الامارۃ بنایا۔ پھر ان کے چاروں طرف مکانات اور گھر تعمیر کرائے۔ مسجد اور دار الامارۃ سے ہر طرف راستے نکلتے تھے، دار الامارۃ اور مسجد عام طور پر برابر برابر تعمیر ہوتے تھے جیسا کہ الفسطاط، دمشق، بصرہ اور قاہرہ وغیرہ میں ہوا۔ نیز خلیفہ عبد الملک نے مسجد کو محل کے سامنے تعمیر کروایا۔ اس لیے کہ مسلمان حکمران مساجد کی تعمیر کو اپنی دینی اور سماجی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس لیے بھی کہ ابتدا میں امام مسجد اور ملک کا حاکم ایک ہی ہوتا تھا۔ اس طرح ابو عبیدہ بن جراح نے جامع مسجد دمشق اور دار الامارہ کی بنیاد رکھتے وقت کیا تھا۔

بالکل یہی طریقہ عمرو بن عاصؓ نے دریائے نیل کے کنارے فسطاط میں بڑی مسجد کی بنیاد رکھتے وقت اختیار کیا۔ عقبہ بن نافع (م ۸۵ھ) نے قیروان کی تعمیر کے وقت مسجد اور دار الامارۃ سے ابتدا کی اور ان کے ارد گرد لوگوں کی رہائش کے خطے متعین کیے تاکہ یہ شہر کا مرکز رہیں۔

سب سے پہلے مسجد نبوی کو لیتے ہیں جو ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے کثیر المقاصد مرکز کی حیثیت رکھتی تھی اور عام معاشرتی زندگی کے کام سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اسلام کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے باعث امت مسلمہ کا سیاسی و مذہبی مرکز بھی تھی۔ لہٰذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کا مرکز مسجد کو بنایا۔ ازواج مطہرات کے حجرے مسجد کے بالکل متصل تعمیر کرائے اور ان میں بعض حجروں کے دروازے مسجد میں رکھے تاکہ مسجد سے براہ راست تعلق رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست مسجد میں ہوتی تھی اور وفود مسجد میں ٹھہرتے اور ملاقات کرتے، ذکر و تعلیم کے حلقے مسجد میں قائم ہوتے، وعظ و نصیحت مسجد میں ہوتی، جہادی زخمیوں کو مسجد میں ٹھہرایا جاتا اور ان کی مرہم پٹی مسجد میں کی جاتی، اصحابہ صفہ کا ٹھکانا یعنی مدرسہ صفہ مسجد کے ایک کونے میں تھا۔ اموال غنیمت اور صدقات واجبہ و نافلہ مسجد میں جمع کیے جاتے اور یہیں

سے تقسیم کیے جاتے، صحابہ کی مجلسیں مسجد میں ہوتیں، اسلام کی حمایت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اشعار مسجد کے منبر سے پڑھے جاتے، بنو ثقیف کے نمائندوں کے خیمے مسجد میں لگائے گئے، احد کی جنگ کے بعد آنے والی رات سرداروں نے مسجد میں بسر کی۔ جہاد کی تیاری کے لیے اجتماع مسجد میں ہوتا، فقرا اور مساکین کے لیے چندہ مسجد میں کیا جاتا، بعض جہادی مظاہرے اور کھیل مسجد کے صحن میں کھیلے گئے، مسجد میں تحائف وصول کیے جاتے اور تقسیم کیے جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپسی پر مسجد میں حاضر ہو کر دو رکعت نفل پڑھتے پھر گھر تشریف لے جاتے۔ قیدیوں کو مسجد کے ستون سے باندھا گیا اور فیصلے مسجد میں کیے جاتے۔ الغرض مسجد نبوی، دار الندوہ (اجتماعی مشورہ کا مرکز)، دار الامارہ (حکومتی مرکز)، دار التعلیم، دار الکفالہ، دار الافتاء والقضاء، دار العبادۃ والاصلاح سب ہی کچھ تھا۔

غالباً مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ وہ تھا جس میں عبادات و تعلیم وغیرہ ہوتی تھی اور دوسرا حصہ وہ تھا جس جہادی مظاہروں، اونٹ باندھنے، مہمانوں کو ٹھہرانے اور خیمے وغیرہ نصب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کوئی اہم مالی معاملہ پیش آتا اور نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے بعد اور اگر نماز کا وقت نہ ہوتا تو الصلوۃ جامعۃ کا اعلان کرکے لوگوں کو جمع فرماتے اور وہ معاملہ ان کے سامنے رکھتے۔

حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ ایک دوپہر کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ کچھ لوگ آئے جو تقریباً ننگے بدن، کمبل یا عبا لپیٹے ہوئے اور گلے میں تلواریں لٹکائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مضر قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے فقر و فاقہ کی حالت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گی، آپ گھر میں تشریف لے گئے پھر باہر نکلے اور حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ بلالؓ نے اذان دی پھر اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر شخص اپنے دینار و درہم، کپڑے، گندم، اور جو کی مقدار میں سے صدقہ و خیرات کرے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ (خیرات کرو) چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ راوی کہتا ہے کہ انصار کا ایک آدمی تھیلا لایا جس کے وزن سے اس کے ہاتھ تھک گئے تھے پھر لوگ پے درپے آنے لگے یہاں تک کہ میں نے کھانے کی چیزوں اور کپڑے کے ڈھیر دیکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ ایسے چمکتا ہوا دیکھا جیسے سونا ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ نکالا اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان لوگوں کا ثواب بھی ہے جنھوں نے اس پر عمل کیا۔ لیکن ان لوگوں کے اجر میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا اور جس شخص نے اسلام میں بُری مثال قائم کی اور بری بنیاد ڈالی تو اس پر اس کا گناہ ہے اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے گناہ بھی اسے ملیں گے اور ان لوگوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے سینکروں واقعات ہیں کہ آپ نے اجتماعی مالی معاملات مسجد میں طے کیے۔

مسجد کو ابتدا ہی سے مالی معاملات کے مختلف پہلوؤں کے لیے استعمال کیا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مساکین کی امداد کے لیے چندے کا اعلان مسجد میں فرماتے اور اس اپیل پر جو مال و اسباب جمع ہوتا اسے مسجد میں ڈھیر کرتے اور پھر تقسیم فرماتے۔ زکوٰۃ کا مال مسجد میں جمع ہوتا اور مسجد ہی سے تقسیم ہوتا۔ صدقہ فطر مسجد میں جمع ہوتا اور وہیں سے تقسیم ہوتا تھا۔

جہاد اور حج و عمرے کا اعلان مسجد میں ہوتا اور جہاد کے لیے سامان مسجد میں جمع ہوتا اور مجاہدین کو دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات مال غنیمت، انفال اور فدیے کا مال بھی مسجد میں لایا جاتا اور یہیں حق داروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اگر مال ایک دن میں تقسیم نہ ہوتا تو آپؐ اس رات گھر تشریف نہیں لے جاتے تھے بلکہ مسجد میں ہی قیام فرماتے تھے۔ آپ کی اسی سنت کو پیروی کرتے ہوئے صحابہ کرام نے بھی اجتماعی مالی معاملات کو مسجد میں طے کیا۔ کئی علاقوں میں بیت المال مسجد کے ایک حصے میں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسامہ بن زید نے ۹۷ تا ۹۹ میں مسجد عمرو کے سامنے ایک قبہ تعمیر کرایا جس میں ایک قبہ کا نام ہی قبۃ الخزانہ تھا۔

مسجد کا تعلیم وتدریس کے لیے استعمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مدنی دور سے شروع ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو مسجد میں صفہ نام کا مدرسہ قائم کیا جس میں طلبہ کی تعداد ستر سے لے کر پانچ سو تک ہوتی تھی۔ جن کے طعام و قیام کا بندوبست مسجد میں ہوتا تھا اور درس وتدریس مسجد میں ہوتا تھا، قرآن مجید میں اور حدیث شریف اور روزہ کے مسائل کی تعلیم ذکر و ارشاد سب کچھ مسجد میں ہوتا تھا۔ اصحاب صفہ تعلیم حاصل کرتے رہتے اور جب کہیں تبلیغ کے لیے مبلغین بھیجنے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ہی ضرورت کے افراد بھیج دیتے تھے۔ نیز مدینے اور ارد گرد کے صحابہؓ وقتاً فوقتاً مسجد میں قیام کرتے اور دین کی تعلیم پاتے تھے۔ لہٰذا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم طالب علموں کی قیام گاہ بھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مختلف علاقوں میں جو قراء بھیجے تھے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ جمعہ کے دن مسجد میں لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ مساجد میں ابتدا قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی پھر حدیث کی تعلیم دی جانے لگی۔ بعد میں دیگر علوم مثلاً فقہ، صرف و نحو منطق وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی اور بعض فنون کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔

اسلام جس سیاست کا علمبردار ہے۔ اس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت، طاغوت سے برات اور مخلوق کی کفالت پر ہے۔ اس کی فکری اور نظریاتی بنیادیں قرآن مجید فراہم کرتا ہے اور اس کی عملی تشکیل سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سنت سے ہوتی ہے اور مسجد سے اس کی ابتدا و تاسیس ہوتی ہے۔ اسلام زندگی کو ایک کل اور اس کے تمام مسائل کو باہمی مربوط منظّم دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی نظر میں مسجد صرف ایک عبادت خانہ ہی نہیں اکیڈمی (تعلیم گاہ) اور پارلیمنٹ و مجلس شوریٰ بھی ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ کا اجلاس وہیں ہوتا ہے، وہاں مجاہدین اسلام جنگی مشقیں کر رہے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس معائنہ فرما رہے ہیں۔

مسجد کی حیثیت، اہمیت اور اجتماعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ہم مسجد نبوی کو اپنے لیے مثال اور نمونہ بنا کر پیروی کریں تو ایک طرف مسجد کا حق ادا ہو سکتا ہے تو دوسری طرف

ہماری اجتماعی و معاشرتی زندگی میں جو خامیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور ہو سکتی ہیں اور معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی بن سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی طرح ہر مسلمان کا مسجد سے گہرا تعلق ہونا چاہیے۔ یہ تعلق اتنا مضبوط ہو کہ وہ نہ صرف پنج وقتہ فرض نماز مسجد میں جا کر ادا کرے، بلکہ اکثر اوقات سنت اور نوافل مسجد میں پڑھے نماز سے کچھ وقت پہلے جا کر مسجد میں بیٹھے، تلاوت قرآن مجید اور ذکر کرے، مسنون اوراد وظائف پڑھے، حدیث میں آیا ہے کہ انتظار الصلوۃ من الصلوۃ۔ نماز کا انتظار کرنا نماز میں سے ہے۔ یعنی جب تک آدمی نماز کے انتظار میں رہے، ثواب ملتا رہتا ہے، مومن کا مسجد سے صرف نماز کا تعلق نہ ہو بلکہ اپنے لیے دنیا میں بہترین جگہ مسجد ہی کو سمجھے اور اس سے دلی لگاؤ رکھے۔ اگر مسجد میں اعتکاف کی حیثیت سے بیٹھے تو اسے اعتکاف کا ثواب ملے گا۔ شریعت نے مسجد کے تعلق کی اس لیے تاکید کی ہے کہ بندہ جب تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہے بہت سی برائیوں اور گناہوں سے بچ جاتا اور نیکیاں حاصل کرتا ہے۔

مسلمانوں کا پہلے دن ہی سے مسجد کے ساتھ روحانیت و عبادت کا تعلق رہا ہے۔ مسجد میں باجماعت اور انفرادی نماز پڑھنے، تلاوت کرنے، نوافل پڑھنے، ذکر و اذکار کرنے، اعتکاف میں بیٹھنے کو مسلمانوں نے اپنا معمول بنائے رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو مسجد عبادات کا مرکز تھی ہی البتہ بعد کے ادوار میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلفائے راشدین مسجد میں ہی بیٹھتے اور عبادت کرتے تھے اور ان کے چیدہ چیدہ ماتحت حکمران مسجد میں پنج وقتہ نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے اس لیے کہ عام مسلمان اپنی عبادات مسجد میں ادا کرتے تھے۔ سفر سے لوٹنے پر نوافل ادا کرنے کے لیے بھی لوگ مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ مصر میں بعض راتوں کو مسجدوں میں بہت رونق ہوتی تھی۔ لوگ اجتماعی کھانا کھاتے اور پوری رات مسجد میں قیام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ جزوی طور پر آج بھی جاری ہے کہ بعض جگہ رمضان میں روزانہ اور بطور خاص جمعرات کو مساجد میں کھانا جمع ہوتا ہے جو مستحق مسافروں اور روزہ داروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ بعض لوگ شادی یا خوشی کے دوسرے موقع پر اور بعض اوقات مصیبت اور

تکالیف کے مواقع پر مسجد کے لیے صدقہ و خیرات دیتے ہیں۔ آفات و مصائب میں مسجد میں جمع ہو کر دعا مانگتے ہیں۔ بعض لوگ خوشبو اور تیل یا دوسری اشیا بطور ہدیہ بھیجتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلمانوں کا مسجد سے لگاؤ کی علامت ہے۔ لیکن مسجد کو آباد کرنے والے عوامل میں سے یہ صرف ایک عامل ہے۔ مسجد سے تعلق کی ایک صورت یہ ہے کہ مسجد کی خدمت کریں، مسجد کے خادموں کا کام کاج میں ہاتھ بٹائیں۔ صفائی و انتظام میں ان کی مدد کریں، لوگوں کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بتائیں۔ مسجد میں درس قرآن کا اہتمام کرے، کوئی دینی کتاب پڑھ کر سنائیں۔ یا خود دین کا علم حاصل کریں۔ یہ سب کام سنت کے مطابق ہیں۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ جس محلّہ یا بستی میں مسجد نہیں ہے، وہاں دوسرے بھائیوں سے مل کر مسجد تعمیر کرے اور جہاں مسجد ہے اسے اچھی حالت میں رکھے اور آباد کرنے کی کوشش کرے۔ اپنی حلال آمدنی میں سے کچھ حصہ مسجد کے لیے مختص کرے۔

اور مسجد میں وہی کام اور نظام چلانے کی حتی الوسع کوشش کریں جس طرح مسجد نبوی میں ہوا کرتا تھا۔ تو یقیناً مسجد ہمارے معاشرے کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے جو کہ ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں نے ایک عرصہ تک مسجد کو اپنا روحانی عباداتی، تعلیمی، تدریسی، تربیتی، سماجی، فلاحی، سیاسی اور اجتماعی مرکز بنائے رکھا۔ جب تک مسجد کی یہ حیثیت برقرار رہی مسلمانوں میں اجتماعیت، مساوات، یک جہتی، محبت، اخوت، یگانگت اور سیاسی و معاشرتی اتحاد قائم رہا۔ لیکن جب مسلمانوں نے مسجد کی اس حیثیت کو پس پشت ڈال دیا تو ان میں طرح طرح کے فتنے پھیل گئے اور وہ تفرقے میں پڑ گئے۔ تاریخ اسلام صاف صاف بتاتی ہے کہ قرن اول اور بعد کے ادوار میں کچھ عرصہ تک مسلمانوں نے مسجد کے حقیقی مقام اور کام کو ملحوظ رکھا اور اسے اپنا اجتماعی مرکز بنایا۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کو جو حیثیت دی ہے اس کے عین مطابق انھوں نے جب تک اس کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھا، تو معاشرہ مستحکم اور مستقیم رہا۔ لیکن افسوس جب یہ تعلق کمزور ہوا تو اجتماعی زندگی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔

اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ربیع الاول سوموار کے دن امام الانبیار حمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں حضرت آمنہ کے ہاں پیدا ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب نے اپنے یتیم پوتے کا نام محمد رکھا۔ سید نا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو ولادت کے ساتویں دن آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ کا عقیقہ کیا اور آپ کا نام نامی "محمد" رکھا۔ اور آپ کی والدہ محترمہ نے خواب میں بشارت پا کر اپنے نو مولود کا نام احمد رکھا، اور اسی نام سے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت سید نا عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کی آمد کی خوشخبری دی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت و رسالت کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی آپ علیہ السلام کی آمد کی بشارت بھی دی قرآن میں ہے۔

"اور جب ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل بے شک میں اللہ کا تمھاری طرف رسول ہوں، تورات جو مجھ سے پہلے نازل ہوئی اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہو گا"۔

آپ کے دوسرے نام "محمد" کا ذکر بھی قرآن مقدس میں متعدد مقامات پر ہوا ہے، سورہ الفتح میں ارشاد ہے۔

محمد رسول اللہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

سورت احزاب میں آپ کا اسم مبارک یوں آیا ہے۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔

ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

وما محمد الا رسول "اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کے رسول ہی ہیں۔

ایک اور آیت میں اس طرح فرمایا:

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور وہ اس چیز پر ایمان لائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ عرب میں "محمد" نام رکھنے کا رواج نہیں تھا مورخین نے لکھا ہے کہ محمد نام عرب کے خطے اور کسی علاقے میں نہیں سنا گیا چنانچہ قریش نے عبد المطلب سے کہا "اے ابو الحارث! کیا وجہ ہے کہ تم نے اس بچے کا نام اس کے باپ دادا کے نام پر نہیں رکھا بلکہ محمد رکھا؟ حالانکہ یہ نام نہ تمھارے باپ دادا میں کسی کا ہے اور نہ تمھاری قوم میں سے کسی کا ہے حضرت عبد المطلب نے جواب دیا۔ اس سے میری تمنا یہ ہے کہ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ اس بچے کی تعریف فرمائیں اور زمین میں لوگ اس کی تعریف کریں۔ اس بات کو تسلیم کر کے دیکھا جائے اور غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتفاقی طور پر اس نام کا عبد المطلب کے ذہن میں آنا منشائے خداوندی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام الہامی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے ذہن میں یہ نام القا کیا تھا۔ پھر صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی الہامی نہیں تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا نام بھی الہامی تھا عبد اللہ، اللہ کا بندہ کتنا خوبصورت اور پسندیدہ نام ہے اور یہ نام اس زمانے میں رکھا گیا جب لوگ اپنے بچوں کا نام عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد الکعبہ، عبد الدار (آستانے کا غلام) عبد شمس، (سورج کا پجاری) حرب (لڑائی) حزن (غم) لہب (شعلہ) رکھا کرتے تھے۔ اس شرکیہ دور اور زمانہ جہالت میں عبد اللہ نام رکھنا الہامی معلوم ہوتا ہے پھر رحمت کائنات امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ رب العزت کو سب ناموں میں سے پیارے نام وہ ہیں جن کی نسبت اللہ کی طرف ہو۔ پھر آپ نے بطور مثال دو ناموں کا ذکر فرمایا۔ عبد اللہ اور عبد الرحمٰن۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا نام بھی الہامی معلوم ہوتا ہے آمنہ امن دینے والی، امانت والی، یہ اس دور میں نام رکھا گیا جب لوگ عورتوں کے نام عاصیہ (نافرمان) خنسا اور ہندہ رکھتے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عبد المطلب نے اپنے پوتے کا نام "محمد" اس لیے رکھا "رجاء ان یحمد" آثار نیک دیکھ کر اور امید باندھ کر یہ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولود سعید مجموعہ محامد بنے، مرجع خلائق بنے، اور شاید اس کی تعریف و توصیف کی جائے۔

یوں تو رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اسمائے گرامی ہیں اور یہ سب نام آپ کے صفاتی نام ہیں۔ ان میں سے ہر نام کی سیرت و کردار کے کسی نہ کسی انوکھے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔بے شک میرے بہت سے نام ہیں، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میرا ایک نام ماحی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹاتا ہے۔ میرا ایک نام حاشر ہے کہ لوگ قیامت کے دن میرے قدم پر اٹھائے جائیں گے۔ میرا ایک نام عاقب بھی ہے اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے بے شمار صفاتی نام ہیں، مگر ذاتی نام صرف ایک یعنی اللہ ہے۔اسی طرح رحمت کائنات کے سینکڑوں نام صفاتی ہیں۔ مگر ذاتی نام صرف دو ہیں، یعنی محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم ، یوں تو آپ نبی بھی ہیں، رسول بھی، مدثر و مزمل بھی، طہٰ اور یاسین بھی، بشیر و نذیر بھی، اور ہادی بھی، عاقب بھی اور حاشر بھی مگر اسم محمد کو آپ کی ذات اقدس سے جو تعلق ہے جو کسی صفاتی نام کو نہیں، محمد وہ نام ہے جو قدرت کی طرف سے روز اول ہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص کر دیا گیا تھا۔

لفظ محمد کا مادہ حمد ہے اور یہ باب تفعیل کا اسم مفعول ہے اور تحمید سے مشتق ہے، اور محمد کا عام اور سادہ سا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ ذات جس کی تعریف کی گئی وہ ذات جس کی مدح و ثنا کی گئی اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، مگر رحمت کائنات، امام الانبیاء، خاتم النبیین، سرور کونین، صاحب معراج صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کے سامنے یہ ترجمہ ہیچ ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے تمام پیغمبر اور رسول قابل تعریف ہیں۔اللہ کے نزدیک موجب تعریف ہیں، تعریف و مدح سرائی تو شہدا اور اولیا کی بھی ہوتی ہے، علمائے کرام کی بھی کی جاتی ہے۔ دنیا کے لائق ترین حکیم اور کامیاب فاتح، عام انسانوں کی نظروں میں قابل ستائش ہیں۔ تعریف تو ایک ہنر مند شخص کی بھی کی جاتی ہے۔ تعریف تو کاتب اور پہلوان کی بھی ہوتی ہے۔ پھر محمد کا یہ معنی کرنا جس کی تعریف کی گئی ہو کچھ سجتا اور جچتا نہیں۔

امام راغب الاصفہانی نے محمد کا معنی کیا ہے اور خوب کیا ہے فرماتے ہیں کہ محمد کے معنی ہیں وہ ذات ہے جس میں تمام خوبیاں اور تمام کمالات جمع اور اکھٹے کر دیے گئے ہوں۔

حضرت آدم علیہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے پیغمبر اور جتنے رسول آئے اور اللہ رب العزت نے ان انبیائے کرام کو مختلف خوبیوں اور کمالات و فضائل سے نوازا، کسی پیغمبر کو کوئی کمال دیا۔ اور کسی پیغمبر کو کوئی خوبی عطا کی، کسی کی لاٹھی سانپ بنتی ہے کسی کا تخت ہوا میں اڑتا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں لوہا موم ہوتا ہے، اور کوئی مردوں کو زندہ کرتا ہے وہ کمالات اور خوبیاں جو اللہ تعالیٰ نے فرداً فرداً پیغمبروں کو عطا کیے تھے، وہ سب کمالات اور ساری خوبیاں اکیلے محمد میں جمع کر دیں گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجموعہ خوبی اور مجموعہ کمال ہیں اور اسی کی طرف شاعر اشارہ کرتا ہے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ولکل نبی فی الانام فضیلۃ

وجملتها مجموعة لمحمد

اور ہر نبی کے لیے مخلوق میں، فضیلت اور برتری ہے، اور وہ فضائل اور خوبیاں ایک محمد میں جمع ہیں۔

صاحب مفردات کے اس خوبصورت اور جامع معنی سے ثابت ہوا کہ محمد کا معنی یہ کرنا کہ جس کی تعریف کی گئی ہو درست نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہوگا کہ محمد وہ ذات ہے جس کی اتنی تعریف، اتنی توصیف، اتنی مدح اور اتنی ستائش کی گئی ہو کہ مخلوقات میں سے کسی کی بھی اتنی تعریف نہ ہوئی ہو۔

محمد وہ ہے جس کی تعریف خود خدا نے کی ہو، جس کی تعریف انبیا نے کی ہو، جس کی تعریف ملائکہ نے کی ہو، جس کی تعریف علما اور صلحا نے کی ہو، جس کی تعریف دوستوں اور دشمنوں نے کی ہو، جس کی تعریف اپنوں اور بیگانوں نے کی ہو، محمد وہ ہے جس کی تعریف پوری دنیا اور پوری کائنات کرے۔

صاحب قاموس نے محمد کا معنی اتنا خوبصورت اور جامع کیا ہے کہ پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے فرماتے ہیں ''محمد کا معنی ہے جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، تعریف کے بعد اور توصیف ہوتی رہے۔''

کون سا وقت تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ اور ذکر نہ ہوا ہو۔ ابھی آدم کی تخلیق نہیں ہوئی۔ ابھی کائنات نہیں سجائی گئی ابھی زمین و آسمان تخلیق نہیں ہوئے کہ خالق کائنات نے انبیائے کرام کی ارواح سے ایک وعدہ لیا ہے۔ تو پھر اس وعدہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتے ہیں۔ ''اے ہمارے پالنہار! تیرے گھر کو تعمیر کرنا ہمارا کام تھا، وہ ہم نے کر دیا، لیکن مولا! گھر ہم نے بنا دیا۔ اس گھر کو آباد کرنے والا محمد تو بھیج دے''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی رسالت اور نبوت کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی امام الانبیا رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشخبری سنائی، فرمایا اور میں ایک رسول کو خوشخبری دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا۔ اور اس کا نام احمد ہو گا۔

غرضیکہ توریت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجود تھا۔ انجیل میں بھی آپ کی علامات کا ذکر تھا۔ زبور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر موجود تھا۔ صحف ابراہیم صحف موسیٰ میں بھی آپ کا ذکر موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ رہے کتب سابقہ میں تو آپ کے اصحاب کا تذکرہ موجود تھا، مثلھم فی التورۃ و مثلھم فی الانجیل اس دنیا میں ہر کسی نے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و ستائش کی اور یہ تعریف و توصیف کا سلسلہ جاری و ساری ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گا اور یہ یہی معنی ہے محمد کا کہ جس کی مدح و ثنا کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ صرف دنیا ہی میں نہیں، بلکہ میدان محشر کی ہولناکی میں بھی میرے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف ہو گی۔

حدیث میں آتا ہے کہ میدان محشر کی ہولناکی سے تمام لوگ گھبرا اٹھیں گے سب لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں ہوں گے، سورج سوا نیزہ کے برابر اور زمین تانبے کی، لوگ پسینے میں شرابور اور پیاس سے مدہوش ہوں گے۔ لوگ سوچیں گے کہ اللہ رب العزت حساب و

کتاب شروع فرماتے تو اس مصیبت سے تو نجات مل جاتی، دوزخ یا جنت یہ تو نصیب کی بات ہے، یہ جس مصیبت اور تکلیف میں ہم گرفتار ہیں یہاں سے تو رہائی ملے۔

لوگو سوچیں گے! کہ کسی شخص کو اللہ کے دربار میں سفارشی بنائیں جو حساب و کتاب کے شروع کرنے کی سفارش کرے! لوگ بھاگے بھاگے حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں آئی گے اور عرض کریں گے! تم ابو البشر ہو اور مسجود ملائکہ ہو، خلقت میدان محشر کی ہولناکی سے تنگ ہے آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ حساب وکتاب شروع کیا جاوے۔

حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے لست لھا لست لھا میری یہ جرات و طاقت نہیں۔ میر پوزیشن نہیں ائتوا الی غیری تم کسی اور کے ہاں جاؤ۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں یہ سفارش کروں، اور اللہ تعالیٰ پوچھیں! آدم، لوگوں کا حساب وکتاب تو بعد میں کریں گے، پہلے تم بتاؤ کہ میں نے تمھیں ایک درخت کے پھل کھانے سے منع کیا تھا، پھر تم نے وہ پھل کیوں کھایا؟ پھر میں اس کا کیا جواب دوں گا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے جواب کے بعد لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے ہاں آئیں گے، اور اپنی درخواست پیش کریں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے لست لھا لست لھا یہ میری پوزیشن نہیں، میری ہمت اور جرات نہیں کہ اللہ کے آگے زبان کھول سکوں! ائتوا الی غیری تم کسی اور کے ہاں جاؤ پریشان حال لوگ ایک ایک پیغمبر کے ہاں جائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں مگر ہر پیغمبر یہی کہے گا کہ لست لھا لست لھا میری یہ ہمت و جرات نہیں۔ میری یہ پوزیشن نہیں، ائتوا الی غیری کسی اور کے ہاں جاؤ، آخر کار پریشان حال مخلوق امام الانبیاء سرور کونین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے گی، اور اپنی پریشانی اور درخواست پیش کرے گی۔ ہر پیغمبر مخلوق کی درخواست کے جواب میں کہے گا لست لھا لست لھا میری یہ پوزیشن نہیں، میری یہ جرات نہیں، مگر ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! مخلوق کی درخواست کے جواب میں فرمائیں گے انا لھا انا لھا ہاں ہاں یہ پوزیشن میری ہے۔ یہ مقام و مرتبہ میرا ہے، اس عظیم منصب کے قابل اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے لائق تو صرف میں ہوں۔

فرمایا، پھر میں مقام محمود پر آؤں گا، اور عرش کے پائے کو پکڑ کر اللہ کی حمد و ثنا کروں گا۔ اللہ کی تعریف توصیف کروں گا، اور ایسی حمد و ثنا کروں گا، جو کسی نے آج تک نہیں کی، اور جو حمد و ثنا میں کروں گا جو الفاظ کہوں گا، اس کا علم آج مجھے نہیں ہے۔ اللہ رب العزت اسی وقت میرے دل میں القا کرے گا۔ سات دن اور سات راتیں اللہ کی حمد و ثنا کروں گا، اور برابر روتا رہوں گا، آنسو بہاتا رہوں گا، سر سجدہ میں آنکھوں سے آنسو رواں، زبان پر حمد و ثنا کے ترانے مگر مخلوق کی درخواست کو پیش کرنے کی ہمت نہیں، اس لیے، کہ ابھی تک وہاں سے شفاعت کی اجازت نہیں ملی اور جب تک شفاعت کی اجازت نہ ہو، کائنات کا آقا اور امام بھی زبان نہیں کھول سکتا۔

"پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اے میرے محبوب! اپنا سر سجدے سے اٹھاؤ، میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں روتے ہو، میرے پیغمبر اتنا طویل سجدہ، میری حمد و ثنا مانگ مجھ سے کیا مانگتا ہے، میرے محبوب تو مانگتا چلا جا میں دیتا چلا جاؤں گا، میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! تو شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی"۔ اب جب اذن شفاعت ملے گا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی درخواست اور مخلوق کی پریشانی اللہ کے حضور پیش کریں گے کہ حساب و کتاب شروع کیا جائے، آپ کی یہ شفاعت جو شفاعت کبریٰ ہے، قبول ہو گی اور حساب و کتاب کا آغاز ہو گا، حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت تمام پیغمبر اور امتیں امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کریں گے۔

الغرض! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میدان محشر میں بھی تمام مخلوق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور مدح سرائی کرے گی، اور یہی معنی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک محمد کا کہ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہوئی اور ہوتی رہے گی، اور آخرت میں بھی ان کی مدح و ثنا ہو گی، واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسم بامسمّٰی ہیں کہ جو معنی آپ کے نام کا بنتا ہے آپ بالکل ویسے ہی ہیں۔

حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضے

ہر سال ربیع الاول کا مہینہ رحمتوں، برکتوں اور روحانی نعمتوں کا تحفہ لے کر آتا ہے اور ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم امت کی زندگی میں نئی روح پھونکنے کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی ہر لمحہ سامنے رکھنا ضروری ہے کہ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق نہ کسی خاص مہینے سے ہے، نہ کسی خاص مقام اور موسم سے۔ یہ تو وہ سدا بہار کیفیت ہے جو ایمان کے پہلے لمحے سے زندگی کے آخری سانس تک مومن کا سرمایۂ اور ایمان کی شرط ہے۔

شعوری طور پر جب ایک شخص کلمہ شہادت پڑھے اور یہ اقرار کرے کہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو اپنا وحدہ لاشریک رب مانتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین اور اللہ کا سچا رسول اور بندہ تسلیم کرتا ہے تو وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک پیمانِ محبت منسلک ہو جاتا ہے، جو اُسے رنگ و نسل، خون اور مقام کی قید سے آزاد امت مسلمہ اور امت محمدیہ کا ایک جزو لانیفک بنا دیتا ہے۔ بلاشبہ اس رشتے کا اصل لطف شعوری تعلق کی صورت میں ہے، لیکن یہ بھی اللہ کا انعام ہے کہ جس شخص نے صرف زبان سے اظہار اور دل سے اقرار کیا ہو، اور اس نے اس رشتے سے وابستہ ہونے کے مطالبات اور شرائط و واجبات پر غور نہ بھی کیا ہو، تب بھی وہ اپنے قائد و رہنما محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دل کی ہر دھڑکن میں محسوس کرتا ہے اور یہ محبت ساری زندگی اس کی رگوں میں خون کی طرح میں گردش کرتی رہتی ہے۔ وہ ایک دیہاتی ہو، شہری ہو، کوہستانی ہو، صحرا نشین ہو، سمندر میں دن رات سفر کرنے والا مچھیرا ہو، ایک طالب علم ہو یا دانش ور، وہ اپنے آپ کو اس رشتے سے اس طرح وابستہ کر دیتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی، حتیٰ کہ جب موت سامنے نظر آ رہی ہو، اس وقت بھی وہ نہیں چاہتا کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محسن صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و شخصیت کو ایک پھانس کے برابر بھی تکلیف پہنچے۔ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ یاد دلاتا ہے کہ جب انھیں شہید کرتے وقت ان کے قاتل نے سوال کیا کہ اگر تمھاری جگہ یہ عمل تمھارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تو تم کیا محسوس کرتے، تو ان کا جواب قیامت تک

کے لیے ہر مسلم و مومن کی طرف سے دیا جانے والا جواب تھا، یعنی میں تو یہ بھی نہیں پسند کروں گا کہ اس ہستی کو ایک پھانس کے برابر بھی تکلیف پہنچے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمھارے اس کام کا محرک کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن لوگوں کو اس بات کی خوشی ہو کہ وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ جب بات کریں تو سچ بولیں، جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس کو (بہ حفاظت) مالک کے حوالے کریں، اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ (مشکوۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہ میں اس کے باپ، اس کے بیٹے اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری، مسلم)

اگر صرف ان دو احادیث پر غور کیا جائے تو آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ان کے حوالے سے ان میں بیش بہا ہدایات موجود ہیں۔

سچ کو اختیار کرنا:

سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے۔ بلا شبہ محبت کے مظاہر ایک فطری عمل ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن اس کے ساتھ محبت کی اصل روح اور تقاضوں کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ محبت کی تعریف اور مفہوم یہ نہیں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پانی سے وضو فرمایا ہو اس کو تبرکاً اپنے چہرے پر مل کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس برکت کے سہارے ربِ کریم ہم پر عنایت فرمادے گا، بلکہ محبت کا تعلق "عمل" سے ہے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی قلبی کیفیت اور وابستگی کو حکمتِ رسالت کے ذریعے تین ایسے اعمال میں بدل دینے کا حکم دیا جو ایک مسلمان کو صحیح معنوں میں مومن بنا سکتے ہیں، چنانچہ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ جب بات کریں تو سچ

(صدق) کو اختیار کریں پھر یہ صدق محض زبان سے سچی بات کہنے تک محدود نہیں ہے، گو اس کی بھی غیر معمولی اہمیت ہے، بلکہ اصل مقصد اور ہدف اپنے معاملات میں صدق کو اختیار کرنا مطلوب ہے۔

امانت، اہلِ امانت کے سپرد کرنا:

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دوسرے عملِ صالح کے ذریعے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لازمی مظہر کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے وہ بھی قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک اہم عمل ہے جس کے بغیر ہم موجودہ اخلاقی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی انتشار سے نہیں نکل سکتے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **ویؤدی امانته اذا ائتمن**، یعنی امانت کو بہ حفاظت مالک کے حوالے کرے۔

قرآن کریم نے امانت کو اہلِ ایمان کی اولین صفات کے طور پر جگہ جگہ بیان کیا ہے۔

اگر ایک ایسے شخص کو جو بذاتِ خود اور جس کا قبیلہ اپنی ماضی کی تاریخ کے لحاظ سے چور، بددیانت اور ڈاکو کے طور پر شہرت رکھتا ہو، ملک کی اعلیٰ ترین ذمہ داری سونپ دی جائے اور پھر کفِ افسوس ملا جائے کہ ملک کے امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہو رہے ہیں، سرکاری خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا ہے، پرائیویٹائزیشن کے نام پر اپنے ہم نوالہ افراد کو کوڑیوں کے مول قومی اثاثے فروخت کیے جا رہے ہیں، سیاسی حلیفوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ہزاروں ایکڑ زمین تقریباً مفت دی جا رہی ہو، تو یہ قصور صرف چور ہی کا نہیں بلکہ چور کو امانت حوالہ کرنے والوں کا بھی ہے۔

اگر ابلاغی سطح پر صحافت اور برقی ابلاغِ عامہ کو ایسے افراد کے حوالے کر دیا جائے جو ذہناً یا تو مغرب کے غلام ہوں یا ہندوانہ ثقافت اور مفادات کی حمایت میں اپنی دانش وری کو استعمال کرنے کے لیے مشہور ہوں تو الزام کسے دیا جائے گا؟ اگر تعلیم گاہ میں ایک ایسے شخص کو استاد بنا دیا جائے جو نہ علم رکھتا ہو نہ کردار، تو جو نسل اس کے زیرِ تربیت پیدا ہو گی کیا اس میں صداقت اور امانت پیدا ہو سکتی ہے؟ اقبال نے صداقت اور امانت کے حوالے ہی سے کہا تھا کہ

ان دو اسلامی اقدار اور احکاماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تک اختیار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک قوموں کی امامت کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پڑوسی کا حق:

تیسری اہم ہدایت جو حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ پڑوسی کے حقوق سے ہے۔پڑوسی سے مراد اتفاقی یا حادثاتی طور ملنے والے لوگ نہیں بلکہ چالیس گھر سیدھے ہاتھ کی طرف اور چالیس گھر بائیں ہاتھ کی طرف پڑوسی شمار کیے جائیں گے۔ ایسے ہی پڑوسی سے مراد وہ شخص بھی ہے جو ہمارا ہم سفر ہو، بس میں، جہاز میں، ٹرین میں، ویگن میں، کہیں بھی، گویا اتنے کم عرصے کے لیے بھی اس کے حقوق کا خیال رکھنا حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا اور مطالبہ ہے۔

حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قرآن کریم نے جو اصول طے کر دیا ہے وہ رسمی اظہارِ محبت سے عبارت نہیں۔ دل، زبان اور اعمال سے محبت کے اظہار کے ساتھ اس سے بھی کہیں بڑھ کر قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ:

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ! لوگوں سے کہہ دو اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے در گزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کہو کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کرو۔ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں"۔ (ال عمران ۱۳: ۳۔ ۲۳)

اتباع سنت

اللہ تعالیٰ نے کامیابی اور فلاح اور اپنی محبوبیت کا راز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں رکھا ہوا ہے جو شخص بھی آپ کے لائے ہوئے طریقوں پر چلے گا اسے فلاح اور محبوبیت کی زندگی نصیب ہوگی اور اسی نورانی اور بابرکت زندگی میں دنیاوآخرت کے مسائل حل ہوں گے اور گویا دنیا کی زندگی جنت کا گہوارہ بنے گی۔ اتباع سنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو کہاں سے کہاں تک پہنچادیا اور زمین سے آسمان تک اور فرش سے عرش تک اٹھا کر نجوم ہدایت بنادیا اور آسمانوں وزمینوں، ہواؤں اور دریاؤں کے تمام نظام کو انھیں کے لیے مسخر کردیا۔ یہاں تک کہ جنگل کے درندے بھی اپنے بچوں کو ہاتھوں اور منہ میں اٹھا کر اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جنگل خالی کرنے پر آگئے، یہ سارا اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ممکن ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میری ساری امت جنت میں داخل ہو جائے گی مگر جس نے انکار کیا۔ پوچھا گیا کہ انکار کون کرے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (بخاری)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کچھ میں حکم کروں تم اسے پکڑو اور جن سے منع کروں پس تم ان سے باز آؤ۔ (ابن ماجہ) اور فرمایا مومن نہیں بن سکتا تم میں سے کوئی جب تک اس کی خواہش اس دین کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ (مشکوۃ)

اسی طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جس نے میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ (مشکوۃ)

آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ تمھارے لیے دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں تم ہر گز گمراہ نہ ہوگے اگر انھیں کو تھامے رہو گے ایک کتاب اللہ اور دوسرا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے میرے ساتھ محبت کی اور جس نے میرے ساتھ محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جس نے میری سنت کو مضبوطی سے پکڑ لیا وہ جنت میں داخل ہو گا۔

شرعۃ الاسلام میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری سنت کی حفاظت کی تو اللہ تعالیٰ چار باتوں سے اس کا اکرام کرے گا۔ نیک لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دے گا۔ فاجر لوگوں کے دلوں میں ہیبت ڈال دے گا۔ رزق وسیع کر دے گا۔ دین میں پختگی پیدا کر دے گا۔ (بحوالہ شمائل)

حضرات صحابہ کرامؓ اور ہمارے اسلاف اسی اہمیت کی بنا پر سنت کے بہت زیادہ پابند اور کاربند تھے۔

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب مدینہ سے مکہ مکرمہ جاتے تو ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا کرتے تھے کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں آرام فرماتے دیکھا تھا۔ اس لیے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہوں۔ جناب نافع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حد اتباع کیا کرتے تھے جس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی وہاں نماز پڑھتے، ایک درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا تھا آپ رضی اللہ عنہ اس درخت کی بڑی نگہداشت کرتے اور اسے پانی دیا کرتے تھے تاکہ وہ خشک نہ ہو جائے۔ (کنز الاعمال)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جناب ثمامہ بن ساحق کنانیؓ کو روم بھیجا وہ فرماتے ہیں کہ میں ہرقل روم کے دربار میں پہنچا اور بے خیالی میں سونے کی کرسی پر بیٹھ گیا اچانک مجھے

خیال آیا کہ کرسی پر بیٹھا ہوں فوراً اتر گئے۔ ہرقل روم ہنسنے لگا اور کہا کہ ہم نے تمہارا اکرام کیا تھا اور تم اتر گئے، میں نے جواب میں کہا کہ:

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ (کنز: ۵۸/۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب غصہ آئے تو اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور اگر بیٹھے ہو لیٹ جاؤ۔ غصہ جاتا رہے گا۔ سیدنا ابو ذر غفاریؓ باغ میں پانی دے رہے تھے ایک شخص نے ایسی حرکت کی کہ نالی کی پال ٹوٹ گئی اور پانی باہر نکل کر بہنے لگا سیدنا ابو ذرؓ کو غصہ آیا مگر فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آگیا، آپ وہیں کیچڑ اور پانی میں بیٹھ گئے، سارے کپڑے لت پت ہو گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں تاخیر برداشت نہیں کی۔ (مسند احمد: ۲۵۱/۵)

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے کہ اگر کھانے کی کوئی چیز زمین پر گر جائے تو اس کو چھوڑے نہیں کہ یہ کفران نعمت ہے، شیطان اس سے خوش ہوتا ہے لہٰذا تم شیطان کو خوش مت کرو بلکہ نوالہ گر گیا ہے تو اس کو اٹھا کر کھالو اور مٹی لگ گئی ہے تو اسے صاف کر کے باقی کھالو۔ سیدنا حذیفہؓ نے ایران کے شاہی دربار میں کھانا کھاتے وقت ایک نوالہ گر گیا اور اُسے اٹھانے جھکے تو کسی نے اعتراض کیا تو فرمایا ''کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے اپنے محبوب کی سنت کو چھوڑ دوں''؟

جناب ابو یزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے کھانے اور عورتوں کی خواہش ختم کرنے کی دعا کروں مگر یہ سوچ رہا تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا تو میں ایسا خلافِ سنت کام کیوں کروں (پھر ایسا نہ کیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے دل کی بات پوری فرما دی اب یہ حالت ہے کہ عورت سامنے آئے تو اتنی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ یہ دیوار ہے یا عورت۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ:

سنت کی پیروی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو رہ گیا وہ غرق ہو گیا۔ (شمائل: ص ۳۴)

امام اوزاعیؒ نے اللہ تعالیٰ کی خواب میں زیارت کی اور فرمایا کہ اے عبد الرحمٰن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو۔ میں نے عرض کیا یا اللہ تعالیٰ آپ کے فضل و کرم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوں۔ پھر میں نے کہا اے رب مجھے اسلام پر موت نصیب فرما، تو ارشاد خداوندی ہوا ہے وعلی السنۃ اور سنت پر موت آئے اس کی بھی دعا کرو۔ (شمائل)

جناب فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں:

لِاَنَّ الْعَمَلَ اذا کان خَالِصًا غیر صواب لَم یُقبَل و کذالك اذا کان صوابًا غیرَ خالِصٍ فَاِنَّ نص اَنْ یکونَ لِوجهِ اللهِ وَالصَّوَابُ ان یکون عَلَی السنّۃِ (تفسیر الکبیر: ۱/ ۳۴۲)

یعنی جو عمل خالص ہو مگر صواب (سنت کے مطابق) نہ ہو تو وہ مقبول نہیں ہوتا عمل تو وہ مقبول ہوتا ہے جو خالص ہو اور سنت کے مطابق ہو۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ:

لَا یَستَقِیمُ قولٌ وَعَمَلٌ وَنِیَّۃٌ اِلَّا بِمُوَافَقَۃِ السُّنَّۃِ۔ (تلبیس ابلیس: ص ۹)

کوئی بھی قول اور عمل اور نیت ٹھیک نہیں جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق نہ ہو۔

عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک مرتبہ کسی کو خط لکھا "میں تجھے وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور اس کے حکم پر چلنے کی اور جو باتیں اہل بدعت نے نکالی ہیں انھیں ترک کرنے کی۔ اہل بدعت نے یہ باتیں اُس وقت نکالیں جبکہ سنت کا اجر عمل میں آ چکا تھا، یہ لوگ

سنت کو پیچھے ڈال کر پیروی کرنے سے مستغنی ہو گئے۔ پس تجھ پر سنت کی پیروی لازم ہے بے شک یہ اللہ کے حکم سے تجھے گمراہی سے بچائے گا۔ (ابو داؤد شریف)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

مَنْ تَهَاوَنَ بِسُنَّةٍ عُوقِبَ بِحِرْمَانِ الْفَرَائِضِ۔ (تفسیر عزیزی)

"جس نے سنت کو ہلکا سمجھا اور اس کے ادا کرنے میں سستی کی تو اس کو فرائض سے محرومی کی سزا ملے گی"۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع نصیب فرما کر شریعت کے خلاف بدعات سے بچانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

دین وشریعت

دین کی ضرورت:

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انھیں مشکل نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہے جانور اور حیوانات بھی جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات و ضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات، جذبات، مصالح و مفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا، اس لیے خود خالق کائنات انسان کے لیے جتنے بہتر اصول زندگی اور جتنا مناسب قانون حیات وضع کر سکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کر سکتی۔ نظام زندگی کو مرتب کرنے کے لیے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لیے قوت فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لیے قرآن مجید نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے۔[انعام: ٦٣]

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظام زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا، کیونکہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا اور اس سے اس بات کی بھی امید نہیں کی جا سکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیت انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لیے خدا کے رب اور رحمٰن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گزارنے اور جینے مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لیے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدمؑ جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے جو قانون بھیجا جاتا رہا اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس عہد میں تشریف لائے، جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا، اس لیے آپ کو وہ احکام دیئے گئے جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں لیکن آدمی پوری طرح جوان ہو جائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے، آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے ،اسی طرح شریعت محمدی اس وقت دنیا میں آئی، جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی ،اس لیے یہ شریعت ہمیشہ کے لیے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا ،قرآن کی زبان میں اسی کا نام "اکمال دین" اور "اتمام نعمت" ہے۔ [مائدہ: ۳]

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظام حیات ہے ،جو "شریعت الہامی" یا "اسلامی قانون" کہلاتا ہے۔ یہ قانون فلاسفہ یونان کے افکار کی طرح محض "نظریہ" نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظام زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام و نشان کر دے، بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم و بیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا ہے۔ دنیا میں جب اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانون فطرت سے مطابقت اور امن و سلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے خلافت عثمانیہ ،ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا۔ [راہ عمل]

دین وشریعت کا مفہوم:

دین کے حوالے اکثر دو لفظ سننے میں آتے اور بولے جاتے ہیں۔ایک دین دوسرا شریعت، لیکن کم لوگ ہے جن کو یہ معلوم ہوگا کہ دین کے کیا معنی ہیں اور شریعت کا کیا مطلب ہے۔ان الفاظ کے صحیح فہم سے ناواقفیت کی وجہ سے اکثر دین کو شریعت سے اور شریعت کو دین سے گڈمڈ کر دیا جاتا ہے اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

دین کے معانی:

دین کے کئی معانی ہیں۔ایک معنی عزت، حکومت، سلطنت، بادشاہی اور فرماں روائی کے ہیں۔دوسرے معنی اس کے بالکل برعکس ہیں یعنی زبردستی، اطاعت، غلامی، تابعداری اور بندگی، تیسرے معنی حساب کرنے اور فیصلہ کرنے اور اعمال کی جزاوسزا کے ہیں۔قرآن شریف میں لفظ دین انھی تین معنوں میں آیا ہے فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔(آل عمران:۱۹)

یعنی اللہ کے نزدیک دین وہی ہے جس میں انسان صرف اللہ کو عزت والا مانے اور اس کے سوا کسی کے آگے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے، صرف اللہ کو آقا اور مالک اور سلطان سمجھے اور اس کے سوا کسی کا غلام، فرمان بردار اور تابعدار بن کر نہ رہے، صرف اللہ کو حساب کرنے اور جزاوسزا دینے والا سمجھے اور اس کے سوا کسی کے حساب سے نہ ڈرے، کسی سے جزا کا لالچ نہ کرے اور کسی کی سزا کا خوف نہ کھائے،اسی دین کا نام اسلام ہے۔

اگر اس کو چھوڑ کر آدمی نے کسی اور کو اصلی عزت والا، اصلی حاکم، اصلی بادشاہ اور مالک، اصلی جزاوسزا دینے والا سمجھا اور اس کے سامنے ذلت سے سر جھکایا، اس کی بندگی اور غلامی کی، اس کا حکم مانا اور اس کی جزا کا لالچ اور سزا کا خوف کھایا تو یہ جھوٹا دین ہوگا۔اللہ ایسے دین کو ہرگز قبول نہیں کرتا کیونکہ یہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے، خدا کے سوا کوئی دوسری ہستی اس تمام کائنات میں حقیقی عزت والی نہیں ہے، نہ کسی اور کی سلطنت اور بادشاہی ہے، نہ کسی اور کی غلامی اور بندگی کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے، نہ اس مالک حقیقی کے سوا کوئی اور جزاو سزا دینے والا ہے، یہی بات دوسری آیتوں میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ

یعنی جو شخص خدا کی سلطانی اور بادشاہی کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مالک اور حاکم مانے گا اور اس کی بندگی اور غلامی اختیار کرے گا، اور اس کو جزا و سزا دینے والا سمجھے گا، اس کے دین کو خدا ہرگز قبول کرنے والا نہیں ہے اس لیے کہ:

وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ۔ [البینہ: ۵]

انسانوں کو تو خدا نے اپنا بندہ بنایا ہے اور اپنے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا انھیں حکم ہی نہیں دیا ہے، ان کا تو فرض یہ ہے کہ سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کے لیے اپنے دین یعنی اپنی اطاعت اور غلامی کو مخصوص کر دیں، اور یکسو ہو کر صرف اسی کی بندگی کریں اور صرف اسی کے حساب سے ڈریں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔

[آل عمران: ۸۳]

کیا انسان خدا کے سوا کسی اور کی غلامی اور فرماں برداری کرنا چاہتا ہے، حالانکہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں صرف خدا کی غلام اور فرماں بردار ہیں اور ان ساری چیزوں کو اپنے حساب کتاب کے لیے خدا کے سوا کسی اور کی طرف نہیں جانا ہے، کیا انسان زمین اور آسمان کی ساری کائنات کے خلاف ایک نرالا راستہ اپنے لیے نکالنا چاہتا ہے؟

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

[التوبہ: ۳۳]

اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچے دین کا علم دے کر اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ سارے جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم کر دے اور انسان کو ایسا آزاد کر دے کہ وہ خداوند عالم کے سوا کسی کا بندہ بن کر نہ رہے، چاہے کفار و مشرکین اس پر اپنی جہالت سے کتنا ہی واویلا مچائیں اور کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ [الانفال: ۳۹]

”اور تم جنگ کرو تاکہ دنیا سے غیر اللہ کی فرماں روائی کا فتنہ مٹ جائے اور دنیا میں بس خدا ہی کا قانون چلے، خدا ہی کی بادشاہی تسلیم کی جائے اور انسان صرف خدا کی بندگی کرے“۔

اس تشریح سے معلوم ہو گیا کہ دین کے کیا معنی ہیں۔

- ✓ خدا کو آقا اور مالک اور حاکم ماننا،
- ✓ خدا ہی کی غلامی، بندگی اور تابعداری کرنا،
- ✓ اور خدا کے حساب سے ڈرنا اس کی سزا کا خوف کھانا، اور اسی کی جزا کا لالچ کرنا۔

پھر چونکہ خدا کا حکم انسانوں کو اس کی کتاب اور اس کے رسول کے ذریعہ ہی سے پہنچتا ہے، اس لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا اصول ماننا اور قرآن کو خدا کی کتاب ماننا اور اس کی اطاعت کرنا بھی دین ہی میں داخل ہے، جیسا کہ فرمایا:

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ إِمَّا يَأۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٞ مِّنكُمۡ يَقُصُّونَ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِي فَمَنِ ٱتَّقَىٰ وَأَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ . [الاعراف : ۳۵]

یعنی اے بنی آدم جب میرے رسول تمھارے پاس میرے احکام لے کر آئیں تو جو شخص تم میں سے ان احکام کو مان کر پرہیزگاری اختیار کرے گا اور ان کے مطابق اپنا عمل درست کرلے گا، اس کے لیے ڈر اور رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہر انسان کے پاس اپنے احکام نہیں بھیجتا بلکہ اپنے رسولوں کے واسطہ سے بھیجتا ہے اس لیے جو شخص اللہ کو حاکم مانتا ہو وہ اس کی فرماں برداری صرف اسی طرح کر سکتا ہے کہ اس کے رسولوں کی فرماں برداری کرے اور رسول کے ذریعہ جو احکام آئیں ان کی اطاعت کرے اسی کا نام دین ہے۔

شریعت کیا ہے؟

اب شریعت کسے کہتے ہیں۔ شریعت کے معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ جب تم نے خدا کو حاکم مان لیا اور اس کی بندگی قبول کرلی اور یہ تسلیم کرلیا کہ رسول اسی کی طرف سے حاکم

مجاز ہے اور کتاب اسی کی طرف سے ہے۔ تو تم دین میں داخل ہو گئے اس کے بعد تم کو جس طریقے سے خدا کی بندگی کرنی ہے، اور اس کی فرمانبرداری میں جس راستہ پر چلنا ہے، اس کا نام شریعت ہے، یہ طریقہ اور راستہ بھی خدا اپنے رسول ہی کے ذریعہ سے بتاتا ہے، وہی یہ سکھاتا ہے کہ اپنے مالک کی عبادت اس طرح کرو، طہارت اور پاکیزگی کا یہ طریقہ ہے، نیکی اور تقویٰ کا یہ راستہ ہے، حقوق اس طرح ادا کرنے چاہیے، معاملات یوں انجام دینے چاہیے اور زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیے، لیکن فرق یہ ہے کہ دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، مگر شریعتیں بہت سی آئیں اور منسوخ ہوتی رہیں یہاں تک کہ دین اسلام اور شریعت محمدی کو تاقیامت آنے والے انسانوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنادیا گیا۔

تزکیہ نفس کی حقیقت

اسلام میں تزکیہ نفس سے مراد ہے انسانی شخصیت کی ایسی نشو ونما جس میں ، وہ سارے اچھے کام کر سکے جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان سب برے کاموں سے بچ سکے جن سے اللہ نے بچنے کا حکم دیا ہے، انسانی شخصیت سے مراد یہاں مکمل انسانی شخصیت ہے یعنی انسان کا جسم وروح، فکر و عمل، جبلتیں، عواطف وجذبات، تعقل، نفسی محرکات، عادتیں وغیرہ۔

تزکیہ نفس اسلام کی بنیاد ہے چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں بھیجے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں تاکہ لوگ اسلام قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کرکے اللہ کی خوشنودی حاصل کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سنواریں۔ قرآن حکیم میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی لیے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کا تزکیہ نفس کریں۔

اللہ تعالیٰ جو ہدایت اور دین اپنے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرماتا رہا ہے اور جو دین اور شریعت اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی وہ بنی نوع انسان کی ہدایت اور ان کے نفوس کے تزکیے کے لیے یقیناً کافی وشافی ہے۔اس دنیا میں انسان تین طرح کے تعلقات رکھتا ہے اور انھی پر اس کی ساری زندگی کے اعمال وافعال محیط ہوتے ہیں۔ ایک: انسان کا تعلق اس کے خالق کے ساتھ۔ دوسرے: اس کا تعلق دوسرے بنی نوع انسان کے ساتھ اور تیسرے: اس کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ۔ ان تینوں قسموں کے تعلقات میں اگر انسان کو اپنے حقوق وفرائض کا پتہ چل جائے اور وہ ان پر ٹھیک طریقے سے عمل پیرا ہو جائے تو اس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔اسی طرح شریعت (یعنی احکام دین) کو بالعموم چار بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک ایمانیات، دوسرے عبادات، تیسرے اخلاقیات اور چوتھے معاملات۔ ان چاروں شعبوں میں دی گئی شرعی تعلیمات پر اگر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو انسانی

تعلقات پر توازن سے عمل ہو جاتا ہے اور متوازن اسلامی شخصیت وجود میں آجاتی ہے جو کہ تزکیہ نفس کا حقیقی مطلوب ہے۔ پس روحانیت کا خلاصہ یہی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی پاسداری کر لی جائے اور بس۔

بعض لوگ روحانیت کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے ہیں، ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا، جنات کو تابع کر لینا وغیرہ جیسے اعمال وافعال کو روحانیت کی اصل سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ روحانیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ روحانیت یہ ہے کہ تمام باطنی بیماریوں سے انسان خود آزاد ہو جائے اور ظاہری وضع قطع کے ساتھ ساتھ باطنی طور پر بھی اللہ کا حقیقی بندہ بنا جائے۔ پھر پُورے دین پر عمل پیرا ہونے کا مقصد نجات کاملہ اور قُرب خداوندی ہے یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ قرب اور آخرت میں بلا حساب وکتاب جنت میں داخل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پورے دین پر عمل کیا جائے، پھر چاہے شریعت کے وہ احکام انسان کے ظاہر سے متعلق ہوں یا انسان کے باطن سے۔ دونوں قسم کے احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر نجاتِ کاملہ اور قربِ خداوندی کی امید رکھنا بے کار ہے۔

دین کے جو احکام ظاہر سے متعلق ہیں چاہے وہ اوامر ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، کسب حلال وغیرہ یا نواہی ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے جیسے زنا، چوری، ڈاکہ، شراب نوشی، حرام خوری وغیرہ۔ جن سے "علم فقہ" میں بحث کی جاتی ہے۔ یہ احکام کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجماع اور قیاس سے ثابت ہوتے ہیں۔ اوراس دین کے جو احکام انسان کے باطن سے متعلق ہیں چاہے وہ اوامر ہوں جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ مثلاً صبر، شکر، تقویٰ، اخلاص، رضا الٰہی وغیرہ، اور جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا جیسے تکبر، غضب، حرص، حسد، ریاء وغیرہ ان امور سے "علم تصوف" میں بحث کی جاتی ہے۔ یہ احکام بھی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع اور قیاس ہی سے ثابت ہیں۔ اس کو تصوف، سلوک، تزکیہ اور فقہ باطن بھی کہا جاتا ہے۔

تزکیہ نفس اور سلوک:

گویا تزکیہ اور سلوک کا موضوع اور اصل مقصود یہ ہے کہ مسلمان باطن کے اچھے اخلاق (اخلاق حمیدہ) کو اپنے اندر پیدا کرے جنھیں کرنے اور زندگی میں جاری رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے مثلاً صبر، شکر، تقویٰ، اخلاص رضا الٰہی وغیرہ اور باطن کے برے اخلاق (اخلاق رذیلہ) کو اپنے اندر سے دور کرے اور ہرگز اُن کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔ مثلاً تکبر، غضب، حرص، حسد اور ریا وغیرہ۔

آسانی کے لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سلوک اور تزکیہ کا موضوع اور اصل مقصد "تزکیہ نفس" ہے یعنی اپنے باطن کو صاف کرنا۔ البتہ تزکیہ اور سلوک میں جن اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے ان سے متعلق دو باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ ان باتوں کے ذہن میں رکھے بغیر غلطی کا قوی امکان ہے۔ اول یہ کہ جو اخلاق سلوک کا موضوع ہیں چاہے وہ اخلاق حمیدہ ہوں یا اخلاق رذیلہ، اُن سے باطنی اخلاق مراد ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، وہ علامات اور اثار مراد نہیں جو ان باطنی اخلاق پر بسا اوقات مرتب ہوتے ہیں اور جو ایک عام آدمی کو بھی بآسانی نظر آجاتے ہیں اور جن سے باطن پر اکثر استدلال بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ آثار وعلامات اگرچہ درست ہوتے ہیں مگر ان کی حقیقت کے پہچاننے میں عام انسان کو غلطی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ظاہری تواضع اکثر تواضع قلبی پر دلالت کرتی ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے اور بکثرت ہوتا ہے کہ آدمی ظاہراً متواضع ہوتا ہے مگر اس کا دل تکبر سے بھرا ہُوا ہوتا ہے اور کبھی کوئی آدمی ظاہراً اپنا سر بلند کرکے رکھتا ہے مگر اُس کے دل میں تواضع اور خشیت بھری ہوئی ہوتی ہے۔ سلوک وتصوف میں پہلا شخص متکبر ہے گو دیکھنے والے اُسے متواضع سمجھتے ہوں اور دوسرا شخص متواضع ہے گو دیکھنے والوں کو اس پر متکبر ہونے کا گمان ہونے لگتا ہو۔ دوم یہ کہ جس طرح فقہ ظاہر میں کامل دیندار بننے کے لیے نماز، روزہ وغیرہ میں صرف کسی ایک وقت کی نماز پڑھ لینا یا ایک دن کا فرض روزہ رکھ لینا کافی نہیں بلکہ تمام فرائض وواجبات مع سنن موکدہ کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح فقہ باطن میں بھی کسی ایک دو نعمتوں پر شکر کرلینا یا کسی ایک دو موقعوں پر صبر کا مظاہرہ کرلینا کافی نہیں بلکہ تزکیہ نفس کے کمال کے لیے ان کا قلب میں رچ

بس جانا ضروری ہے۔ یعنی شکر کے تمام مواقع پر زبانی، عملی اور قلبی شکرادا کرنا اور صبر کے تمام مواقع پر موقع بموقع صبر اختیار کرنا ضروری ہے۔

جس طرح فقہ میں کبھی کبھی چوری کرلینا، کسی کسی جگہ حرام کمائی کھالینا کامل دیندار ہونے کے منافی ہے۔ اسی طرح سلوک میں کبھی کبھار تکبر اختیار کرلینا، کسی کسی عبادت میں ریا کرلینا، کہیں کہیں ناجائز غصہ کرلینا، تزکیہ نفس کے کمال کے منافی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ سلوک میں اخلاق حمیدہ کا حصول بدرجہ ملکہ اور اخلاق رذیلہ کا ازالہ (یا امالہ) بدرجہ زوال ضروری ہے۔ جب اخلاقِ حمیدہ کا حصول بدرجہ ملکہ اور اخلاقِ رذیلہ کا ازالہ بدرجہ زوال ہو جائے تب کہا جا سکتا ہے کہ "تزکیہ نفس" ہو گیا ہے اور سلوک کی حقیقت اُس کو حاصل ہو گئی ہے یہ وہی تزکیہ نفس ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی کنجی قرار دیا۔ اور فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ (الشّمس: ۹)

"یقیناً وہ کامیاب ہے جس نے اس نفس کو پاک کرلیا اور وہ ناکام ہے جس نے اسے گناہوں میں دبا دیا۔"

اور یہ وہی تزکیہ نفس ہے جسے قرآن حکیم نے نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

"حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کا تزکیہ کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور یقیناً یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔" (ال عمران: ۱۶۴)

اس آیت سے واضح ہے کہ تلاوتِ قرآن پاک، تعلیم کتاب وحکمت کے علاوہ "تزکیہ نفس" بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا۔ بس یہی "تزکیہ نفس" سلوک اور اصلاح کا مقصود ہے۔

جب قرآن کریم کے نازل کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور امت کی ہدایت اور ان کے تزکیہ کا کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تو اس

سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ صرف کتاب تزکیہ کے لیے کافی نہیں اس کے لیے کسی "مزّکی" کا وجود ضروری ہے جس کی رہنمائی اور تربیت کے ذریعے یہ دولت حاصل کی جاسکے۔ چنانچہ رسول اللہ صحابہ کرامؓ کے لیے مزکی اور شیخ تھے۔ تو صحابہ کرامؓ اپنے بعد آنے تابعین کے لیے مزکی اور شیوخ کا درجہ رکھتے تھے۔ اور اس طرح نسلاً بعد نسل یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

"بھلا نِری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتی کہ بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اُٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اُٹھایا جاسکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے بغیر سوئی پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہر گز کوئی خوشنویس نہیں ہوسکتا۔ غرض بدوں کسی کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا۔"

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر وپس بیا
بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق　　عمر بگذشت و نہ شد آگاہِ عشق

"یعنی اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہے تو رہبر کا دامن پکڑ کر چلو، اس لیے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا، اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہوا۔"

(بحوالہ شریعت وتصوف: ۱۰۶)

نیا اسلامی سال اور اپنا احتساب

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بہت سی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں ایک اہم ترین نعمت "وقت" ہے۔انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے ، اس کے اوقات بڑھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت عمر گھٹتی جاتی ہے اور ہر لمحہ وقت کی متاع گراں مایہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے۔ وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وقت کی قسم کھائی ہے، اور ایک مستقل سورت "والعصر" کے نام سے نازل ہوئی ہے۔"عصر" کے معنی ہی زمانہ اور وقت کے ہیں۔ پھر دن ورات کے مختلف مواقع ہیں، جن کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے دن، رات ، صبح، سورج نکلنے کا وقت وغیرہ ، چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کبھی رات کی، کبھی دن کی، کبھی صبح کی، کبھی سورج چڑھتے ہوئے دن کے وقت کی، کبھی رات کے ساتھ شفق کی اور کبھی فجر اور اس کے دس راتوں کی قسم کھائی ہے۔ دن رات کی آمد ورفت اور سورج وچاند کے طلوع وغروب سے اوقات کار کا علم ہوتا ہے۔قرآن میں جب کسی چیز کی قسم کھائی جائے تو اس سے اس چیز کی اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس طرح قرآن مجید نے بار بار وقت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پھر غور کیجیے کہ اکثر عبادتیں وقت ہی سے متعلق ہیں ، نماز پنجگانہ جو افضل ترین عبادت ہے، اس کا اداء و قضاء ہونا، درست ونادرست ہونا اور مستحب ومکروہ ہونا، وقت کے ساتھ مربوط ہے، روزہ کی ابتدا وانتہا وقت سے اس درجہ متعلق ہے کہ اس میں دو چار منٹ کی بھی کمی زیادتی نہیں ہوسکتی، یہی حال دوسری عبادتوں کا بھی ہے جیسے حج، زکوٰۃ۔

وقت کی اہمیت کیوں نہ ہو ، کیوں کہ انسان کی نیکیاں اور برائیاں اور ثواب وعذاب سب کا تعلق وقت کے صحیح اور غلط استعمال سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَزَالُ قَدَمَا ابْنُ اٰدَمَ حَتّٰى يُسْئَلُ عَنْهُ عَنْ خَمْسٍ۔ کہ قیامت کے دن جب تک لوگ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیں گے ان کو آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں ہوگی، ایک یہ کہ انھوں نے اپنی عمر کس کام میں بسر کی: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ ، دوسرے اپنی جوانی کس کام میں

صرف کی: عَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَا اَبْلَاہُ، تیسرے مال کس ذریعہ سے کمایا اور چوتھے کس راہ میں خرچ کیا اور پانچویں یہ کہ اس نے جو کچھ سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟ [ترمذی: ۷۶/۲]

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا سودا اصل میں وقت ہی کے حساب وکتاب سے متعلق ہے، اور دنیا میں تو ہر شخص دن ورات اس کا تجربہ کرتا رہتا ہے، کہ وقت کی ناقدری انسان کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہے، اور وقت کی قدردانی اسے کس قدر نیک نام و بامرام کرتی ہے، اسی لیے اردو کے ایک شاعر نے خوب کہا ہے:

لمحہ گزر گیا تو سمجھیے صدی گئی

اب چند دنوں سے اسلامی سال ۱۴۳۵ھ کا آغاز ہو گیا ہے، ۳۰ ذی الحجہ کے دن غروب آفتاب جوں ہی ہو گیا اور رات آ گئی تو یہ صرف دن اور رات ہی کی تبدیلی نہیں، بلکہ یہ ایک سال کی تبدیلی تھی، اور ایک نئے کیلنڈر کو وجود میں لائے گی، نیا سال دراصل ہمیں دو باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، ماضی کا احتساب اور آئندہ کا پروگرام، انسان کے لیے اپنے آپ کا محاسبہ ضروری ہے، یہ محاسبہ ہمہ پہلو ہونا چاہیے، محاسبہ دنیاوی امور میں بھی ضروری ہے، اگر آپ تاجر ہیں تو اپنی تجارت کا جائزہ لیں، کہ اس میں آپ نے کیا کچھ ترقی کی ہے؟ اگر نہیں کی ہے یا پیچھے ہٹے ہیں، تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ کہیں اس میں آپ کی کوتاہی کو تو دخل نہیں ہے؟ اگر آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازم ہوں تو غور کریں کہ آپ اس میں جو بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے تھے یا اپنی ایمانداری اور بہتر کارکردگی کے ذریعہ جو اعتماد آپ کا پیدا ہو سکتا تھا، آپ نے کس حد تک اسے حاصل کیا ہے؟ اسی طرح ہر شعبہ زندگی میں ہمیں اپنی کامیابی و ناکامی اور پیش قدمی و پست رفتاری کا جائزہ لینا چاہیے۔

انسان کا کسی چیز میں پیچھے ہو جانا بری بات نہیں، بُری بات یہ ہے کہ انسان بے حسی میں مبتلا ہو جائے، وہ ناکام ہو اور اپنی ناکامی کے اسباب پر غور نہ کرے۔ اس کے قدم پیچھے ہٹیں، اور فکرمندی کی کوئی چنگاری اس کے دل ودماغ میں سلگنے نہ پائے، وہ ٹھوکر کھائے لیکن ٹھوکر اس کے مہمیز نہ بنے، جو شخص اپنے نقصان کا جائزہ لیتا ہے، اپنی کتاب زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو محسوس کرتا ہے، وہی گر کر اٹھتا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں

ہوتا ہے، جس میں اپنے احتساب اور اپنی کمزوریوں کے اعتراف کی صلاحیت ہی نہ ہو، وہ کبھی اپنی منزل کو نہیں پا سکتا۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طِفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

جیسے دنیاوی اعتبار سے اپنا احتساب ضروری ہے، اسی طرح دین واخلاق اور اعمال وکردار کے اعتبار سے بھی احتساب ضروری ہے، اپنی عبادت پر نگاہ دوڑائیں، کہ بہ مقابلہ گزشتہ سال کے اس سال اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اپنے معاملات کو دیکھیں کہ حلال وحرام اور مستحبات ومکروہات کے جو احکام شریعت میں ہیں، ان میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے، خاص کر اپنے اخلاق وسلوک کا جائزہ لینا چاہیے، والدین کے ساتھ، شوہر وبیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، رشتہ داروں اور خاص کر غریب رشتہ داروں کے ساتھ، خاندان کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ، مسلمان اور غیر مسلم پڑوسیوں اور کاروبار ودفاتر کے رفقا کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے؟ ہم ان کے لیے پھول ہیں یا کانٹے؟ وہ ہم سے راحت وسکون محسوس کرتے ہیں یا خوف ودہشت؟ ہم نے انھیں محبت کی سوغات دی ہے یا نفرت وعداوت کا تحفہ؟ غرض ہمیں اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کا جائزہ لینا چاہیے، اور خود اپنا حساب کرنا چاہیے کیوں کہ انسان دوسرے انسانوں کی نگاہ سے اپنی کوتاہیوں کو چھپا سکتا ہے، لیکن اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تمھارا حساب کیا جائے، خود اپنا حساب کرو: حَاسبوا انفسکم قبل ان تحسابوا۔

[کنز العمال حدیث: ۴۴۰۰۳]

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم   دن بہ دن، لمحہ بہ لمحہ، دم بہ دم

اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی، جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کر سکیں، اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ [الفاطر: ۳۷] حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے

مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں، صحت اور فراغت وقت۔ سلف صالحین جنھوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کیے ہیں، دراصل انھوں نے اپنے وقت کے ایک ایک لمحہ کو وصول کرتے تھے، اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے۔ آیئے! نئے سال کا استقبال کرتے ہوئے ہم عزم مصمم کریں، کہ وقت کی پوری قدردانی کریں گے، اور اپنے ایک ایک لمحہ کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اور پچھلے عمر اور سال کا احتساب اور آئندہ عمر اور سال کا لائحہ عمل مرتب کرکے ہم سب اس کا عزم کریں اور اپنے آپ کو اس پر قائم رکھیں تو کون ہے جو اس امت مرحوم کے فرد اور تمام امت کی سربلندی کو روک سکے؟؟

تربیت اولاد

بچوں کی تربیت ایک ایسا گھمبیر مسئلہ ہے جو ہر دور کے والدین کے لیے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں مسلمان والدین کے لیے بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے والدین کا خود تربیت یافتہ ہونا خصوصاً "ماں" کے لیے تربیت کے داؤ پیچ اور بچے کی نفسیات کو سمجھنا ایک لازمی امر ہے، کیونکہ بچوں کی تربیت میں مرکزی کردار ماں ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے اور شریعت نے بھی ماں کو ہی بچوں کی تربیت کے حوالے سے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

قدرت نے نوزائیدہ شیر خوار بچے کی ساری کائنات ماں کی گود اور ماں کے دودھ سے وابستہ کر دی ہے۔ بچے کو شروع سے ہی ماں کا قرب نصیب ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ماں کو دوسال تک دودھ پلانے کی ہدایت کی ہے۔ یہی دو سال کا عرصہ بچے میں تعلیم حاصل کرنے کی قوت اور ذہنی دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت کو بڑھا سکتا ہے۔اگر کسی مجبوری کی بنا پر ماں اپنا دودھ نہ پلا رہی ہو تو فیڈر سے دودھ پلانے کے لیے بھی ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگا کر پلائے۔ اللہ تعالیٰ نے دودھ پلانے والی ماں کو خصوصی اجر سے نوازا ہے۔ جو مسلمان عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک ایک قطرے کے بدلے ایک نیکی عطا کرتا ہے۔ بچہ رات کو بھوک سے روئے اور ماں اپنی نیند کی قربانی دے کر پوری محبت اور خوش دلی سے دودھ پلائے تو فرشتے اس کو جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی مائیں اپنے بچوں کو باوضو ہو کر دودھ پلاتی تھیں اور ساتھ ساتھ کان میں کتاب اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتی تھیں۔ ہمیں بھی اس عمل کی پیروی کرنی چاہیے، تاکہ بچوں کی زندگی میں دین داری کے اثرات نمایاں ہوں۔ بعض لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ نوزائدہ بچے کو چالیس دن کے اندر اندر قرآن پاک کی تلاوت سنا دی جائے تو اس کے بہت سے مثبت اثرات سامنے آتے ہیں اور اگر والدین گھر کے کاموں میں مشغول ہوں تو اس دوران کیسٹ کے ذریعہ ہلکی آواز میں قرآن کی تلاوت بچے کو سرہانے لگا دی جائے۔ سوتے جاگتے بچے کو قرآن کی تلاوت سے مانوس کیا جائے۔ بچہ بولنے کی کوشش کرنے لگے تو سب سے پہلے "اللہ" کا نام سکھایا جائے۔ اذان کی آواز پر متوجہ کیا جائے۔ کلمہ طیبہ ، بسم اللہ، الحمد للہ ، السلام علیکم جیسے

بابرکت کلمات سے بچے کی زبان کو تر کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب بچے کی زبان کھل جائے تو بچہ کو سورۃ فرقان کی یہ آیت یاد کروائی جائے۔"

"وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔[" الفرقان: ۲:۲۵]

اگر شروع کے دو تین سال بچے کو والدین، خصوصاً ماں کی بھرپور توجہ اور شفقت نہ ملے، اور خصوصی باہمی تعلق ماں اور بچے کے درمیان نہ ہو تو ساری زندگی بچہ غیر معمولی جارحانہ پن، منفی اندازِ فکر اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتا ہے۔ ماں اور بچے کے درمیان ہر عمر میں قربت قائم رہنی چاہیے۔ بچہ چند دن کا ہو، چند سال کا یا جوان، حتیٰ کہ جوانی کی حد سے نکل جانے والے "بچے" بھی ماؤں کی گود میں سر رکھ کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کی قربت میں ایک انمول کشش رکھ دی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جن ماؤں کا اپنے بچوں کے ساتھ ممتا کا تعلق نہ ہو تو ان کے بچے ساری عمر ماں کی محبت میں کمی اور تشنگی کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ " بچپن کے تجربات پتھر پہ لکیر ہوتے ہیں۔" مثبت اور خوشگوار مشاہدات، جذبات واحساسات کا حامل بچہ اپنے لاشعور سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس میں قوت اعتماد، قوت فیصلہ اور سمجھ بوجھ زیادہ پائی جاتی ہے۔

بچوں کی تربیت کے لیے والدین کو بہت سے ادوار اور بے شمار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ والدین اور اولاد کا تعلق کبھی نہ ٹوٹنے والا اور ختم نہ ہونے والا تعلق ہے۔ یہ دنیا وآخرت دونوں میں ایک دوسرے کے لیے باعث فخر وانبساط بھی ہو سکتا اور باعث رنج وندامت بھی۔

اُمت مسلمہ جن مشکلات بھرے دور سے گزر رہی ہے اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔ گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے عزمِ نو کے ساتھ نئی نسل کی آبیاری کریں۔ اس ویران کھیتی کو زرخیز اور باثمر بنانے کی کوشش کریں۔ اگر امت مسلمہ کے ہر گھر سے ایک بچہ بھی اسلام کے انسانِ مطلوب کی صورت میں نصیب ہو جائے تو آئندہ ایک دو عشروں میں ہی دنیا میں "اسلامی انقلاب" برپا ہو سکتا ہے۔

دین اسلام کیا ہے۔۔؟

دنیا کے ہر سچے اور جھوٹے مذہب، ہر مفید او غیر مفید جماعت اور ہر اچھی یا بُری تنظیم کے لیے کچھ بنیادی اُصول اور چند فکری واعتقادی بنیادیں ضروری ہوتی ہیں جن سے اس کے مقاصد متعین اور سمت مقرر ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس مذہب یا جماعت کے اراکین اور ماننے والوں کے لیے دستورِ اساسی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو شخص ان جماعتوں، مذاہب یا انجمنوں کا رکن بننا چاہتا ہے وہ پہلے ان بنیادی باتوں کو دیکھتا ہے۔ اگر یہ اسے پسند آجائیں، ان کے درست ہونے کا یقین ہو جائے، اس کا ذہن و فکر ان باتوں کو قبول کرلے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو جائیں تو وہ اس جماعت کا ممبر بن کر اس کے اراکین و متبعین میں شمولیت اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ دستور کے مطابق تمام فرائض پورے کرے۔ نیز اپنے طرز وروش سے بنیادی اصولوں پر اپنے ایمان و خلوص کا ثبوت پیش کرے اور اس کے بنیادی اصولوں کو ہر وقت یاد رکھے۔ اس کے خلاف کوئی کام نہ کرے بلکہ اپنے انداز واطوار اور طرزِ عمل سے اس جماعت کے مقاصد کا اعلیٰ نمونہ بن کر رہے اور اپنی عملی زندگی سے دوسروں کو متاثر کرکے اس جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ گویا کسی جماعت کا رکن بننے کے معنی یہ ہیں کہ رکن کو اس جماعت کے نظام سے پوری واقفیت ہو، اس کے اصولوں کا پابند رہے، اس کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی پوری زندگی ان کے مطابق بسر کرے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جس کا اطلاق ایک عام مسلمان پر بھی من وعن ایسے ہی ہوتا ہے۔ گویا کہ اسلام ایک جماعت ہے اور مسلمان اس کا رکن ہے۔

اسلام کیا ہے۔؟

انسان چونکہ کمزور ہے۔ اس لیے اس کی عقل اس وسیع وعریض کائنات تک پہنچنے اور ماضی، حال و مستقبل کو سمجھنے سے قاصر ہے، تاہم انسان کے لیے صحیح راہِ عمل اور متوازن نظامِ حیات صرف وہی ذات وضع کرسکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ اِس خالق نے جو نظامِ حیات جن وانس کی کامیابی کے لیے وضع کیا ہے اسے دینِ اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اللہ کی طرف سے بندوں

کی راہنمائی کے لیے اخروی، ابدی اور دنیا و آخرت کی کامیابیوں کا ضامن، ہر دور اور ہر ملک و ملت کے لیے اصلاح و فلاح کا جامع نظام و پروگرام ہے۔ جو ہر دور کے انسان وجنات کے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ مسائل کا واحد حل ہے۔ دیگر رائج الوقت مذاہب و نظام ہائے حیات، اسلام کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح بلا کسی شک و شبہ کے نامکمل ہیں، جو پوری انسانی زندگی کا احاطہ کبھی بھی نہیں کر سکتے، جبکہ اسلام ہی ایک ہمہ گیر و عالم گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ و پہلو خواہ وہ نظریات و عقائد ہوں، عبادات و معاشرت ہو، معیشت و سیاست ہو، انفرادیت ہو یا اجتماعیت سب کے بارے میں ایک مکمل اور جامع پروگرام رکھتا ہے۔ جو شخص اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اسلامی عقائد و احکام کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرے۔

اسلام عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات (معاشیات)، معاشرت اور سیاست و ریاست پر مشتمل ایک مکمل دین ہے۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر شعبۂ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہو اور اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور یہی اسلام کا مطلب بھی ہے کیونکہ اسلام کا لفظی معنی سر جھکا دینا اور تابع بن جانا ہے۔

عید کا پیغام

ہر قوم کے کچھ خاص تہوار اور جشن کے دن ہوتے ہیں جن میں اس قوم کے لوگ اپنی اپنی حیثیت اور سطح کے مطابق اچھا لباس پہنتے اور عمدہ کھانے پکاتے ہیں، دوسرے طریقوں سے بھی اپنی اندرونی مسرت و خوشی کا اظہار کرتے ہیں، یہ گویا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

اسلام میں بھی خوشی منانے کے لیے دو دن مقرر کیے گئے ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ (عید قربانی)۔ بس یہی مسلمانوں کی اصل مذہبی و ملی تہوار ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمان جو تہوار مناتے ہیں ان کی کوئی مذہبی حیثیت اور بنیاد نہیں ہے، بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں سے اکثر خرافات ہیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ آئے، عید الفطر اور عید الاضحیٰ ان دونوں تہواروں کا سلسلہ بھی اسی وقت سے شروع ہوا ہے۔

عید الفطر رمضان المبارک کے ختم ہونے پر یکم شوال کو منائی جاتی ہے اور عید الاضحیٰ (بقر عید) دس ذی الحجہ کو۔ رمضان المبارک دینی و روحانی حیثیت سے سال کے بارہ مہینوں میں سب سے مبارک مہینہ ہے۔ اسی مہینہ میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا، اسی پورے مہینہ کے روزے امت مسلمہ پر فرض کیے گئے، اس کی راتوں میں ایک مستقل با جماعت نماز کا اضافہ کیا گیا اور ہر طرح کی نیکیوں میں اضافہ کی ترغیب دی گئی۔ الغرض یہ پورا مہینہ خواہشات کی قربانی اور مجاہدہ کا اور ہر طرح کی طاعات و عبادات کی کثرت کا مہینہ قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس مہینہ کے خاتمہ پر جو دن آئے ایمانی اور روحانی برکتوں کے لحاظ سے وہی سب سے زیادہ مستحق ہے کہ امت کے جشن و مسرت کا دن اور تہوار بنایا جائے، چنانچہ اسی دن کو عید الفطر قرار دیا گیا اور دس ذی الحجہ وہ مبارک تاریخی دن ہے جس میں امت مسلمہ کے مؤسس و مورثِ اعلیٰ سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی دانست میں اللہ تعالیٰ کا حکم و ارشاد

پا کر اپنے لخت جگر سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان کی رضامندی سے قربانی کے لیے اللہ کے حضور میں پیش کر کے اور ان کے گلے پر چھری رکھ کر اپنی سچی وفاداری اور کامل تسلیم ورضا کا ثبوت دیا تھا۔ ہر اسلامی شہر اور بستی میں عید الاضحیٰ کی تقریبات نماز اور قربانی وغیرہ بھی اس کی گویا نقل اور دوسرے درجہ کی یادگار ہے۔ بہر حال ان دونوں دنوں (یکم شوال اور دس ذی الحجہ) کی ان خصوصیات کی وجہ سے ان کو یوم العید اور امتِ مسلمہ کا تہوار قرار دیا گیا۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر عمل سے پیغام دیتا ہے، عبرت و موعظت کے پہلوؤں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور زندگی کے ہر واقعہ کو مشعل راہ بنا دیتا ہے، جس کی روشنی سے اندھے بھی دیکھنے لگیں اور لنگڑے بھی چلنے لگیں، عبادت و بندگی ہو یا لوگوں کے باہمی معاملات، اسلام کا ہر طریقہ ایک "بولتا ہوا" عمل ہے کہ بہرہ بھی اس کو سننے سے محروم نہ رہیں۔

عید بھی سراپا "پیغام" ہے، دعوت ہے، عید سب سے پہلے ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو خوشی اور مسرت کے لمحات کس طرح گزارنے چاہئیں۔ غور کیجیے کہ مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی دن نہیں، لیکن نہ رقص و سرر ہے، نہ نغمہ و رباب ہے اور نہ مستی شراب، نہ پٹاخوں کی اودھم، نہ نعروں کا شور و غوغا، نہ آتش بازیوں کا سیلاب، بلکہ ہر مسلمان صبح دم اٹھتا ہے، نماز فجر ادا کرتا ہے، پھر نہاتا ہے، صاف ستھرے اور میسر ہوں تو نئے کپڑے بدلتا ہے اور شانہ بشانہ نماز عید کے لیے رواں ہے، آنکھیں جھکی ہوئیں اور زبان پر اللہ کی کبریائی اور حمد و ثنا کے کلمات، عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کرتا ہے، اور اپنی پیشانی خدا کے سامنے مٹی پر رکھ کر اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے، خوشی کے مواقع پر آدمی میں

کسی قدر کبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے بار بار اپنی بڑائی کی نفی اور خدا کی بڑائی کا اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اصل صاحب ایمان وہ ہے جو خوشی و مسرت کے وقت اترانے نہ لگے، اس کی گردن مارے کبر کے اونچی نہ ہو، اس کی زبان پر اپنی بڑائی کا کلمہ نہ ہو، بلکہ وہ خدا کے سامنے جھکتا ہوا ہو،، خوشی نے اس کے تواضع وانکسار کو بڑھایا اور اپنی بڑائی کے احساس کو گھٹایا ہو اور اس وقت بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم ہوئی۔ شادی بیاہ ہو، بچہ کی پیدائش ہو، نیا مکان خدا نے دیا ہو، دکان اور روزگار کا سامان میسر آیا ہو، کوئی بات خوشی کی پیش آئی ہو تو مسرت کے اظہار کا وہی طریقہ اللہ کو پسند ہے کہ مومن کا سر شکر کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کی زبان اللہ کے ذکر اور حمد وثنا سے تر ہو۔ عید مسلمانوں کے لیے اجتماعیت اور وحدت کا بھی پیغام ہے، مالدار ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، فرمانروا ہو یا رعایا، سماج کا معزز اور معروف شخص ہو یا کوئی معمولی اور غیر معروف آدمی، گورا ہو یا کالا اور عربی ہو یا عجمی، ایک ساتھ شانہ بہ شانہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس کے کرم کے سوالی ہیں، یہاں کوئی امتیاز نہیں، خدا کے دربار میں سب برابر ہیں، علامہ اقبال کے الفاظ میں :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے وحدت کا اور کیا پیغام ہو گا؟ یہ سب مسلمان ہیں، کلمہ توحید پڑھنے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن نبوت سے وابستہ، آخرت پر سب کا یقین، قرآن مجید پر ایمان رکھنے والے جیتے اور مرتے ایک قبیلے کے حامل، فکر و نظر اور

فروع کا کچھ اختلاف ضرور ہے، لیکن اس کے باوجود آج یہ شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم کھڑے ہیں، کاش! دوسرے دنوں میں بھی اس وحدتِ ملی کو محسوس کریں اور سوچیں کہ کس قدر دین کی بنیادی باتوں میں ان کے درمیان اشتراک واتفاق ہے اور اگر کچھ اختلاف ہے تو اس لائق ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کے ساتھ ان کو برداشت کیا جائے۔

عید ہمیں اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ وہ خوشی، خوشی نہیں جس میں پورے معاشرہ کو شامل نہ کیا جائے، آپ کے گھر میں مسرت کا چراغ جلے بلکہ چراغاں ہو اور آپ کا پڑوسی غم کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو، اس سے زیادہ نامبارک کوئی مسرت نہیں ہو سکتی۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید الفطر کے ساتھ ساتھ صدقہ الفطر کا بھی حکم دیا ہے کہ ہر صاحب گنجائش مسلمان اپنی اور اپنے زیر پرورش لوگوں کی طرف سے گیہوں کی ایک خاص مقدار یا اس کی قیمت اپنے غریب بھائی کو پہنچائے اور عید سے پہلے پہلے پہنچا دینے کی کوشش کرے، تاکہ معاشرہ کے غریب اور پریشان حال لوگ بھی عید کی خوشی میں شامل ہو سکیں۔ صدقۃ الفطر ایک علامتی عمل ہے، یہ صرف عید ہی کے دن کے لیے مخصوص نہیں۔ یہ اس بات کی تسلیم ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ہر خوشی میں معاشرہ کے غریب بھائیوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ وہ خوشی ادھوری اور ناکام ہے جو اپنے گھر تک محدود ہے اور جس میں اپنے ان پڑوسیوں کو شامل نہ کیا گیا ہو جن کو خدا نے آپ کی نگاہ لطف کا محتاج بنایا ہے۔

فتنے اور ان سے بچاؤ

آج کے پر آشوب و پر فتن دور میں ہر سو فتنے ہی فتنے سر اٹھا رہے ہیں۔ کہیں مال و دولت کا فتنہ، کہیں جنگ و جدال کا فتنہ، کہیں شرک و کفر کا فتنہ، کہیں ظلم و ستم کا فتنہ کہیں غربت و محتاجی کا فتنہ، اولاد کا فتنہ اور کہیں یہود و ہنود کی زہریلی ثقافت کا فتنہ اور نہ جانے اس کے علاوہ کتنے ہی قسم کے فتنے اس دنیا فانی میں پائے جاتے ہیں۔

الغرض دنیا کی زندگی خطرناک و ضرر رساں فتنوں سے لبریز ہے۔ وہ بندہ بڑا سعادت مند، خوش باش، خوش قسمت، خوش بخت، نیک بخت اور اچھے نصیب والا ہے جو ان خوفناک اور دہشت ناک فتنوں سے بچالیا جاتا ہے۔ جس طرح سیدنا مقداد بن اسودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”بے شک وہ شخص سعادت مند ہے جو فتنوں سے بچایا گیا، بلا شبہ وہ شخص خوش نصیب ہے جو فتنوں سے بچایا گیا، بے شک وہ شخص خوش بخت ہے جو فتنوں سے بچایا گیا“۔

آج اس مادہ پرستی کے دور میں ہر کوئی فتنے میں مبتلا نظر آتا ہے۔ آج ہر شخص پریشان خاطر، پژمردہ خاطر، فکر مند اور اداس معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ آج انسان بری طرح فتنوں میں پھنس چکا ہے اور ان خونریز اور خون خوار فتنوں نے انسان کو پریشان حال کر دیا ہے۔ یہ دور بہت ہی پر فتن دور ہے اس دور میں جو انسان اپنے آپ کو فتنوں سے محفوظ کر لیتا ہے وہ انسان اپنے آپ کو ضلالت و رسوائی کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے بچا لیتا ہے اور ایسا انسان اس دنیا میں اچھے نصیب والا ہے اور خوش بختی و سعادت مندی اس کا مقدر بن جاتی ہے دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کر لیتا ہے۔
نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے ظہور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”عنقریب فتنے رونما ہوں گے ان میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا۔ جو شخص بھی ان کی جانب جھانکے گا فتنے اس کو کھینچ لیں

گے پس جو شخص پناہ کی جگہ پائے یا کوئی پناہ دینے والا مل جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے ذریعہ پناہ حاصل کرے"۔

اس موقع پر بعض اُن فتنوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جن کے وقوع پذیر ہونے کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دی ہے کہ آخری زمانے میں قرب قیامت یہ یہ فتنے رونما ہوں گے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان فتنوں کے شر سے بچنے کے ذرائع وتدابیر بھی بتائی ہیں، تاکہ وہ ان ضرر رساں فتنوں سے محفوظ ومامون ہو سکیں۔

جنگ وجدال کا فتنہ:

قتل وغارت، جنگ و جدال اور لڑائی و جھگڑے یہ بھی فتنوں میں ایک بڑا فتنہ ہے۔ سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت قریب ہو گی، علم اٹھالیا جائے گا، فتنے ظاہر ہوں گے، بخل (لوگوں کے دلوں میں) ڈال دیا جائے گا اور ھرج بکثرت ہو گا صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ھرج کیا ہے؟ آپ نے فرمایا قتل و غارت گری"۔

آج یہ قتل وغارت کا فتنہ عام ہو چکا ہے روزانہ صبح اخبارات، جرائد و رسائل میں ایسے واقعات ضرور پڑھنے میں آتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں کوئی قتل نہ ہوا ہو، اور کوئی نہ کوئی دھماکہ نہ ہوا ہو انسانی لاشیں بکھرے نہ پڑیں ہو خدا جانے کتنے کتنے خاندان و قبائل اس فتنہ کی وجہ سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی حدیثوں میں یہ خبر دی ہے کہ آنے والے زمانے میں ایسے حالات پیش آئیں گے کہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی ہو گی، اور یہ بات یقینی طور پر واضح نہیں ہو سکے گی کہ کونسا فریق حق پر ہے، اور کون باطل پر، کیونکہ ہر فریق اپنے حق میں دلائل پیش کرے گا۔ ایسی خانہ جنگی کو ان احادیث میں فتنہ فرمایا گیا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں عام مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مفصل ہدایات دی ہیں اور ان تمام احادیث میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے موقع پر عام مسلمانوں کو ایسی لڑائی سے بالکل الگ رکھنا چاہیے، یعنی صلح کی جتنی کوشش

ممکن ہو، وہ کی جائے، لیکن کسی بھی فریق کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اس قسم کی کچھ احادیث ذیل میں نقل کی جاتی ہیں: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک ایسا فتنہ آئے گا جو بہرا، گونگا، اندھا ہوگا۔ جو کوئی اسے جھانک کر دیکھے گا۔ وہ اسے بھی اچک کر لے جائے گا، اور اس فتنے میں زبان کو بے مہار چھوڑ دینا تلوار کے وار کی طرح ہوگا"۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ فتنے کے بہرا گونگا اور اندھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس فتنے میں مبتلا ہوں گے، انھیں حق و باطل کی تمیز نہیں ہوگی، وہ کسی کی بات نہیں سنیں گے بلکہ جو کوئی بولے گا، اسے تکلیفیں پہنچائی جائیں گی، اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ نیز زبان کو بے مہار چھوڑ دینے سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ جھوٹی باتیں ادھر سے ادھر نقل کریں گے جو فتنے کی آگ مزید بھڑکائے گی۔ (بذل المجہود جلد ۵ ص ۷۹)

نیز اندھے بہرے فتنے کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

دین حق کا اصل مقصود بھلائی اور اس پر عمل ہے، اس لیے (اس پر عمل کے لیے) حق کا علم بھی ضروری ہے، اس کا ارادہ بھی، اور اس پر قدرت بھی، اور فتنہ ان سب سے متضاد چیز ہے، کیونکہ وہ حق کی پہچان، اس کے ارادے، اور اس پر قدرت کے لیے رکاوٹ بنتا ہے، چنانچہ فتنے میں ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں جو حق کو باطل سے گڈمڈ کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں بہت سے یا اکثر لوگوں کو حق کا امتیاز نہیں رہتا، اور اس میں خواہشات و جذبات انسان کو حق کا قصد کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں، اور اس میں شر کی قوتیں اتنی غالب آجاتی ہیں کہ خیر پر قدرت کمزور پڑ جاتی ہے، اسی لیے فتنے کے مواقع پر انسان خود اپنے دل کی حالت بدلی ہوئی محسوس کرتا ہے، اور دلوں پر ایسے حالات طاری ہوتے ہیں جو حق کی پہچان میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، اسی لیے فتنے کو اندھا بہرا کہا گیا ہے، اور یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہیں اس قسم کے الفاظ یہ بتانے کے لیے استعمال فرمائے گئے ہیں کہ فتنے میں جہالت پھیل جاتی ہے، اور علم مخفی ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اہل فتنہ جاہلیت کی طرح ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قیامت سے پہلے ایسے فتنے آئیں گے جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے۔ ایک شخص اس زمانے میں صبح کے وقت مومن ہوگا، اور شام کو کافر ہو جائے گا، اور شام کو مومن ہوگا، اور صبح کو کافر ہو جائے گا، اس زمانے میں جو شخص بیٹھا ہو، وہ کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا، اور جو چل رہا ہو، وہ دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ لہٰذا اپنی کمانیں توڑ دو، اور اپنی (کمان کی) تانتیں کاٹ ڈالو، اور اپنی تلواروں کو پتھر پر دے مارو۔ پھر بھی کوئی تمھارے اوپر چڑھ آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ آدم (علیہ السلام) کے اس بیٹے کی طرح ہو جائے جو دو بیٹوں میں زیادہ بہتر تھا (یعنی ہابیل جس نے قابیل کے ہاتھوں قتل ہونا گوارا کیا، مگر اس کو قتل نہیں کیا)۔

اس حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ایک شخص اس زمانے میں صبح کے وقت مومن ہوگا، اور شام کو کافر ہو جائے گا۔ اس کی تشریح حضرت حسن بصریؒ نے اس طرح فرمائی ہے: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کے وقت تو وہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے خون اور اس کی آبرو اور اس کے مال کو حرام سمجھتا ہوگا، لیکن شام کو وہ اسے حلال قرار دے گا، اور شام کو تو اپنے بھائی کے خون، آبرو اور مال کو حرام سمجھتا ہوگا، اور صبح کو اسے حلال قرار دے گا۔

خواتین کا فتنہ:

فتنوں میں سب سے زیادہ ضرر رساں فتنہ خواتین کا فتنہ ہے۔ سیدنا اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے بعد آنے والے فتنوں میں مردوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ عورتوں کا فتنہ ہے“۔

جب عورت نیم برہنہ اور بے پردہ ہو کر شتر بے مہار کی طرح بازاروں کی طرف نکلتی ہے یا کسی محفل کی رونق بنتی ہے تو اس وقت شیطان مردوں کی نظروں کو عورت کی طرف اٹھاتا ہے اور ان کی نظروں میں عورت کو خوبصورت کرکے پیش کرتا ہے تو مردوں کی نظریں اس عورت کی طرف اٹھ جاتی ہیں، اس ساری کاروائی میں خود شیطان نگرانی کر رہا ہوتا

ہے، جب نظر سے نظر مل جاتی ہے تو نتیجہ خطرناک ثابت ہوتا ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے فتنہ کو ضرر رساں قرار دیا ہے۔

مال و دولت کا فتنہ :

مال و دولت بھی فتنہ و فساد کا باعث ہے۔ مال و منال کی طمع و لالچ میں بہت سے لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں اس لیے رب ذو الجلال والاکرام نے مال و دولت کو فتنہ قرار دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے : تمھارے مال اور اولاد تو سراسر تمھاری آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ (حوالہ)

مال و دولت کا فتنہ ایسا فتنہ ہے کہ جس میں ڈوب کر انسان دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے اور باری تعالیٰ کو بھول جاتا ہے،اسی مال کی خاطر انسان اپنا سکون و آرام کھو بیٹھتا ہے اس کے ذہن میں ہر وقت ایک ہی دھن سوار رہتی ہے کہ مال آجائے، چاہے جائز ذرائع استعمال کیے جائیں یا ناجائز ذرائع استعمال کیے جائیں۔

یہی مال ہے جس کی وجہ سے آج بھائی بھائی سے جدا ہے، دوست اپنے دوسرے دوست کا دشمن بن چکا ہے، امن و سکون ختم ہو چکا ہے۔اسی مال و دولت کی وجہ سے ہر طرف بدامنی، انارکی، چوری، ڈاکہ زنی، لوٹ مار ہو رہی ہے لیکن پھر بھی انسان کی حوس و لالچ ختم نہیں ہوتی ہے۔

اولاد کا فتنہ :

مال کی طرح اولاد بھی انسان کے لیے فتنہ و آزمائش ہے۔اولاد کے لیے انسان سب کچھ کرتا ہے اولاد کی خاطر انسان کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور یہی اولاد انسان کو گناہ اور مصیبت کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کو بھی فتنہ قرار دیا ہے فرمان الٰہی ہے:

"تمھارے مال اور اولاد تو سراسر تمھاری آزمائش ہیں" (حوالہ)

شرک کا فتنہ:

شرک ظلم عظیم ہے۔آج اکثر لوگ اس فتنے میں مبتلا ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں اس فتنہ کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ کافروں سے قتال کرو حتی کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ان سے لڑو تا فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے"۔(حوالہ)

آیت میں فتنہ سے کیا مراد ہے اس بارے میں علامہ زمحشری رحمۃاللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"فتنہ نہ رہے یعنی شرک ختم ہو جائے۔اکثر بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات صفات و کمالات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو شریک کر رہے ہیں"۔(حوالہ)

دجال کا فتنہ:

فتنہ دجال بھی بہت کرب ناک و دہشت ناک فتنہ ہے اس فتنہ سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو آگاہ کیا ہے۔سیدنا عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:آدم علیہ السلام کی تخلیق سے لے کر قیامت قائم ہونے تک دجال سے بڑا فتنہ کوئی نہیں ہے

ان مذکورہ فتنوں کے علاوہ یاجوج وماجوج کا فتنہ، فتنہ المحیاوالممات، دابۃالارض کا فتنہ، ظلم وزیادتی کا فتنہ، غربت و محتاجی کا فتنہ اور امت کا فرقوں میں تقسیم ہونے کا فتنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام فتنوں سے بچائے۔امین۔

اسلام کا نظام معاشرت

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قول کے مطابق انسان مدنی الطبع ہے یعنی انسان اپنی زندگی میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے۔اجتماعیت کے بغیر اس کے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہے اس لیے کہ وہ اپنی پیدائش سے لے کر موت تک سماج (معاشرہ) کا محتاج ہے۔دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے اور پرورش کے لیے اسے دوسرے لوگوں (ماں ، باپ، بہن ، بھائی ، رشتہ دار) کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کا سوسائٹی، برادری، محلّہ ، بستی، شہر ، قوم، نظامِ تمدن و تہذیب سے واسطہ پڑتا ہے۔ نیز اپنی ضروریات مثلاً خوراک ، لباس ، مکان اور زندگی کے ہر شعبے میں وہ جماعت کا محتاج ہے۔

اگر اس کے وہ تمام تعلقات ختم کردیے جائیں جو جماعت، سماج و معاشرہ کی بدولت اسے حاصل ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ نہیں رہتا اور اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔الغرض معاشرے کے بے شمار روابط جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں، انھی کی مضبوطی پر ایک فرد ،معاشرے اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے۔اس لیے اسلام کی نظر میں معاشرے کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔اللہ کریم نے معاشرے کی درستگی کے لیے مستقل سورتیں نازل فرمائی ہیں جیسے سورۃ النساء ، حجرات ،احزاب ،وغیرہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کے اکمال کا مدار قرار دیا ہے کیونکہ اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے اور اس کا ایک بہت اہم جزء حسنِ معاشرت بھی ہے۔

اسلامی معاشرہ:

اسلام انسانوں کے لیے ایک صحیح منصفانہ اور پائیدار نظامِ معاشرت رکھتا ہے جس کے اُصول و ضوابط مستقل و محکم اور عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔یہ ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں اور ہر قسم کی سرگرمیوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات پر محیط اور اپنی ہدایت و قانون سازی میں دین و دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ چونکہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لیے

اسلام نہ تواشتراکی معاشروں کی طرح فرد کی آزادی کی قدر و قیمت ختم کرکے زبردستی آمریت قائم کرنا چاہتا ہے، جس سے فرد کی حیثیت ختم ہو کر ایک مشینی پُرزے سے زیادہ نہیں رہتی اور اس وجہ سے اس کی بہت سی انفرادی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور نہ مغربی سرمایہ دارانہ اور سیکولر معاشرہ کی طرح فرد کو مکمل آزاد کرکے اپنی ذاتی ترقی کے لیے معاشرے اور اجتماعیت کو نقصان پہنچانے کا موقع دیا جاتا ہے، بلکہ اسلام ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں ایک تیسرا معتدل نظام پیش کرتا ہے جو فرد و جماعت کے اندر ایک معتدل توازن قائم کرتا ہے۔اس میں ایک طرف تو فرد کو جداگانہ حیثیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس کا ایک بہت اہم جز ہے جو پوری طرح اپنی صلاحیتیں کام میں لانے کا حق دار ہے۔اور اس فرد میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اللہ رب العزت کے سامنے اپنی انفرادی زندگی کا جواب دہ ہے۔احساسِ ذمہ داری کے بعد یہ بھی ایک ضروری امر ہے کہ وہ اپنا ایمان اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت پر برابر تازہ کرتا رہے۔ اسلام ایک طرف فرد کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح ہدایات دیتا ہے اور فرد پر ایسی پابندیاں لگاتا ہے کہ اس کی ذاتی ترقی و مفاد معاشرے کے لیے نقصان اور اجتماعی ترقی میں رکاوٹ کا باعث نہ بنیں۔ ساتھ ہی اسلام کے نظامِ معاشرت کا سنگِ بنیاد نظریہ یہ ہے کہ تمام انسانیت آدمؑ کی اولاد ہے رنگ، زبان، حسب ونسب، قوم قبیلہ کی تفریق وامتیاز اور اُونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے۔یہ فطری تقسیم تو صرف باہمی تعارف کے لیے ہے اگر کوئی فرق وامتیاز ہو سکتا ہے تو وہ نظریات وخیالات، اعمال، اخلاق اور تقویٰ کا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"بے شک تم میں سے اللہ کے ہاں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو"۔ (حجرات ۱۳)

انسانی مساوات کا ایسا تصور اس کے ہاں موجود ہے جس کی دنیا کے کسی اور مذہب میں نظیر نہیں ملتی۔ عزت و شرف کا حقیقی معیار اس کی نظر میں صرف حسنِ عمل اور اخلاق و کردار ہے۔ ظلم و تشدد اور فساد و خون ریزی سے اسے نفرت ہے۔انسانیت کے قتلِ ناحق اور خونِ بشر کی پامالی سے اس کا دامن پاک ہے۔ وہ سراپا محبت ہے اور آدابِ محبت سکھاتا ہے۔وہ امن کا حامی ہے اور امن وامان کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم کی ظلمتوں میں وہ محبت کا چراغ اور فتنہ و تشدد

کی آندھیوں میں امن کی شمع فروزاں ہے۔ ایک مسلمان اپنے مذہبی تصورات اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں سب سے زیادہ امن پسند اور دوسروں کے لیے امن کا داعی ہوتا ہے۔

اسلام نے تمام انسانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ، فتنہ و فساد کی سرکوبی اور قیام کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مستقل قوانین وضع کیے اور انسانیت کی اصلاح و فلاح کے لیے اُصول زندگی کی رہنمائی کی ہے۔اس کی نگاہ میں انسان کی جان اور زندگی کی سلامتی ایک اہم ترین حقِ انسانی ہے، ناحق قتل خواہ کسی بھی انسان کا ہو، قرآن کی نگاہ میں سخت ترین گناہ ہے اور گویا ایک انسان کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے: ”جو کوئی کسی کو کسی جان کے عوض یا زمین پر فساد کے عوض کے بغیر مار ڈالے تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا۔“ (مائدہ: ۳۲) اور ایسے قاتل کے لیے سورۃ نساء آیت ۹۳ میں جہنم کی ابدی سزا کا اعلان کیا گیا ہے۔

مالی معاملات کے سلسلے میں ہدایت یہ ہے کہ کسی کا مال حرام و ناجائز طریقے پر ہڑپ کرنے کی کوشش نہ کی جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ، مت اڑاؤ“ (البقرۃ: ۱۸۸)

قرآن میں چوری اور ڈکیتی کی سزا کا ذکر بھی موجود ہے تاکہ انسانی معاشرہ کسی بدامنی کا شکار نہ ہونے پائے اور لوگوں کو جان و مال کا تحفظ فراہم ہو۔

اسلام نے انسان کی عزت و آبرو کا بھی تحفظ کیا ہے اور کسی کی عزت و آبرو پامال کرنے کو کبیرہ گناہ قرار دیا اور زنا کی سخت ترین سزا مقرر کرتے ہوئے اس کے قریب تک جانے سے بھی منع کیا:

” اور زنا کے قریب بھی مت جانا بے شک یہ ایک بے حیائی ہے“ (بنی اسرائیل: ۲۳)

یہاں تک کہ کسی ثبوت شرعی کے بغیر کسی عفیف و پاک دامن عورت یا مرد پر تہمت لگانا بھی جرم قرار دیا گیا۔

قیامِ امن کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانوں کے درمیان ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ جب ظلم و سرکشی بڑھتی ہے تو پھر دنیا اور معاشرے سے امن و امان رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شریعت میں ظلم کو حرام قرار دیا ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ مطلق بُرائی اور ظلم و سرکشی سے ممانعت کرتا ہے"۔ (نحل: ۹۰)

ظلم کے مقابلے میں اسلام نے "عدل" کی تعلیم دی ہے۔ عدل سے حقوق کی پاس داری اور تکمیل ہوتی ہے۔ عدل صرف نظمِ سلطنت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے۔ عدل کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحبِ حق کا حق پورا ادا کیا جائے، اس کے عموم میں اللہ کے حقوق بھی داخل ہیں اور تمام اقسام کے انسانی حقوق بھی۔ یہ مفہوم بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور یہ بھی کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کی حمایت کی جائے۔ انبیا علیہم السلام کی بعثت اور کتب و صحائفِ سماویہ کے نزول کا مقصد یہی تھا کہ معاشرہ میں انصاف اور اس کے ذریعے امن و امان قائم ہو، ہر فردِ انسانی اپنے دائرہ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے۔ قرآن کی تمام تعلیمات عدل کے اُصول پر مبنی ہیں، ہر قوم کے انسانی اور سماجی حقوق کا تحفظ اسی راہ سے ممکن ہے۔ اسی لیے قرآن کی بے شمار آیات میں عدل کی تعلیم اور ظلم کی مذمت کی گئی ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے ضمن میں انسانی مساوات کے تصور کی بڑی اہمیت ہے، جب انسانوں کے درمیان اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق کیا جانے لگے، ذات پات اور برادری کے علاوہ رنگ زبان کے مختلف خانوں میں انسانوں کو بانٹا جائے تو باہمی کشمکش اور نفرت و عداوت کی فضا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ جس کی بنیاد پر نقضِ امن اور عدم تحفظ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے رنگ و نسل اور زبان و وطن کے بتوں کو توڑا، انسانوں کے درمیان کسی بھی طرح کے بھید بھاؤ اور تفریق کو مٹایا اور تمام انسانوں کو اولاد آدم ہونے کی حیثیت سے یکساں قرار دیا اور عزت و سر بلندی کا معیار مسرف تقویٰ اور خدا ترسی ٹھہرایا۔

۱۔ آج معاشرہ پھر ظلم و فساد کی آماج گاہ بنا ہوا ہے، طاقت ورکازور ہے اور کمزور بے بس۔

۲۔ دولت مند غریبوں کا استحصال دولت وطاقت کی بنیاد پر ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ آور ہے، امن کے دعوے دار ہی اصل غارت گر امن ہیں، صلح وسلامتی کے نام نہاد علم برادر ہی مہلک ہتھیاروں کے سوداگر ہیں۔

۳۔ یوں توامن اوراصلاح معاشرہ کے نام پر بے شمار ادرے اور تنظیمیں موجود ہیں، مگر پھر بھی دنیاامن کے لیے بے چین ہے۔ ایسے حالات میں یہ ضروری ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن کے نظامِ امن سے روشنی حاصل کی جائے اور اسلام کے امن پسندانہ نظامِ معاشرت کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔ امن کی پیاسی دنیا کا اضطراب اسی راہ سے دور ہوسکتا ہے، جس راہ سے دنیا ظلم کی تنگیوں سے نکل کر اسلام کے عدل کی طرف پلٹ آئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلامی نظامِ معاشرت کو وسیع پیمانے پر متعارف کرائیں اور دنیا کو یہ پیغام دیں کہ اسلام ہی دنیا کی موجودہ مشکلات کا واحد حل ہے اور اسی کے سہارے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

قرآن، کتاب انقلاب

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری، آسمانی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے جس کی نظیر لانے سے ساری دنیا کے جن وانس عاجز ہیں "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ" (الاسراء) یہ وہ فرقان حمید ہے جو حق و باطل، مومن و منافق اور مسلم و کافر کے درمیان فرق واضح کرتا ہے "بینات من الھدیٰ والفرقان" (بقرہ) یہ وہ نور ہے کہ جہاں یہ ہو وہاں ظلمت اور باطل نہیں ٹھہر سکتی "لتخرج الناس من الظلمات الی النور" (ابراھیم) "وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" (زخرف) اور جہاں یہ نہ ہو وہاں ظلمت ہی ظلمت ہوتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی وہ مضبوط رسی ہے جسے اگر انسان مضبوطی سے تھام لے تو کبھی بھی راہ حق سے بھٹک نہیں سکتا "ھوحبل اللہ المتین" (الحدیث) یہ وہ روح کائنات ہے جو صرف مردہ دلوں ہی کو زندہ نہیں کرتا بلکہ پوری کائنات کی زندگی اور اس کا ارتقاء اسی سے وابستہ ہے۔ جب یہ نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو گا۔ یہ ایک زندہ کتاب اور اول سے آخر تک ابدی صداقتوں کا مجموعہ ہے جو زندگی کے تمام مسائل سے بحث کرتا ہے۔ "تبیانا لکل شیء" (نحل) دین و دنیا، عقائد و ایمانیات، افکار و نظریات، عبادات و معاملات، سیاست و معاشرت، تجارت و حکومت، نکاح و طلاق، صلح و جنگ، اخلاق، تہذیب و تمدن اور تاریخ جیسے مضامین کا جامع ہے۔ ایسی جامعیت کسی دوسری آسمانی کتاب کو بھی حاصل نہیں۔ قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جو اَن پڑھ دیہاتی سے لے کر جدید یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل، اعلیٰ تعلیم یافتہ جوانوں تک ہر کسی کی روحانی اور علمی پیاس بجھاتا ہے۔

یہ وہ ہدایت ہے جو دل و دماغ کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اس کے اندر وہ مقناطیسیت ہے جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے، وہ کیفیت ہے جو انسان تو انسان، شجر و حجر پر بھی سحر طاری کر دیتا ہے۔ ایسی حلاوت جو دل کے سارے تار جوڑ دیتی ہے، ایسی طاقت جو ایک نئے انسان کو جنم دیتی ہے۔ ایسا نغمہ جو روح کو سرشار کر دیتا ہے، ایسی روشنی جو اندر کی تاریک دنیا کو منور کر دیتی ہے۔ جن

لوگوں نے دل کی گہرائیوں سے اس کی ہدایت اور صداقت کو قبول کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی بلندیاں عطا کیں جن پر ملائکہ بھی رشک کرتے تھے۔ انھیں خالق کائنات نے ایسی عظمت عطا کی ہے کہ عظمتوں اور رفعتوں کے بڑے بڑے مدعی ان کے پاؤں کی ٹھوکر بنے، انھوں نے تاج کسریٰ اور تختِ قیصر اپنے پیروں تلے روند ڈالے۔ عرب کے وہ بدو جو علم و حکمت سے خالی اور دنیا کی نظر میں حقیر و ذلیل تھے جب انھوں نے قرآن سینے سے لگایا تو زمانے کے امام، قوموں کے مقتدیٰ اور پیشوا بن گئے۔ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس کے ذریعے تمام روحانی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ سایہ دار درخت ہے جو اپنے سائے تلے بیٹھنے والوں کو قلبی سکون اور راحت عطا کرتا ہے لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جتنی یہ کتاب عظیم ترین ہے اتنی ہی مظلوم ترین بھی ہے۔ ایک عظیم اور سدا بہار صحیفہ ہونے کے باوجود قرآن آج خود اس کے ماننے والوں کے لیے ایک اجنبی اور متروک سا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔

یہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے نامہ ہدایت "ھدی للناس" تھی۔ یہ تو سارے جہان کو جھنجوڑنے کے لیے نازل کیا گیا تھا "لیکون للعلمین نذیرا" مگر حال یہ ہے کہ آج مسلمان اس سے غافل ہیں۔ عوام تو عوام خود اہل علم کے لیے بھی یہ کتاب قرآن مبین ایک معمہ اور رازِ سر بستہ بنا ہوا ہے۔ ایک سیدھا سادھا اور غیر پیچیدہ غیر ذی عوج کلام ہونے کے باوجود، دانشورانِ اسلام تک آج اس کے معانی و مطالب سمجھنے اور اس کی واضح ہدایات کے مطابق نوعِ انسانی کی قیادت و رہنمائی کرنے سے عاجز دکھائی دیتے ہیں تو اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مسلمانی کا دم بھرنے والوں کے نزدیک قرآن تو صرف طاقوں میں سجانے، قسمیں اٹھانے، تعویذ پلانے، فال دیکھنے دکھانے، مردوں کو ایصال ثواب کے ختم خوانیوں اور جائز و ناجائز تقریبات کے افتتاح ہی کے لیے رہ گیا ہے۔ کیا قرآن کے ڈیڑھ ارب نام لیواؤں میں کوئی ہے کہ اس کے مطابق اپنا عقیدہ اور ایمان بنائے، اس کی تعلیمات اور احکام پر عمل پیرا ہو کر اس کا عملی ثبوت دے۔ کوئی ہے جو اس کے نظامِ حیات اور قانون کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ کیا کسی مسلمان کے پاس اتنا وقت ہے کہ قرآن کا فہم اور سمجھ بوجھ حاصل کرے اور اس میں تدبر کرے کیونکہ شیخ الاسلام ابن قیمؒ کے قول کے مطابق نزول قرآن کا اصل اور بنیادی مقصد پوری

انسانیت کو دعوت غور و فکر دینا ہے۔اس کائنات میں قرآن ہی وہ واحد اور منفرد کتاب ہے جو خلق السموت والارض میں دعوت غور و فکر کی علمبردار ہے جس کی نظیر اور ثانی کوئی نہیں۔ کلام الٰہی کا مقصود اس کے معانی و مفاہیم اور عظیم مطالب میں تدبر اور غور و فکر ہے ''کتاب انزلنہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ'' نہ کہ ایسی تلاوت جو تدبر اور غور و فکر سے خالی ہو، بہر حال تلاوت قرآن کا اپنا مقام اور اہمیت و فضیلت ہے جو دوسرے کلام کو کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن قرآن کی اساسی، بنیادی، حقیقی اور اولین مقصد و مطلوب اسی عظیم کتاب کے گہرے معانی و مفاہیم میں تدبر اور غور و فکر ہے اور اس کے بعد انفرادی اور اجتماعی طور پر اس پر عمل و نفاذ کا اہتمام ہے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے ہم نے اگر ان تمام باتوں پر غور نہ کیا تو مسلمان جو کبھی اسی پیغام سے عقیدہ و عمل لے کر پوری دنیا پر چھا چکا تھا، عالم کفر کو خود پر یلغار کا قطعی موقع خود فراہم کر دے گا۔ جس کا مشاہدہ آج ہم خود بخوبی کر سکتے ہیں۔

یہ بات بعینہٖ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری پیغام کو یوں عملاً جھٹلا کر ہم جب بالآخر پروردگار کے حضور پیش ہوں گے تو کیا ہم سب کے پاس کہنے اور پیش کرنے کو کچھ ہو گا؟ رہی بات اللہ کی تو وہ تو اپنے اس آخری اور جامع ترین پیغام کی صورت میں ہم پر اپنی حجت تمام کر چکا ہے، اللہ کا دین تو بہر حال چلتا ہی رہے گا اور خیر و شر کے درمیان ازل سے یہ کشمکش ابد تک جاری رہے گی مگر ہم نے اپنا حصہ اس پیغام الٰہی کو سمجھنے اور اسے دنیا میں نافذ کرنے میں نہ ڈالا تو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ ایسی ہی صورت ہو گی کہ ہم خود گویا اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا و آخرت کی تباہی کے لیے گڑھا کھود دیں گے۔ اس بات پر ضرور سوچنا چاہیے کیونکہ اگر ہم نے وقت کی نزاکت اور گرد و پیش کے حالات کو جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا اور اللہ کی اس ہدایت سے منہ موڑے رکھا تو کل کو ہم پر کوئی رونے والا بھی نہ ہو گا۔

بسنت تہوار

بابر ہندوستان پہنچا تو اس نے مقامی لوگوں کو عجیب تہوار مناتے دیکھا۔ اس نے دیکھا لوگ بہار کے پہلے ہفتے پیلے رنگ کے کپڑے پہنتے، ڈھول بجاتے اور ناچتے ہیں۔ بابر یہ تہوار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا مقامی لوگ اسے استقبال بہار کا تہوار کہتے ہیں۔ مقامی زبان میں اس تہوار کا نام "بسنت" تھا۔ بابر نے اس تہوار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ آنے والے دنوں میں مغل شہزادیاں بھی یہ تہوار مناتی رہیں۔ یہ تہوار جس وقت منایا جاتا تھا وہ سرسوں پھولنے کا موسم ہوتا تھا۔

پنجاب کے کھیتوں میں سرسوں کے پھول لہلہا رہے ہوتے تھے، سرسوں کے پھول پیلے رنگ کے ہوتے ہیں، تہوار منانے والے بھی کیونکہ پیلے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے لہٰذا مورخین کا خیال ہے اس تہوار کا سرسوں سے گہرا تعلق ہے۔ سرسوں کا پھول موسم بہار کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔ پنجاب کے لوگ سرسوں پھولتے ہی اپنے مال مویشی باڑوں سے نکال کر صحنوں میں باندھنا شروع کر دیتے ہیں، بھاری لحافوں کی جگہ ہلکی رضائیاں اور گرم چادروں کی جگہ بغیر بازوؤں کے سوئٹر لے لیتے ہیں۔

کچھ مورخین کا خیال ہے بسنت سردی کے اختتام اور موسم بہار کی آمد کا تہوار ہے، شروع شروع میں اسے پنجاب کے کسان، اترپردیش کے دہقان اور مدراس کے غریب ہاری مناتے تھے۔ مغلوں نے اس کی سرپرستی شروع کی تو یہ امرا کے محلات سے باہر نہ نکل سکا۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے نے بسنت کو تاریخ میں پہلی بار ثقافتی سے مذہبی تہوار میں تبدیل کر دیا۔ اورنگزیب کے دور میں حقیقت رائے نام کے ایک لڑکے نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر رکیک حملہ کیا۔ مسلمانوں نے اسے مغلظات بکتے ہوئے پکڑ لیا، ملزم کو عدالت میں پیش کیا گیا، قاضی نے جرم ثابت ہونے پر حقیقت رائے کو سزائے موت سنادی۔ حقیقت رائے پھانسی کی سزا پا کر ہندوؤں کا مذہبی ہیرو بن گیا، جس دن حقیقت رائے کو پھانسی دی گئی، ہندوؤں نے پیلے رنگ کے

کپڑے پہنے، حقیقت رائے کی لاش اٹھائی اور گانے بجاتے ہوئے اسے شمشان گھاٹ تک لے گئے۔ مسلمانوں نے اسے توہین آمیز قرار دیا لیکن ہندوؤں نے پیلے کپڑوں اور رقص و سرور کو بسنت کہہ کر جان بچائی، اگلے سال ہندوؤں نے حقیقت رائے کی برسی منائی اور اس برسی پر پیلے کپڑے پہن کر اور ناچ گا کر حقیقت رائے سے اپنی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے بسنت کے تہوار پر پہلی پتنگ بھی حقیقت رائے کی سمادھی پر ہی اڑائی گئی تھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس سے پہلے پتنگ موجود تھی؟ کیا بسنت کے تہوار پر پتنگ بازی بھی ہوتی تھی؟ جہاں تک پتنگ کے وجود کا سوال ہے، ہندوستان میں پتنگ بازی کا فن صدیوں سے موجود تھا۔ پتنگ کی ایجاد کا سہرہ دو اقوام لیتی ہیں چینی اور مصری۔ مصر میں چونکہ پتنگ بازی صرف شاہی خاندان تک محدود تھی، لہٰذا اسے شاہی کھیل سمجھا جاتا تھا اور عام آدمی کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، چنانچہ وہاں یہ کھیل کھل کر سامنے نہ آسکا جبکہ چین میں بادشاہوں نے اسے عام کر دیا۔

بودھ بھکشو پہلی پتنگ ہندوستان لے کر آئے، ہندوستان کے باسیوں کے لیے یہ ایک بالکل نئی اور حیران کن چیز تھی، لہٰذا یہ بڑی تیزی سے پورے ہندوستان میں رائج ہو گئی، ہندو راجوں اور مہاراجوں نے اس کی پذیرائی کی۔

اسی طرح اب بہار میں دو کھیل ہونے لگے ایک بسنت اور دوسری پتنگ بازی۔ گویہ دونوں کھیل بہار میں کھیلے جاتے تھے۔ لیکن ایک طویل عرصے تک الگ الگ رہے، پھر حقیقت رائے کا معاملہ ہوا اور تاریخ میں پہلی بار بسنت اور پتنگ ایک ہی شخص کی سمادھی پر منائی گئی اور شخص بھی وہ جس نے گستاخی رسول میں موت کی سزا پائی تھی۔

بسنت کے کھاتے میں شاہ حسین کا نام بھی آتا ہے۔ شاہ حسین ایک ہندو لڑکے مادھو لعل کو بہت عزیز رکھتے تھے، مادھو لعل کو پتنگیں اڑانے کا بہت شوق تھا، شاہ حسین اس کا شوق پورا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، ان کا انتقال ہوا اور ان کا مزار مادھو لعل حسین کہلایا، تو ان کے زائرین نے ہر سال ان کے مزار پر دو تہوار منانے شروع کر دیے، ایک تہوار کو میلہ چراغاں کا

نام دیا گیا اور دوسرے کو بسنت کہا گیا۔ بسنت کو اصل پذیرائی مہاراجہ رنجیب سنگھ کے دور میں حاصل ہوئی، مہاراجہ نے اسے قومی تہوار کا درجہ دیا، بسنت کے دن لاہور کے شاہی قلعے سے بسنت کا ایک شاندار جلوس نکلتا ، جلوس کے شرکا نے پیلے چوغے اور پیلی پگڑیاں پہن رکھی ہوتیں، وہ ڈھول اور شہنائی کی آواز پر ناچ رہے ہوتے۔ عوامی دور کا یہ تہوار تین حصوں میں تقسیم ہو گیا، سکھوں کی بسنت، مسلمانوں کی بسنت اور ہندوؤں کی بسنت، سکھ اپنی بسنت گردوارہ منگت سنگھ ، ہندو حقیقت رائے کی سمادھی اور مسلمان مادھو لعل حسین کے مزار پر مناتے۔

یہ ایک محدود قسم کے تہوار ہوتے جن میں چند سو لوگ شریک ہوتے، انگریز آئے تو انھوں نے مقامی ثقافت کی ترویج کا فیصلہ کیا۔ انگریزوں کا خیال تھا، ہر وہ تہوار جو مقامی لوگوں کی اخلاقیات پر برا اثر ڈال سکتا ہے اسے سرکاری سرپرستی فراہم کی جائے، جان لارنس لاہور میں انگریز گورنر جنرل کا سیاسی نمائندہ ہوتا تھا، اسے بسنت کا تہوار مناسب دکھائی دیا، لہٰذا اس نے 1848ء میں پہلی بار جشن بہاراں منانے کا اعلان کیا، یہ بسنت کا ہفتہ بھی کہلایا، اس ہفتے لاہور میں ناچ گانے، پتنگ بازی اور شراب کا عام استعمال ہوا۔ یہ وہ ہفتہ تھا جس میں اخلاقی جرائم کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دے دیا گیا۔

لاہور میں پتنگ بازی اور بسنت منانے کی روایت پاکستان بننے سے پہلے سے موجود تھی۔ اس دور میں لاہور کا منٹو پارک (اب اقبال پارک) پتنگ بازی کے مقابلوں کے لیے مختص تھا، منٹو پارک میں پتنگوں کی تیس چالیس دکانیں تھیں، بسنت کے دنوں میں زندہ دلان لاہور منٹو پارک میں جمع ہوتے، پتنگ بازی کے مقابلے کرتے اور چیخ چلا کر خوشیاں مناتے، اس دور میں پتنگ بازوں کے سردار کو استاد کہا جاتا تھا۔ تم بڑے استاد ہو کا محاورہ انھیں دنوں پیدا ہوا، اس استاد کو لاہور میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ تہوار بھارت میں بھی جڑ نہ پکڑ سکا جبکہ پاکستان میں ابتدائی 13 برس لاہور میں بسنت نام کی کوئی تہوار نہیں ہوا۔ 1960ء کی دہائی میں منٹو پارک میں ایک بار پھر پتنگ بازی کے مقابلے شروع ہو گئے۔ ان مقابلوں کو کسی ستم ظریف نے بسنت کا

نام دے دیا۔یوں ایک بار پھر وہ سلسلہ شروع ہو گیا، وہاں سے پتنگ بازی کی وباء شاہد رہ، شالیمار باغ اور بادامی باغ پہنچی۔

ایوب خان کی حکومت آئی تو اس کو عوامی توجہ ان کے اصل مسائل سے ہٹانے کی ضرورت پیش آئی۔ لہٰذا فوجی حکومت نے بسنت قسم کے لغو اور فضول سلسلوں کی معاونت اور سرپرستی کا فیصلہ کیا۔ پھر 2002ء کو تقریباً 154 برس بعد جنرل پرویز مشرف نے جان لارنس کی پیروی میں جشن بہاراں منایا جس سے یقیناً جان لارنس کی روح کو طمانیت نصیب ہوئی ہو گی اور وہ اپنے ہم ذہنوں کی کارکردگی پر خوش ہوئی ہو گی اور اب پنجاب کے نگران حکومت نے بھی بسنت منانے کی اجازت دے کر 17 اپریل کو بسنت منانے کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا جنھوں نے خود جان لارنس اور پرویز مشرف کے ہم فکر ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

بسنت ایک مقامی تہوار تھا جو مقامی سطح پر منایا جاتا تھا۔ 80ء کی دہائی کے آخر میں ملٹی نیشنل کمپنیوں نے محسوس کیا اگر اس تہوار کی پشت پناہی کی جائے تو یہ تہوار منافع بخش کاروبار بن سکتا ہے، چنانچہ لاہور میں ایسے لوگ تلاش کیے گئے جو اس سلسلے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ایسے لوگ تلاش کر لیے گئے۔

یورپی ممالک نے اپنے سفارتکاروں کو بسنت کے تہوار میں شریک ہونے کی ہدایت کی۔ وہ سفارتکار جو سفارتخانے سے نکلنے کے لیے حکومت سے حفاظت کی سو سو گارنٹیاں مانگتے ہیں۔ وہ اندرون لاہور دو دو دن بسنت مناتے دیکھے گئے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بسنت کو اسپانسر کیا۔میڈیا نے اس کو کوریج دی۔ کوکا، چائے اور ٹوتھ پیسٹ بنانے والوں نے اشتہار دیے، بسنت کے گانے ریکارڈ ہوئے اور پتنگیں اڑاتے اداکار ٹیلی ویژن اسکرین پر دکھائے جانے لگے۔یوں دو تین برسوں میں بسنت قومی تہوار بن گئی۔ پرویز مشرف کی حکومت آئی تو حکومت نے اس ناجائز بچے کو اپنا نام دے دیا۔ جشن بہار کی شکل میں بسنت سرکاری تہوار ہو گیا۔ آیئے! اب یہ سوچتے ہیں کہ بسنت کا سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچ رہا ہے۔ بسنت کا فائدہ دو طاقتیں اٹھا رہی ہیں۔ایک ملٹی نیشنل کمپنیاں جو اس تہوار کے ذریعے اپنی مصنوعات کے اشتہارات دیتی ہیں اور دوسرا ہمارا دشمن بھارت جو ہر سال پاکستان میں کروڑوں اربوں کا سامان بیچتا ہے۔

دلچسپ حقیقت دیکھیے ! جب لاہور اور پھر پورے پاکستان میں بسنت کو پذیرائی ملی تو امر تسر، ہریانہ اور دہلی بسنت کے ساز و سامان کی منڈی بن گئے۔ پاکستان ہر سال بھارت سے کروڑوں روپے کی ڈور اور پتنگیں اور ان کے بنانے کا ساز و سامان در آمد کرتا ہے جو ظاہر ہے دشمن کی معیشت کو فائدہ پہنچانے کے مترادف ہے۔

تہذیب، شائستگی اور اخلاقیات بھی اس تہوار کی اجازت نہیں دیتی۔ ہلا گلا، شور شرابہ، ناچ گانا، تانک جھانک اور اسراف کی دنیا کی کوئی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ یہ کیا تفریح ہے جو جاتے جاتے بیسیوں جانیں ساتھ لے جاتی ہے، جس میں ایک رات میں کروڑوں روپے کی بجلی ضائع کر دی جاتی ہے اور فحاشی اور عریانی کو جس کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔

بسنت کے ذریعے ہماری ثقافت تباہ ہوئی۔ ہمارا معاشرہ افراتفری اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہوا۔ ہماری نوجوان نسل گمراہ ہوئی۔ ہم نے تفریح کے نام پر پورے معاشرے کو نفسیاتی بیماری کے حوالے کر دیا اور ہم نے اپنی معیشت، اپنا قومی وقار گروی رکھ دیا۔ ان تمام جرائم کے چھینٹے حکومت ہی کے گریبان پر ہیں۔

فہم قرآن

دنیا میں قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور اسی مناسبت سے نام "قرآن" ہے، یعنی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب۔ کروڑوں انسان صرف ناظرہ پڑھنے والے ہیں، جو لوگ دوسری زبان کے ہیں وہ بھی اس کو کلام الٰہی سمجھ کر عقیدت سے پڑھتے ہیں اور مشقت کے ساتھ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں، مگر اس عمل کو عبادت جان کر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کو یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں، رمضان کے مبارک مہینوں میں دنیا کے ہر خطے میں رات کی تراویح میں حفاظ اس کو دل بستگی اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور کروڑوں لوگ دل بستگی اور خوش عقیدگی کے ساتھ سنتے ہیں، لاکھوں ایسے ہیں جو اس کی مختلف تفسیریں پڑھتے ہیں، اس کے الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں فکر وتدبر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کے علوم و معارف میں غرق رہتے ہیں، کروڑوں ہیں جو اس کو خوش الحانی اور ترتیل و تجوید سے پڑھتے ہیں غرض دنیا کے گوشے گوشے میں قرآن حکیم کے پڑھنے کا جو اہتمام ہوتا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب کا نہیں ہوتا۔

قرآن پڑھنے پڑھانے کی بات جب کی جاتی ہے تو اصلاً اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ سمجھ کر پڑھا پڑھایا۔ اس لیے کہ یہ محض وظیفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت اور احکام کی کتاب ہے اور یہ اسی لیے نازل ہوئی ہے کہ لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں ان پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کر کے اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں یہ بات ان تعلیمات اور احکام کو سمجھے بغیر ممکن نہیں، البتہ ایک بات نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ قطعی طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کو یہ امتیازی مقام حاصل ہے کہ محض اس کے الفاظ کو دہرانا اور بغیر سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث ثواب ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو بغیر سمجھے پڑھنا لاحاصل ہے یا یہ کہتے ہیں کہ محض الفاظ دہرانے سے بہتر ہے کہ آدمی کسی زبان میں ترجمہ ہی پڑھ لے۔ قطعاً غلط اور گمراہ کن طرز فکر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کو بے سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اور یہ کوئی خود تراشیدہ دعویٰ

نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسول صادق و امین کا صاف صاف ارشاد ہے: عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" : جس نے اللہ کی کتاب میں سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور نیکی کا اجر دس گنا ہوا کرتا ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم صرف ایک حرف ہے بلکہ الف ایک الگ حرف ہے، لام ایک الگ حرف ہے اور میم ایک الگ حرف ہے۔" (ترمذی' کتاب الفضائل القرآن باب ۶۱' ص ۴۴۹۱)

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت سمجھانے کے لیے کہ بے سوچے سمجھے قرآن پڑھنے کا بھی اجر و ثواب ہے، نہایت واضح اور قطعی مثال کا انتخاب فرمایا۔آپ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کے لیے یعلمون تعلمون اور علیم و خبیر جیسے الفاظ منتخب نہیں فرمائے۔ اس لیے کہ ان کا مفہوم عام ہے۔ آپ نے حروف مقطعات کا انتخاب فرمایا جن کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کا مفہوم اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور پھر آپ نے الم کا انتخاب فرما کر اس کے بھی الگ الگ حرف کرکے بتایا کہ الف کا الگ اجر ہے اور لام کا الگ اجر ہے اور میم کا الگ اجر ہے کہ اگر حروف کا کوئی مفہوم متعین کرے، تو اس کے الگ الگ حرفوں کا مفہوم اور مطلب متعین کرنے اور اس کی طرف کسی کا ذہن بھی منتقل نہ ہو گا اور اس طرح آپ نے یہ حقیقت قطعی طور پر ذہن نشیں کرائی کہ بے سمجھے پڑھنا بھی اجر و ثواب کا کام ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کے کلام کو جو عظمت و تقدس حاصل ہے۔ اور اس میں تسخیر و تاثیر کی جو قوت ہے۔ ایمان کو گرمانے' روح کو بالیدگی بخشنے اور آنکھوں کو نمناک کرنے کی جو کیفیت ہے۔ وہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ اور محفوظ کتاب ہے۔ قرآن کا آغاز ہی اس حقیقت سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے ،اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کے الفاظ ہیں۔ کسی زبان میں اس کا ترجمہ ان الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ اور تفسیر ان الفاظ کے مفہوم و معانی سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور بس وہ کلام الٰہی کا بدل نہیں ہیں۔

اس تصور کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے قوانین اور احکام نازل کیے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی ہے کہ مسلمان اس کتابِ ہدایت کے مطابق اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی گزاریں یہ الٰہی قوانین اور تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ یہ نازل ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اس کی ہدایات پر غور وتدبر کیا جائے اور اس کے مطابق ہر طرح کے حالات میں زندگی گزاری جائے۔ امت نہ صرف یہ کہ اس روشنی میں عزت و سربلندی کی زندگی گزارے بلکہ دنیا والوں کو اس سے روشناس کرائے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آمادہ کرے۔ یہ امت کا منصبی فریضہ ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو عام کرے ہر دور کے انسانوں کو سمجھائے۔ ظاہر ہے امت یہ منصبی فریضہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے اور اس ہدایت نامے کی روشنی میں زندگی گزارنے کا حق ادا کر سکتی ہے، جب وہ اپنے اندر اس میں غور و فکر کی عادت ڈالے، اس کے احکام کی روح کو سمجھے، ہر طرح کے سرد و گرم حالات پر اس کو منطبق کرے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا پختہ فیصلہ کرے۔ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نزول کا یہی مقصد بتایا ہے۔ ”یہ کتاب مبارک ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور وتدبر کریں اور اہل عقل اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کریں۔“ (ص ۸۳)

امت نے اس قرآن کے ساتھ یہ نہایت غلط سلوک اور انتہائی زیادتی کی ہے کہ اس کو سمجھنے سمجھانے میں غور وتدبر کرنے اور اس کے احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت بڑی حد تک ختم کر دی ہے۔ حالانکہ قرآن نے بار بار اس کی ہدایت فرمائی ہے، یہی اس کا مقصد نزول بتایا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز سے اس کی ترغیب دی، اس کے مواقع پیدا فرمائے اور مجلسوں میں اس طرح کے سوالات ابھارے کہ لوگوں میں قرآن

پاک پر غور و فکر کا جذبہ ابھرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں، اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں اور باہم اس کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کریں تو ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے۔ رحمت الٰہی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ ان کا تذکرہ اپنے پاس کے لوگوں میں کرتا ہے۔

(ابو داؤد، کتاب الوتر، باب ۱۴ فی ثواب قراءۃ القرآن ص ۱۳۳۱)

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ قرآن پاک کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کا معنٰی اور مفہوم کو سمجھیں اور پھر اس کے مطابق دنیا میں زندگی گزارنے کی کوشش کریں، اسی میں کامیابی مضمر ہے۔

قرآن سے گہرا تعلق

امام عبد اللہ ابن مبارکؒ اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محدث ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ہیں اس کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ہے جس کو بہاء الدین (م: ۸۵۰) نے اپنی معروف کتاب المستطرف (۱/۶۷-۶۴) میں ذکر کیا ہے، کہ آپ ایک بار حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، واپسی پر راستہ میں ایک جگہ دور سے کوئی چیز نظر آئی، قریب پہنچے، اور پہچانا، تو دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو ادنیٰ کرتے اور ادنی دوپٹے میں ملبوس ہیں، امام عبد اللہ بن مبارک نے سلام کیا، خاتون نے سلام کا جواب ایک قرآنی فقرہ سے دیا: سلام قولا من رب رحیم (یٰس : ۵۸) سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے ارشاد ہے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا؛ یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟ کہنے لگیں: من یضلل اللہ فلا ھادی لہ (الاعراف: ۱۸۶) جسے اللہ راستہ نہ دکھائے، اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔ یعنی یہ راستہ بھٹک گئی ہیں، ابن مبارکؒ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے۔ کہنے لگیں: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (الاسراء : ۱) یعنی یہ حج کر چکی ہیں اور بیت المقدس کا ارادہ ہے، ابن مبارکؒ نے استفسار کیا کہ کتنے دنوں سے آپ اس مقام پر پڑی ہوئی ہیں؟ خاتون نے کہا: ثلاث لیال سویا (مریم: ۱۰) یعنی مسلسل تین راتوں سے، ابن مبارکؒ نے کہا: آپ کے پاس کھانے کا کچھ سامان نہیں ہے؟ خاتون نے جواب دیا: ھو یطعمنی ویسقین (الشعراء : ۷۹) یعنی اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ وضو کس طرح کرتی ہیں جب کہ پانی بھی ساتھ نہیں ہے؟ فرمایا: فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا (النساء : ۴۳) یعنی قرآن کا حکم ہے کہ پانی نہ ملے تو تیمّم کیا کرو، اس پر عمل کرتی ہوں، امام ابن مبارکؒ نے کھانے کی پیش کش کی، تو کہنے لگی: ثم اتموا الصیام الی اللیل (البقرہ: ۱۸۷) یعنی میں روزہ کی حالت میں ہوں، ابن مبارکؒ نے کہا کہ یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ؟ فرمایا: ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم (البقرہ: ۱۵۸) یعنی جو یہ بطور نفل مزید عمل کرے تو اللہ تعالیٰ قدر داں ہے اور واقف ہے، ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ

سفر میں تو ویسے بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: وان تصومو خیرلکم ان کنتم تعلمون (البقرہ: ۱۸۴) یعنی روزہ رکھ لینا بہر حال بہتر ہے۔

امام عبد اللہ بن مبارکؒ کے حیرت و استعجاب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جاتا تھا، آپ نے دریافت کیا کہ جس طرح میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں آپ بھی اس طرح کیوں نہیں کرتیں؟ جواب ملا: ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (ق: ۸۵) یعنی جب بھی انسان کوئی بات کرتا ہے تو نگران فرشتہ اس پر موجود ہوتے ہیں، گویا بات خوب احتیاط اور تول کر کرنی چاہیے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا کہ آپ کا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟ فرمایا: ولا تقف ما لیس لك بہ علم (الاسراء: ۶۳) کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، گویا ابن مبارکؒ کے اس سوال پر بوڑھی خاتون نے ناگواری ظاہر کی، امام عبد اللہ نے معذرت کی، اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے، جواب ملا: لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم (یوسف: ۳۹) کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تم کو معاف کر دے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں: میں نے دریافت کیا کہ کیا میں آپ کو اپنی اونٹنی پر سوار کر دوں تا کہ آپ اپنے قافلہ سے جا ملیں، کہنے لگیں: وما تفعلو من خیر یعلمہ اللہ (البقرہ: ۱۹۷) جو بہتر کام کروگے اللہ اس سے واقف ہے۔ ابن مبارکؒ نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا تا کہ وہ سوار ہوں، کہنے لگیں: قل للمؤمنین یغضو من ابصارھم (النور: ۳۰) یعنی ابن مبارکؒ کو نگاہ پست کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا، چنانچہ آپ نے نگاہ پست کر لی اور کہا کہ سوار ہو جائیں، سوار ہونے لگیں تو اونٹنی بدک گئی، اور اس خاتون کا کچھ کپڑا پھٹ گیا تو قرآن کی آیت پڑھی: وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (الشوریٰ: ۳۰) یعنی جو بھی مصیبت انسان کو پہنچتی ہے وہ اپنی شامت اعمال کی وجہ سے، امام عبد اللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں، میں پہلے اونٹنی کو باندھ دوں، خاتون نے کہا: ففھمنا ھا سلیمان (الانبیا:۔۔۔) امام ابن مبارکؒ فرماتے ہیں: میں نے اونٹنی کو باندھ دیا اور ان سے کہا کہ سوار

ہو جائیں، جب سوار ہوئیں تو سواری کی دعا پڑھی جو قرآن مجید کی آیت ہے: سبحٰن الذی سخرلنا ھذا وما کنالہ مقرنین وانا الیٰ ربنا لمنقلبون (الزخرف: ۱۴،۱۳) اب سفر شروع ہوا، امام ابن مبارکؒ نے اونٹنی کی لگام تھامی، اور اونٹنی کو تیز ہنکانے کے لیے کسی قدر بلند آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھے، خاتون نے کہا: واقصد فی مشیک واغضض من صوتک (لقمان: ۱۹) یعنی رفتار معتدل رکھو اور آواز پست، ابن مبارکؒ نے آہستہ آہستہ ما تیسر من القرآن (مزمل: ۲۰) پڑھا کہ آپ کو بڑا خیر عطا کیا گیا ہے، کہنے لگیں: وما یذکر الا اولو الالباب (البقرہ: ۲۶۹) کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں، ابن مبارکؒ نے کچھ آگے بڑھنے کے بعد دریافت کیا کہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: یایھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیا ان تبد لکم تسؤکم (مائدہ)۔

اے ایمان والوں! ایسی چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو تم پر ظاہر کیا جائے تو تمھیں ناگواری ہو۔ یعنی اپنے بیوہ ہونے کی طرف اشارہ کی۔

امام ابن مبارکؒ نے پھر کوئی گفتگو نہیں کی۔ یہاں تک کہ قافلہ تک پہنچ گئے، پہنچنے کے بعد خاتون سے دریافت کیا کہ یہاں آپ کے کون لوگ ہیں؟ کہنے لگیں: المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا (الکہف: ۴۶) یعنی اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے بچے اور سامان اس قافلہ میں ہیں، میں نے دریافت کیا، حج میں ان کے بچے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگیں وعلٰمٰت وبالنجم ھم یھتدون (النحل: ۱۶) یعنی ان کے بچے حجاج کے قافلہ میں راستہ بتانے اور منزل کی رہنمائی کا کام کرنے پر مامور تھے۔ ابن مبارکؒ سواری خیموں تک لائے، اور استفسار کیا کہ یہ خیمے ہیں، آپ کے متعلقین کون ہیں؟ خاتون نے کہا: واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (النساء: ۱۲۵) وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (النساء: ۱۶۴) یا یحیٰ خذ الکتاب بقوۃ (مریم: ۱۲) یعنی ابراہیم موسیٰ اور

یحییٰ میرے بچوں کے نام ہیں، ابن مبارکؒ نے ان ہی ناموں سے ندا لگائی، کہ تین نوجوان چاند کی طرح روشن دوڑے آئے، اور جب بیٹھنے لگے تو ماں نے کہا:

فابعثوا احدکم بورقکم هذه الی المدینة فلنظر ایها ازکیٰ طعاما فلیاتکم برزق منه (الکهف: ۱۹) اپنے میں سے کسی کو یہ پیسے لے کر شہر بھیجو کہ وہ دیکھے کہ کون پاک و صاف کھانا فروخت کرنے والا ہے، پھر وہ تم لوگوں کے پاس کھانے کی چیز لے کر آئے، چنانچہ بچوں میں سے ایک بازار گیا، کھانے کی کچھ چیز خرید کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا کہنے لگیں: کلوا واشربوا بما اسلفتم فی الایام الخالیة (الحاقة: ۲۴) خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیوؤ، اس عمل کے بدلے جو تم نے پچھلے دنوں میں کیے ہیں۔

امام عبد اللہ ابن مبارکؒ نے ان خاتون کے صاحبزادوں سے کہا کہ جب تک تم ان خاتون کے بارے میں مجھے نہ بتاؤ میں کھانا نہیں کھا سکتا، لڑکوں نے کہا: یہ ہماری والدہ ہیں، چالیس سال کے عرصہ سے انھوں نے سوائے قرآن کے کوئی اور کلام اپنی زبان سے نہیں نکالا کہ کہیں اپنی طرف سے بولنے میں کچھ زیادتی ہو جائے اور اللہ ناراض ہو جائے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جسے چاہیں عطا فرمائیں، اور اللہ یقیناً بڑے فضل والے ہیں ذلك فضل الله یوتیه من یشآء والله ذو الفضل العظیم (الجمعة: ۴) یہ واقعہ نشان عبرت اور حرف موعظت ہے کہ معمولی خاتون کو بھی قرآن سے کیسی مناسبت ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا کیسا اعلیٰ درجے کا ذوق حاصل ہوتا تھا، کاش ہم یہ اور اس طرح کے عبرت خیز واقعات کو اپنے لیے آئینہ بنائیں، اور اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں کہ قرآن مجید سے ہمارا کیا تعلق ہے؟

رشوت اور ہمارا معاشرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن برائیوں پر لعنت فرمائی ہے ان میں ایک رشوت کا لین دین بھی ہے، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، (ابو داؤد: ۳۵۸۰، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۳۴) اور سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رشوت کے معاملہ میں جو دلال ہو یعنی جس نے دینے والے اور لینے والے کے درمیان واسطہ کا کام کیا ہے، اس پر بھی لعنت ہو، لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الراشی والمرتشی والرائش (مجمع الزوائد: ۱۹۸/۴) سیدنا عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رشوت لینے والا اور دینے والا جہنمی ہے، الراشی والمرتشی فی النار (مجمع الزوائد: ۱۹۹/۴) سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ فیصلہ میں رشوت کا لین دین تو کفر ہے اور لوگوں کے درمیان رشوت ستانی "سحت" یعنی حرام کا کمانا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کلکم راع و کلم مسؤل عن رعیتہ، یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے، اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں وہ ان کے برے میں جواب دہ بھی ہے، اس لیے جو لوگ کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں، اور کوئی منصب ان سے متعلق ہو، ان کی زندگی کو زیادہ محتاط اور ان کے دامنِ عمل کو زیادہ پاک و صاف ہونا چاہیے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری محصلین کو دیے جانے والے ہدیہ کو مالِ حرام قرار دیا، (مجمع الزوائد: ۴/۲۲۰)

اسی بنا پر فقہانے صراحت کی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا جائے یا کسی اور سرکاری عہدہ پر فائز کیا جائے، تو اسے ایسے لوگوں سے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، جو اس سے پہلے اسے تحائف پیش نہیں کیا کرتے تھے، یا پہلے کم یا معمولی تحفے دیتے تھے اور اب ان کے تحائف کی مقدار اور معیار میں اضافہ ہو گیا ہو، کیونکہ تحفہ اپنے مقصد و منشا کے اعتبار سے رشوت ہوا کرتا ہے، اور

اس طرح خوبصورت ناموں کا غلاف چڑھا کر ایک ناپاک اور خبیث شے کا لین دین عمل میں آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بحیثیتِ پیغمبر، انسانی نفسیات سے سب سے زیادہ باخبر اور حقیقت آگاہ تھے، آپ نے نہایت دقت نظر سے اس چھپی ہوئی انسانی بیماری کو شناخت فرمایا، اور اس کے سدِ باب کے لیے یہ علاج تجویز کیا کہ سرکاری عہدیدار رہتے ہوئے لوگ اسے جو کچھ دیں، وہ اسے بیت المال میں داخل کر دے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ امیہ نامی قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو وصولی زکوٰۃ پر عامل بنایا، جب وہ صاحب واپس آئے تو عرض کیا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ کیا ہے۔ ھذا لکم و ھذا لی، آپ کو اس سے بہت ناگواری ہوئی، منبر اقدس پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے ہیں تو یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ آنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ تمھارا ہے اور یہ میرا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے، کہ اسے ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟ (بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۷۴) ایک موقع پر خاص اہتمام سے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص میری جانب سے خدمت پر مامور ہو، اور وہ ہم سے ایک دھاگہ بھی چھپائے، تو وہ حرام ہے، جسے وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا۔

(ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۸۵۳)

گویا حکمرانوں، ذمہ داروں اور عہدیداروں کو مال کے معاملہ میں زیادہ محتاط کردار ادا کرنا ہے، کیونکہ کسی عہدہ پر فائز کیا جانا اس پر کامل درجہ اعتماد اور اس کی دیانت پر پورے بھروسا کی دلیل ہے۔ اگر وہی بے راہ روی کی راہ اختیار کرلے، اور خیانت کا ارتکاب کر بیٹھے، تو دوسروں پر کیا اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس احتیاط کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی سرمایہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ پوری قوم کے مفادات کا محافظ اور چوکیدار ہوتا ہے اور اس پر جرم کرنے اور دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات اور اسلام کی ان تعلیمات کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایوان اقتدار میں رشوت ستانی ور حریص سیاست دانوں کی قوم سے غداری کے واقعات منظرِ عام پر آتے ہیں۔

رشوت کی وجہ سے باصلاحیت لوگ محروم کر دیے جاتے ہیں، اور بے صلاحیت اور نا اہل لوگ ذمہ دار بنائے جاتے ہیں، اور اس سے پورے سماج کو نقصان پہونچتا ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک طالب علم نے نا اہلی کے باوجود رشوت دے کر ٹسٹ پاس کیا اور شعبۂ طب میں داخلہ لے لیا، پھر اسی طرح میڈیکل تعلیم مکمل کی، اس کے بعد اسی سہارے ملازمت حاصل کی، اور ترقی کی منزلیں طے کی، اب یہ نا اہلی کتنے مریضوں کو صحت کے بجائے موت سے ہم کنار کرے گی، اس نقصان کا اصل سِر رشوت ہی سے ملتا ہے، آج کل تو دفاع جیسے حساس اور اہم شعبہ میں بھی رشوت کا بازار گرم ہو گیا ہے، جس کے نقصان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، دفاع سے ملک کی سلامتی اور اس کا تحفظ متعلق ہے، اگر رشوت کی بنیاد پر غیر مفید ہتھیار خریدے گئے، تو خطرات کے مواقع پر کیسے ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں گے، اس لیے رشوت افراد واشخاص، معاشرہ و سماج اور قوم و ملک ہر ایک کے لیے نہایت ہی نقصان دہ اور خطرناک عمل ہے۔ رشوت معاشرہ میں ظلم و ناانصافی کو تقویت پہونچاتی ہے۔

شاید ہی کوئی شخص ہو، جو رشوت کی برائی کا معترف نہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہماری زندگی کا کوئی شعبہ رشوت ستانی سے خالی نہیں، اس نے باصلاحیت لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کریں، ہنر سیکھیں اور اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا کر لوگوں کی خدمت کریں، اور کسی بھی شعبہ میں بے صلاحیت اور کم صلاحیت عہدہ داران اور کارکنان کی بھرمار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ سرکاری اسکولوں اور ہسپتالوں وغیرہ سے مایوس ہو گئے ہیں، اور کارکنوں کی نا اہلی اور فرض نا شناشی کی وجہ سے دنوں میں ہونے والے کام مہینوں میں بھی انجام نہیں پاتے۔ رشوت کو کسی بھی مذہب میں پسند نہیں کیا گیا ہے، اسلام کی نگاہ میں رشوت نہایت ہی قابل نفرت عمل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اپنے مال آپس میں باطل طریقہ پر نہ کھاؤ اور مال حکام کے پاس نہ لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم اس سے واقف ہو۔ (البقرۃ: ۸۸۱)

اس آیت میں خاص طور پر عدالت کی رشوت ستانی کی مذمت فرمائی گئی ہے، کیوں کہ عدالت کا کام ہی انصاف قائم کرنا اور ظلم کو روکنا ہے، اگر یہ ادارۂ انصاف خود رشوت کی بنیاد پر ظلم و ناانصافی پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس سے زیادہ بد بختی کی بات اور کیا ہو گی، نمک اس لیے ہے کہ کھانے کے ذائقہ کو درست کرے، لیکن اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو اس کا مداوا کیوں کر ہو سکے گا؟ شکر اس لیے ہے کہ بے مزہ چیزوں کو حلاوت بخشے، لیکن اگر شکر ہی میں حلاوت باقی نہ رہے، تو کہاں سے مٹھاس حاصل ہو گی؟ یہی حال عدالت اور انصاف کے اداروں کا ہے، اس لیے سب سے زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ترین صورت محکمۂ انصاف کا رشوت میں مبتلا ہونا، یا اس کو رشوت میں مبتلا رکھنا ہے۔

رشوت میں مبتلا افراد اپنے لیے جواز کے مختلف قسم کے حیلوں، بہانوں اور مختلف قسم اعذار کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ اوپر کی آمدنی کے بغیر زندگی گذر ہی نہیں سکتی، لیکن یہ محض اپنے آپ اور اپنے خدا کے ساتھ دھوکہ ہے، بہت سے لوگوں کی آمدنی آپ سے کہیں معمولی اور حقیر ہے، لیکن انھوں نے اپنا دامن حرام سے بچا رکھا ہے، اگر کوئی اور مثال ملنی دشوار ہو تو ان مولویوں ہی کو دیکھ لیا جائے، جو مساجد اور مدارس میں مصروف خدمت ہیں، اور جن کو بہت سے لوگ نشۂ دولت میں مخمور ہو کر اپنی کم نگاہی کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں، ان کی آمدنی کس قدر کم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ حلال پر قناعت کے ساتھ خوش پوشی اور بے فکری کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ جب سارا زمانہ اس برائی میں ملوث ہے تو ایک ہمارے احتیاط کرنے سے کیا انقلاب آ جائے گا؟ یہ محض ”عذر گناہ بدتر از گناہ“ ہے، اگر کسی انسان کے جسم میں دس زخم ہوں، تو کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ جسم کو جو تھوڑا حصہ باقی ہے، اسے بھی

زخمی کر دیا جائے اگر کوئی خوشحال جھونپڑپٹی میں تنگ دستوں کے درمیان پہنچ جائے، تو کیا یہ خیال آتا ہے کہ جب اتنے سارے لوگ غریب ہیں، تو میں بھی غریب ہو جاؤں اور اپنی دولت سمندر میں ڈال آؤں، یا لوگوں میں لٹا دوں؟ جو چیزیں مادی اعتبار سے کراہت و ناپسندیدگی کی ہیں، ان کے بارے میں ہماری سوچ یہ نہیں ہوتی، تو روحانی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات و منہیات میں ہم کیسے ایسے خیال خام کو دخل دے سکتے ہیں، اور کیا خدائے سمیع و بصیر جو دلوں کے حال سے واقف ہے۔ ہمارے اس عذر کو قبول کرے گا؟

رشوت دراصل غریبوں، مظلوموں اور مجبوروں کا خون ہے، جسے رشوت خور پی کر لذت حاصل کرتے ہیں، یہ خون بہ ظاہر لذیذ اور لطف انگیز ہے، لیکن اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے دنیا میں آفتوں اور ابتلاؤں کو دعوت دینا ہے، اور آخرت میں عذاب الیم ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں بچنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یکساں نظام تعلیم

مسلم معاشرہ میں تمام مسلمان ایک وحدانی نظام تعلیم کے تحت بارہ صدیوں تک تمام دینی و دنیاوی علوم سیکھتے آئے ہیں۔1840ء میں انگریز استعمار کے برصغیر پر بڑھتے غلبہ کے بعد متعصب انگریز مفکر ،لارڈ تھامس میکالے نے سیاسی دھمکی کے بعد، ہندوستانی معاشرے میں الحادی نظام تعلیم کے مغربی سکول و کالج قائم کئے اور آغازِ اسلام سے چلے آنے والے مدارس ومکاتب کے ذرائع آمدن اور اوقاف پر قبضہ کرنے کے بعد،ان کی اسناد کو غیر معتبر، ملازمتوں کے دروازے بند اور معاشرے میں ان کے خلاف پروپیگنڈا کا آغاز کر دیا۔ حاکم کی زبان ہونے کی وجہ سے ،انگریزی، کو نظام تعلیم کا محور بنادیا گیا۔

برطانوی حکومت نے اپنے ملحدانہ عقائد کے تحت جب سرکاری جبر استعمال کرتے ہوئے سیکولر نظام تعلیم جاری کیا تو علمائے کرام نے دینی علوم کے تحفظ کے لئے قربانی کے جذبے کے تحت دینی مدارس بنائے اور نہیں مستحکم کئے۔اس طرح انگریز سرکار کے دباؤ کے نتیجے میں مسلم معاشرہ دنیاوی اور دینی، دو نظام ہائے تعلیم کا شکار ہو گیا اور معاشرے میں مسٹر اور ملا کے دو طبقات قائم کر کے ان کو انگریز نے باہم متحارب کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ انگریز دور کے جبر و ظلم کا خاتمہ کر کے دوبارہ مسلمانوں کے درخشندہ ماضی کی طرح ایک مرکزی واحد نظام تعلیم کا احیا کیا جاتا، جس میں ثانوی، سکول کے درجہ تک قوم کے تمام بچے قرآن وسنت اور ان کی روشنی میں سائنسی اور سماجی علوم کو سیکھتے جیسا کہ آج بھی سعودی عرب کے مثالی نظام تعلیم کا یہی بنیادی ڈھانچہ ہے۔ لیکن افسوس کہ 70 سال تک پاکستانی حکمران انگریز استعمار کی پالیسی پر ہی کاربند رہے۔

پاکستانی معاشرے میں وحدانیت قائم کرنے اور بچت کرنے کا ایک موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ ملک بھر میں پھیلی مساجد میں ""مسجد مکتب سکول کا آغاز کیا جائے۔ ائمہ مساجد اور خطبا کو خواندگی، بنیادی عقائد واحکام اور ضروری حساب وغیرہ سکھانے پر مامور کیا جائے۔ جب تک معاشرہ مسٹر، ملا کی تقسیم سے نکل کر باہم متحد نہیں ہوتا، اس میں طاقت اور یکسوئی پیدا نہیں ہو سکتی،

قائدِ اعظم کا نعرہ اور مدینہ کی اسلامی ریاست کا حکومتی وعدہ پورا نہیں ہو سکتا۔ سکول کی سطح پر پوری قوم کا وہی ایک نظام تعلیم ہونا چاہیے جیسا کہ انگریز دور سے پہلے تھا۔

جب تک حکومت خالص اسلامی نظام تعلیم کا احیا نہیں کرتی، اس کے لئے بنیادی اقدامات بروے کار نہیں لاتی، اس وقت تک مدارس دینیہ کا موجودہ نظام نہ صرف ملک وملت کی ضرورت ہے بلکہ شرعاً اس کا تحفظ وفروغ واجب ہے۔ استعماری باقیات کو ختم کرنا ہوگا، پورے ملک کو اسلامی نظام تعلیم پر جمع کرنا ہوگا، بصورتِ دیگر قوم کو سامراجی نظام تعلیم پر جمع کرنے کی خواہش، نہ کبھی استعمار پوری کر سکا، اور نہ مستقبل میں ایسا ممکن ہے۔

اس وقت جو یکساں نظام تعلیم کی بحث چل نکلی ہے اس کا رخ مدارس کے نصاب و نظام کی طرف ہے، جب کہ در حقیقیت اس ملک کے ہر گلی کوچے میں کئی کئی سکولز ہیں، جن میں سے ہر ایک کا نصاب الگ نظام الگ، یونیفارم الگ فیس الگ، ضابطے اور قاعدے الگ اور ہر چیز ہی جدا ہے، ایسے میں تمام توپوں کا رخ صرف دینی مدارس کی طرف کر دینا سراسر ناانصافی ہے، سکول کالج اور اتنے سارے مختلف نظام ہائے تعلیم کی یکساں کرنے کی بات کیوں نہیں ہوتی۔

دینی مدارس نے ہمیشہ یہ پیشکش ہی نہیں بلکہ مطالبہ کیا ہے کہ مرحلہ وار یکساں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم رائج کیا جائے اور ابتدائی طور پر میٹرک تک پورے ملک میں ایک نصاب اور ایک نظام لایا جائے تاکہ پوری قوم یکسو ہو سکے، دین مدارس کے تمام وفاق آج بھی نہ صرف اپنے موقف پر قائم ہیں بلکہ اکثر دینی مدارس میں قومی نصاب تعلیم رائج ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں بات زیرو سے شروع نہیں کی جاتی جو غیر سنجیدگی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت بھی جیسے یکساں نصاب تعلیم کا شوشہ ہی مدارس کے نظام اور نصاب کا حلیہ مسخ کرنے کے لئے چھوڑا گیا ہے۔

میٹرک یا زیادہ سے زیادہ انٹر تک یکساں نصاب و نظام کی ضرورت ہے اس کے بعد تو اسپیشلائزیشن کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ جو بچیاں، بچے ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں وہ میڈیکل کالجز میں، جو وکلا اور جج بننا چاہتے ہیں وہ لاء کالجز میں اور جو دینی خدمات کی بنیادی اور اہم ترین ذمہ داری نبھانا چاہتے ہیں وہ مدارس دینیہ کا رخ کرتے ہیں، آج تک کسی نے لاء کالجز سے ڈاکٹر اور میڈیکل کالجز سے وکلا تیار کرنے کا مطالبہ نہیں کیا لیکن بدقسمتی سے دینی مدارس سے ہمیشہ یہ غیر منطقی اور غیر معقول مطالبہ

کیا جاتا ہے کہ دینی مدارس سے ڈاکٹر اور انجینئر کیوں پیدا نہیں ہوتے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ایسا مطالبہ کرنے والوں کو داد دینے والوں کی بھی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔

سکول اور مدرسہ کا نظام تعلیم الگ الگ ہے، یہ دونوں اور ان دونوں کے نصابوں کو اکٹھا ہونا چاہیے، بلکہ یہ دونوں نصاب اکٹھے تھے، 1857ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور مغل کے دور میں بھی اکٹھے تھے، دینی اور عصری تعلیم اکٹھی پڑھائی جاتی تھی۔ 1857ء کے بعد جب تاج برطانیہ نے یہاں کا نظام سنبھالا تو اس نظام کو ختم کر دیا اور دینی تعلیم کو نصاب سے خارج کر کے تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم انگریزوں نے کی ہے کہ جو نظام صدیوں سے چلا آ رہا تھا، اس کو ختم کر کے دینی تعلیم کو خارج کر دیا اور انگریزی عصری تعلیم پر بنیاد رکھی، چنانچہ دینی تعلیم کے جو علوم نکال دیے گئے تھے، دینی مدارس ان علوم کے تحفظ اور بقا کے لیے وجود میں آئے تھے اور الحمد للہ دینی مدارس کا یہ کردار ہے کہ وہ ان علوم کا تحفظ بھی کیے ہوئے ہیں، انھیں پڑھا بھی رہے ہیں اور ان کا ایک پورا نیٹ ورک ہے جو پورے جنوبی ایشیا میں کام کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ دونوں الگ الگ نہیں ہونے چاہیے تھے، یہ تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، یہ علیحدگی کی بات تو انگریزوں نے کی ہے۔ یہ دونوں تعلیم اکٹھے ہونے چاہیے لیکن امریکن ایجنڈے پر نہیں، ریڈ کارپوریشن کی رپورٹ پر نہیں، مغربی استعمار کے پروگرام پر نہیں بلکہ پاکستان کی قومی اور دینی ضرورت پر۔ سادہ سی بات ہے کہ جہاں سے تقسیم کر کے الگ الگ کیا تھا، اس سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلے جایئے۔ 1857ء سے پہلے کی یہاں کی تعلیمی نظام کی جو پوزیشن تھی، اس فارمولے اور اس فریم ورک کو قبول کر کے اس کا اعلان کر دیا جائے۔

کیسا نظام تعلیم

تعلیم انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشوونما کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک عمل ہے جس کے ذریعے ایک خام انسان، جس کی صلاحیتیں اور قابلیتیں ابھی ابتدائی مراحل میں ہوتی ہیں، کو مطلوبہ مقاصد کے مطابق ایک خاص روپ میں متشکل کیا جاتا ہے۔ یہ کردار و عمل سوچ اور عادات میں مناسب تبدیلیاں پیدا کر کے معاشرے کے مطلوب انسان کی تیاری کا ایک ذریعہ ہے۔

ہر معاشرے کی کچھ اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور نظریاتی بنیادیں ہوتی ہیں، انہی بنیادوں پر اس معاشرے کا تعلیمی نظام کھڑا ہوتا ہے اور ان بنیادوں سے تعلیمی مقاصد طے کیے جاتے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کی بنیاد پر نصاب تعلیم ترتیب دیا جاتا ہے، اس نصاب کی تدریس کے لیے ایک طریقہ تعلیم طے کیا جاتا ہے اور ان مقاصد کا جازہ لینے اور تعلیمی عمل کے بعد ان کے حصول کی مطلوب سطح کا اندازہ کرنے کے لیے جائزہ اور امتحان کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ہر معاشرے کی معاشرتی، سیاسی، معاشی اور فلسفیانہ بنیادیں جدا ہوتی ہیں لہٰذا ہر معاشرے کا مطلوب انسان بھی جدا ہوتا ہے، اس لیے ہر معاشرہ اپنی ضروریات، اپنے تقاضوں اور اپنے وسائل کے مطابق اپنا نظام تعلیم ترتیب دیتا ہے۔

دنیا کی ہر قوم اپنی ضروریات کے مطابق مطلوب انسان تیار کرتی ہے۔ وہ قوم جس کے تعلیمی مقاصد اغیار کے اشارے پر تیار ہوں وہ اپنی جڑیں خود اکھاڑ پھینکتی ہے اور معمولی ہوا کا جھونکا بھی اس کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اسلام میں علم و حکمت کا مرکز مسجد رہی ہے، اسلام کا پہلا مدرسہ ''صفہ'' مسجد نبویؐ کے اندر قائم ہو، اس اکیڈمی اور صفہ کے نظام تعلیم سے نکلنے والے افراد محمد عربی ﷺ کے شاگردِ خاص، سیاست و حکومت، سپہ گری و سپہ سالاری، سفارت و امارت، عدالت و امامت اور تفسیر و حدیث، فلسفہ و فقہ کے میدانوں پر چھا گئے اور پھر ان کے ذریعے اسلام کے پرچم چار دانگ عالم میں لہرانے لگے۔

علم ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے پھر سے قیادت وامامت کا تاج ملت اسلامیہ کے ہاتھ آسکتا ہے، لیکن اب تحقیق و تخلیق کے چشمے سوکھ گیے ہیں اور ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے بھی اہل مغرب کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ مغرب کی بے خدا تعلیم نے انسان کو روبوٹ ،کمانے والی مشین اور معاشی جانور بنادیا۔ اب انسانیت تڑپ رہی ہے،انسان انسان کو کھا رہا ہے، معاشی جنگ تمام اخلاقی حدود کو عبور کر چکی ہے۔ صرف اسی انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے جو معاشی طور پر مضبوط ہے۔ دنیا طبقات میں بٹ چکی ہے ،ایک طبقہ غربت وافلاس کے جال میں تڑپ تڑپ کر موت کے گھاٹ اتر رہا ہے جبکہ ایک طبقہ عیش وآرام کی زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔

علم اب اقوام کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہتھیار کا کام کر رہا ہے، جو قوم علم کے میدان میں آگے ہے وہ معاشی برتری کی حامل ہے اور صرف اسی کو جینے کا حق حاصل ہے۔ اب کسی قوم کو کچلنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے نظام تعلیم کو اپنی مرضی کے تحت ڈھال لو۔ اسی طرح وہ قوم اپنے اداروں سے اپنے ہی دشمن تیار کرے گی، اپنے وسائل لگا کر قرض اٹھا کر خود اپنے ہی ہاتھ سے اپنی تباہی کا سامان کرے گی اور اسے احساس زیاں تک نہ ہو گا۔

اقبال نے اسی لیے کہا تھا۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی

موسیقی وصورت گری وعلم نباتات

ہمارے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کو بے مقصد کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا گیا۔ آج تک ہم یہ طے نہ کر سکے کہ ہمارے مقاصد تعلیم کیا ہیں۔ ہمارے سامنے کس طرح کے افراد مطلوب ہیں، ہمارا مطلوب انسان کون ہے۔ انگریزوں نے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد کے لیے ایک نظام تعلیم یہاں دیا جس کا مقصد نچلے درجے کے کارکن (ملازم اور بابو) پیدا کرنا تھا، ہم نے پاکستان بننے کے بعد اسی نظام تعلیم کو اپنے اوپر لاگو کر لیا۔ البتہ لیڈرز بنانے کے لیے اعلیٰ طبقات نے ایسے ادارے قائم کر لیے جہاں عوام الناس کے بچوں کی رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اعلیٰ پائے کے اداروں کا ہونا قابل مذمت نہیں ہے، یہ قوم کی ضرورت ہے لیکن ان اداروں میں داخلہ

کا طریقہ کار اور ان کے اخراجات کا انداز ایسا ہے کہ مخصوص طبقات کے لیے یہ ادارے مختص ہو کر رہ گیے جبکہ نچلے طبقے کے افراد کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو ان اداروں میں داخل کرواسکے، چاہے ان کے بچے کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں۔

ایک قوم کا نظام تعلیم مشترک ہونا چاہیے اور مشترک ہوتا ہے۔ان کا نصاب اور ذریعہ تعلیم (Meduim of Instruction) ایک ہوتا ہے۔اس طرح مقاصد تعلیم بھی ایک ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں نہ تو نصاب تعلیم ایک ہے، نہ نظام تعلیم ایک ہے اور نہ ذریعہ تعلیم ایک ۔ مدارس و مکاتب کا نصاب و نظام الگ، انگلش وار دو میڈیم کا نصاب الگ، اولیول کے اداروں کا نظام و نصاب تعلیم الگ، بلکہ اب اگر ایک گلی میں دس سکول ہیں تو دس سکولوں کا نصاب الگ الگ ہے۔ایک علاقہ سے دس قسم کے طلباء نکل رہے ہیں۔

پھر ہم قومی یک جہتی کے نہ ہونے کا گلہ کرتے ہیں۔دنیا کے کسی ملک نے غیر ملکی زبان کو اختیار کرتے ہوئے ترقی نہیں کی، جاپان ہو یا چین، فرانس ہو یا جرمنی سب نے اپنی اپنی قومی زبانوں کو اولیت دے کر ہی ترقی کی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے تعلیمی زبان بھی غیروں کا اختیار کیا ہے۔

ایسی تعلیم جو دینی اور نظریاتی ضرورت پورا نہ کرسکے، جو زندگی کے مسائل کو حل نہ کرے سکے، معاشرے میں اتحاد واتفاق نہ پیدا کرسکے، معاشرے کو مطلوب افراد مہیا نہ کرسکے۔بلکہ افراتفری، تقسیم در تقسیم معاشی و معاشرتی ناہمواری، بے روزگاری اور محتاجی کا باعث ہو،اس پر وسائل کا ضیاع، مسائل میں مزید اضافے کا ہی سبب بن سکتا ہے۔اس سے بہتر ہے کہ قوم کو جاہل ہی رہنے دیا جائے کیونکہ بقول شاعر

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا

کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

مجدد اور تجدید واحیائے دین

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب دین کی تعلیمات مٹ جاتی ہیں یا ان میں باطل کی آمیزش کر دی جاتی ہے یا دین کو اپنی خواہشات کے تابع بنا دیا جاتا ہے، بدعات و منکرات اہل دین میں نفوذ کر جاتی ہیں، دین کا روشن چہرہ دھندلانے لگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ پردہ غیب سے ایسے اشخاص کو غیر معمولی علمی و فکری صلاحیتوں، قوت عملی اور جذبہ صادق سے فیض یاب کر کے ظاہر فرماتا ہے۔ جو دین کی تعلیمات کو باطل کی پر آمیزش سے پاک و صاف کر کے اپنی اصل پاکیزہ شکل میں دوبارہ پیش کرتا ہے۔

اسی کو تجدید واحیائے دین کہتے ہیں اور اُس شخص کو مجدد کہتے ہیں۔ وہ مجدد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دین کے حوالے سے انقلابی کارنامہ انجام دیتا ہے۔ اہل علم مجدد کو ان کی تجدیدی کاموں کے سبب جان لیتے ہیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ مجدد سنت کو بدعت سے ممتاز کرنا، علم کو فروغ دینا اور اہل علم کو عزت سے سرفراز کرتا ہے، بدعت کو جڑ سے اکھیڑ کر اہل بدعت کی سازشوں کو توڑ دیتا ہے۔ مجدد کے لیے شخص واحد کا ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ جماعت مل کر بھی تجدیدی کام انجام دے سکتی ہے۔ مجدد کا اپنے عہد کے لوگوں سے تقابل ہوگا نہ کہ قرنِ اول سے لے کر آخر تک (مرقات: ۱/۳۲۲)

لہٰذا ایک وقت میں مختلف خطوں میں ایک سے زائد مجدد اور الگ الگ میدانوں اور شعبوں میں الگ الگ مجدد ہونا بعید از امکان بھی نہیں ہے۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین مجدد کا نام منصوص نہیں ہوتا اس لیے اگر کوئی کسی مجدد سے انکار کرے تو اُس پر کوئی فتویٰ بھی صادر نہیں کیا جاتا۔ مجدد نبی اور رسول کی طرح منصوص و متعین نہیں ہوتا لہٰذا اس کی اس حیثیت سے انکار کفر بھی نہیں قرار پاتا۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایسے شخص کو مبعوث فرمائے گا جو اُس کے دین کی تجدید کا فریضہ انجام دے گا (ابوداؤد)

تجدید و تجدد میں فرق:

تجدید اور تجدد میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ تجدید، دین کو اپنی اصل شکل میں پیش کرنا ہے اور تجدد سے مراد دین کو اپنے باطل افکار اور خواہشات کے تابع بنانا ہے۔

عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدد کو مجدد اور ہر تجدد کو تجدید کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو نیا طریقہ نکالے اور اسے ذرا زور سے چلادے وہ مجدد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو بر سر انحطاط دیکھ کر اسے دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانے کی بر سر عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام اور جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کر اس قوم کو پوری جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، انھیں مجدد کے خطاب سے نوازا دیا جاتا ہے حالانکہ وہ مجدد نہیں متجدد ہوتے ہیں اور ان کا کام تجدید نہیں تجدد ہوتا ہے۔

تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں اور نہ اسلام اور جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے چھانٹ کر الگ کیا جائے اور کسی نہ کسی حد تک اسے اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدد جاہلیت کے مقابلے میں سخت غیر مصالحت پسند ہوتا ہے اور کسی خفیف سے خفیف جزء میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔

منظّم دعوت

دعوت اور تبلیغ کے دو طریقے ہیں۔ ایک منظّم اور جماعتی شکل میں اور دوسرا بغیر جماعت اور غیر منظّم یہ دونوں طریقے نتائج کے اعتبار سے یکساں نہیں بلکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ایک داعی اگرچہ وسیع پیمانے پر درس قرآن کا سلسلہ جاری کیے ہوئے، توحید وسنت کی دعوت و تبلیغ کر رہا ہو اور اقامت دین کے لیے کوشاں ہو لیکن وہ اپنے اس کام اور متعلقہ افراد کو تنظیمی اور جماعتی شکل نہیں دے رہا بلکہ اس کی تبلیغ ودعوت منتشر اور متفرق ہو۔اس طرز دعوت سے اگرچہ وہ اپنی مسئولیتِ تبلیغ سے سبک دوش تو ہو جائے گا اور آخرت میں اسے بشرطِ اخلاص اجر بھی ان شاء اللہ مل جائے گا، لیکن یہ حکیمانہ اور مبصرانہ دعوت و تبلیغ نہیں اور نہ کبھی وہ اس طرز تبلیغ کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکے گا جو ایک صالح انقلاب اور ایک بہتر تبدیلی کے لیے پیش خیمہ ہوتا ہے۔اس کی بجائے محدود پیمانے پر مستقل، مسلسل جبکہ جماعتی شکل اور منظّم طرز پر دعوت و تبلیغ زیادہ حکیمانہ، زیادہ مفید اور زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے اور انقلاب اسی طرز دعوت سے آتا ہے۔اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے زمین میں بیج اور تخم بونے کی مثال زیادہ مفید ہے، دعوت و تبلیغ دراصل ایک قسم کی تخم ریزی اور بیج بونا ہے۔

تخم ریزی اور بیج بونے کی دو صورتیں ہوتی ہے۔ایک صورت تخم ریزی کی وہ ہے جو تجربے اور سائنس سے ثابت ہے کہ وہ ہواؤں، جانوروں اور پرندوں کے ذریعے سے انجام پاتی ہے۔ ہوا، جانور اور پرندے بیج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں جس سے ہر طرح کے بیج ہر طرف زمین میں پھیل جاتے ہیں اور منتشر طور پر قسماقسم درخت از خود اُگ آتے ہیں۔اس تخم ریزی کی پیداوار میں کوئی نظم نہیں ہوتا، نہ کوئی مستقل فصل ہوتی ہے، نہ اس کی کوئی باقاعدہ فصل کاٹی جاتی ہے اور نہ اس قسم کی پیداوار سے لوگوں کو وافر مقدار میں پھل پھول ملتے ہیں۔

دوسری قسم تخم ریزی اور بیج بونا وہ ہے جو ایک کسان ایک خاص طریقے سے کرتا ہے۔ وہ ایک ہی زمین پر مسلسل محنت کرکے اسے تیار کرتا ہے، پھر ایک منصوبے کے مطابق اس

میں بیج ڈالتا ہے، اسے پانی دیتا ہے اور اس کی خبر گیری کرتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ ویسی ہی فصل تیار ہو جاتی ہے جیسی اُس کو مطلوب ہوتی ہے۔ ایسی فصل کی باقاعدہ کٹائی ہوتی ہے لوگوں کو اس سے پھول، پھل اور غلہ ملتا ہے۔

الغرض داعی کو چاہیے کہ اپنی دعوتی تخم ریزی میں ہواؤں اور پرندوں کا سا غیر منظّم طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ کسان کی طرح ایک منصوبے اور مسلسل محنت والا منظّم طریقہ اختیار کریں۔اکثر داعی اور تحریکی کام کرنے والے توحید وسنت کا مسئلہ بیان تو کرتے ہیں، دعوت کا کام کرتے رہتے ہیں، قرآن کا درس بھی دیتے ہیں، اقامت دین کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں، لیکن اُن کے دروس میں تنظیمی حوالے سے ذہن سازی نہیں ہوتی ۔ جماعت کی اہمیت، شوریٰ کی ضرورت، اطاعت امیر پر بات نہیں ہوتی، وہ اپنے شاگردوں، متعلقین اور افراد کو تنظیم کی لڑی میں نہیں پروتے اور نہ انھیں داعی بناتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے عقائد واعمال کا اصلاح اور فکر کی تعمیر تو ہو جاتی ہیں لیکن وہ آگے دعوت واقامت کا کام نہیں کرتے اور اگر دعوت کا کام کرتے بھی ہوں تو اُسی طرح غیر منظّم طریقے پر، نظم سے آزاد جس سے وہ مطلوبہ نتیجہ اور ایک پائیدار انقلاب نہیں آتا۔ منظّم دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ ہر رکن اپنے قریبی ماحول میں سے ایک حلقے کو منتخب کرکے باقاعدہ اپنے چارج میں لے کر اور اس کے اندر دعوت اور درس قرآن کا مسلسل اور منظّم کام شروع کرے۔

پہلے وہ اساسی عقائد توحید وسنت اور اسلام کے بنیادی اصول، احکام اور اخلاق کی تفصیلات کی طرف بڑھے اور اس پر ایمان کی پختگی اور عمل کرنے کی تلقین کرتا رہے تاکہ ان کے اندر مکمل اعتقادی، اخلاقی اور عملی انقلاب رونما ہو جائے۔اپنے عملی برتاؤ اور اپنی ہدایات ونگرانی سے اس کام کو آگے چلاتے رہیں۔اس کے بعد انھی لوگوں کو خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی کم ہوں تنظیمی لڑی میں پروہ کر دوسرے لوگوں میں اس طرز کی کاشت کاری اور دعوت کے لیے استعمال کرنا شروع کرے اور اپنی نگرانی ورہنمائی میں ان سے کام لے اور اُن کو اپنی تربیت میں رکھے۔اس طرح دعوت کا یہ حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا اور علاقوں کے علاقے اللہ کی تابعداری اختیار کرتے جائیں گے۔لیکن اس کے لیے اصولِ دعوت، طریقہ دعوت کا جاننا اور حکیمانہ

ومبصرانہ دعوت کو اختیار کرنا ضروری ہے۔اس سے جو نتائج بھی حاصل ہوں گے پائیدار و دیرپا ہوں گے ،اور پھر یہ کاشت اضعافاً مضاعفہ کے تناسب سے پھیلتی چلی جائے گی۔

اس تناظر میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دروسِ قرآن بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو صرف ایک تقریر کی مانند عوام کو سنایا جاتا ہے یہ یک طرفہ عمل ہوتا ہے۔اس سے آخرت کے ثواب کے ساتھ کچھ چھوٹا موٹا کام تو ہو جاتا ہے، لیکن مکمل طور پر مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اور مخاطبین کو پوری طرح مشن سمجھ بھی نہیں آتا اور قلبی وذہنی طور پر وہ لوگ پوری طرح عملی طور پر مشن کا ساتھ بھی نہیں دیتے، جبکہ دوسری قسم درس وہ ہے جس میں تعلیم و تعلم کے طریقے پر دو طرفہ عمل ہوتا ہے۔استاد پڑھاتا ہے شاگرد اور عوام سیکھتے ہیں اُن کے سامنے قرآن پاک کا نسخہ یا کچھ نوٹ لینے کے لیے بیاض والا قرآن ہوتا ہے۔اُن پر سیکھنے سکھانے والی محنت ہوتی ہے، اُن کی مذکورہ بالا طریقے پر تربیت ہوتی ہے۔اس قسم درس سے مطلوبہ مقاصد بھی حاصل ہوتے ہیں اور وہ لوگ پوری طرح مشن اور اس فکر و دعوت کو سمجھ کر قلبی وذہنی طور پر مشن کے ساتھ عملی طور پر لگ جاتے ہیں بلکہ، خود اس کے داعی ومدعی بن جاتے ہیں۔لہٰذا ہمیں اس دوسرے طریقۂ درس اور دعوت کو اختیار کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض افراد دعوتی لحاظ سے زیادہ کامیاب ہیں اور بعض کم۔بعض کا کام موثر ہوتا ہے خواہ تھوڑا ہو اور بعض کا اتنا موثر نہیں ہوتا خواہ زیادہ ہو۔دعوت کا کام انفرادی و اجتماعی سطح پر استواء ہوتا ہے۔شخصیات اور تنظیمات دونوں میں قدرِ مشترک چونکہ داعیانہ کردار ہے۔تو اگر اس کردار کی جڑیں مضبوط ہوں تو دعوت کا کام شجرۂ سایہ دار کی طرح پھیلتا ہے۔اس کردار کی جڑیں مضبوط ہونا، دعوت کو موثر بنانے کے لیے ہے۔ہمارے نزدیک داعی میں مندرجہ ذیل خصوصیات کو تلاش کرنا اور پروان چڑھانا چاہیے۔

ذاتی انہماک:

بعض داعی افراد از خود متحرک، دعوتی درد رکھنے والے اور حق کو پھیلانے کے حریص ہوتے ہیں۔وہ کامیابی حاصل کرنے کیلیے بے تاب ہوتے ہیں۔کسی منزل کا تعین کر لیتے ہیں

اور پھر اس کے لیے شب و روز کوشش کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا انفرادی کام بھی ایک بڑی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ وہ دوسروں کو دیکھنے کی بجائے اور کسی امیر یا بڑے کے کہنے کے بغیر اپنے آپ کو جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ چونکہ ایسے افراد عمل پسند ہوتے ہیں، دعوت کا کام از خود کرتے ہیں اور اس میں کام چوری اور سستی سے کام نہیں لیتے لہٰذا ان کا کام اثر پذیر ہوتا ہے۔

بصیرت و علم:

بعض داعی افراد فکری و علمی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا ذہن اس دعوت کی حقیقت کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ جانتا ہے، وہ موقع محل کو جانتے ہیں، حالات اور مخاطب کو دیکھ کر اُس کی مناسبت سے کام کرتے ہے۔ دعوت کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مسائل کا حل جانتے ہیں اور اُس کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حق ان کے بیان سے آشکارا ہوتا ہے، علم استدلال اور بلاغت کے ذریعے لوگوں کے اذہان اور قلوب کو متاثر کر لیتے ہیں۔

انسان دوست مزاج:

بعض داعی انسان دوست ہوتے ہیں۔ ان کا عوام اور عام لوگوں سے رابطہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں میں میل ملاپ کرکے اُن ہی کے درمیان رہتے ہیں اُن کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، لوگوں سے تعلقات قائم رکھتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا ان سے تعلق رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس اعلیٰ اخلاق اور انسان دوستی کے ذریعے دشمنوں کو بھی ختم کر لیتے ہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا، خوشی ہو یا غمی، مشکل ہو یا آسانی وہ ہر موقع پر، ہر سطح پر، ہر صورت میں رابطہ بنانا، تعلق استوار کرنا اور اس تعلق کو دعوت کے لیے استعمال کرنا جانتے ہیں۔

انتظامی صلاحیت:

بعض داعی افراد اپنے مدعووین کو نظم میں لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی محنت کو منظّم کرتے ہیں۔ اپنے کام اور مدعووین کو بنانے کے بعد اسی طرح نہیں چھوڑتے کہ وہ بے کار رہ جائے بلکہ افراد کو تنظیم کے نظم میں پرو دیتے ہیں اور کام کو منظّم طریقے سے کرتے ہیں، تنظیمی سطح پر منصوبہ سازی کے ذریعے اہداف متعین کرتے، کام کے لیے لائحہ عمل مرتب کرکے آگے بڑھانا جانتے ہیں۔ وہ کل کا کام کل آنے سے پہلے پہلے راتوں رات اس وجہ سے انجام دیتے ہیں کہ ممکن ہے کل زندگی وفا نہ کرے اور کام کی سعادت سے محروم رہ نہ جائیں۔ ان میں قیادت، فیصلہ سازی، معاملہ فہمی وغیرہ کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ وہ اپنی منظّم دعوت سے تنظیمی واجتماعی قوت کو بروئے کار لاکر بڑے مقاصد اور اعلیٰ اہداف کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔

تربیت یافتہ:

داعی کے لیے ایک ضروری صفت یہ بھی ہے کہ وہ دعوت کے میدان میں کودنے سے پہلے تربیت دعوت حاصل کرچکا ہو۔ ورنہ بغیر تربیت کے خیر کی بجائے شر پھیلانے کا سبب بنے گا، کیونکہ دعوت ایک فن ہے۔ اس کے کچھ اصول، قواعد اور ضوابط ہیں۔ اس کے لوازم اور تقاضے ہیں، دعوت الی اللہ کے میدان میں اترنے سے پہلے ان تمام تقاضوں اور اصول وضوابط پر عبور حاصل کرنا، بعینہ اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ خود دعوت الی اللہ فرض ہے۔ ان تمام امور سے باخبر ہونے کے بعد ان کے ایک ایک طور طریقے اور ضابطے کا لحاظ رکھنا ہوگا، ان کا لحاظ کیے بغیر نہ صرف یہ کہ دعوت کے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کیے جاسکیں گے بلکہ داعی کی تمام تر جدوجہد کا نتیجہ برعکس اور دعوتی نقطہ نگاہ سے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

اب ہمیں چاہیے کہ ہر رکن اور داعی، دعوت کو آگے بڑھانے کے لیے داعیانہ کردار کی یہ خصوصیات اپناکر اسی کے تناظر میں دعوت کو آگے بڑھائیں۔

اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ

قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کی بعثت، آسمانی کتابوں کے نزول اور دین خداوندی کی آمد کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"اللہ نے تمھارے لیے وہی دین مشروع کیا ہے جس کی تاکید اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی تھی کہ دین کی اقامت کرو اور اس میں متفرق نہ ہو"۔ (الشوریٰ: ۱۳)

یعنی انبیا علیہم السلام کی بعثت اور دین خداوندی کے نزول کا بنیادی منشا یہ رہا ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کی جائے۔ "اقامتِ دین" کا مفہوم کیا ہے؟ اسے جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن مجید میں لفظ "اقامت" کس کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے سورۂ کہف میں ہے:

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ۔ (الکھف :۷۷)

"تو ان دونوں نے اس (بستی) میں ایک دیوار پائی جو گرنا چاہتی تھی تو انھوں نے اسے قائم کر دیا"۔

آیت میں دیوار کی "اقامت" کا مفہوم ہے، اسے گرنے سے بچالینا اور اسے سیدھا کھڑا کر دینا۔

سورۂ رحمٰن میں ہے:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۔ (الرحمٰن: ۹)

"اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول میں کمی نہ کرو"۔

یہاں وزن کی "اقامت" کا مطلب ہے، ٹھیک ٹھیک تولنا۔

سورۂ طلاق میں ہے:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ۔ (الطلاق: ۲)

"اور اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو"۔

اس آیت میں شہادت کی اقامت کا مطلب ہے، ٹھیک ٹھیک گواہی دینا۔

سورۂ اعراف میں ہے:

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (الاعراف: ۲۹)

"اور ہر سجدے کے وقت اپنا رخ سیدھا کرو اور اللہ کو پکارو دین (پرستش واطاعت) کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے"۔

یہاں رُخ کی "اقامت" کا مطلب ہے، شرک سے بچ کر اللہ کی ٹھیک عبادت۔

سورۂ روم میں ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔ (الروم: ۳۰)

"تو اپنا رخ سیدھا کرو دین کے لیے یکسو ہو کر"۔

چند آیات کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ۔ (الروم: ۴۳)

"تو اپنا رخ سیدھا کر دین قیم کے لیے قبل اس کے کہ وہ دن آئے جسے اللہ کی طرف سے آنے سے کوئی روک نہ سکے گا، اس دن لوگ منتشر ہو جائیں گے"۔

ان آیات میں دین کے لیے رُخ کی اقامت کا مطلب ہے، ہر طرف سے یکسو ہو استقامت اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے دین کی ٹھیک پیروی۔

قرآن مجید "اقامت الصلوٰۃ" کا ذکر مختلف انداز سے بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ ہم یہاں صرف دو تین آیات نقل کریں گے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ (بنی اسرائیل: ۷۸)

"نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک اور صبح کے وقت (نماز میں) قرآن پڑھو"۔

سورۂ نساء میں ہے:

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ (النساء: ۱۰۳)

"تم جب اطمینان وسکون سے ہو جاؤ کہ تو نماز قائم کرو، یقیناً نماز اہل ایمان پر (اللہ کا) فریضہ ہے پابندی وقت کے ساتھ"۔

سورۂ نور میں ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ۔ (النور: ۳۷)

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد، اقامتِ صلوٰۃ اور ادائیگی، زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی"۔

ان آیات میں اقامت صلوٰۃ یا نماز کی اقامت کا مطلب ہے۔ نماز کی پابندی، اس کا اہتمام اور اس کا پورا پورا حق ادا کرنا۔

سورۂ البقرہ میں ہے:

"تو اگر تمھیں ڈر ہو کر وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی حدود کو قائم نہ کر سکیں گے تو ان دونوں کے لیے حرج نہیں اس بات میں کہ عورت فدیہ دے (اور خلع کرالے) یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں"۔ (البقرۃ: ۲۲۹)

اس آیت میں اللہ کی حُدود کی اقامت کا مطلب ہے معاشرتی زندگی میں احکام الٰہی کا پورا پورا پاس ولحاظ، ان کی پوری پوری تعمیل۔ اور حدود اللہ سے تجاوز کا مطلب احکام الٰہی کی دانستہ خلاف ورزی۔

الغرض مومن جس طرح خود اللہ کی اطاعت وبندگی کرنا چاہتا ہے اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ اس کے گھر میں بھی خدا کا حکم چلے، اس کے گردو پیش رہنے والے سارے انسان اسی کی طرح اللہ کے مخلص بندے بن جائیں، اس کا معاشرہ بُرائیوں سے یکسر پاک اور نیکیوں سے معمور ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس کے گھر، اس کے معاشرے اور اس کے علاقے میں خدا کی نافرمانی کا نام ونشان باقی نہ رہے۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کا دین اُس کے ملک وطن میں دین غالب کی حیثیت اختیار کرلے، اہل وطن پر اللہ کی مرضی کے سوا کسی کی مرضی نہ چلے اور گھریلو

زندگی سے لے کر سیاست و معیشت اور ملکی اور بین الاقوامی اُمور تک، ہر جگہ اللہ کا قانون نافذ ہو اور معاشرہ کی طرح ریاست کی تشکیل بھی اللہ کے دین کے مطابق ہو۔

اگر ملک میں غیر الٰہی قانون نافذ ہوگا تو زندگی کے مختصر سے دائرے کو چھوڑ کر جہاں یہ قانون اللہ کی بندگی کی اجازت دے گا اور یہ دائرہ بھی مسلسل سکڑتا ہی رہے گا بقیہ پوری زندگی میں وہ غیر الٰہی قانون کی پیروی کے لیے مجبور ہوگا۔ وہ اپنے گھر کے لوگوں کو اللہ کی مرضی کے سانچے میں ڈھال نہ سکے گا کیونکہ ماحول پر کفر، شرک، الحاد اور فسق و فجور کا غلبہ ہوگا۔ وہ اپنے علاقے کو برائیوں سے پاک نہ کرسکے گا کیونکہ وقت کا قانون انھیں سند جواز دیتا ہوگا۔ وہ شراب خوری کا انسداد نہ کرسکے گا کیونکہ شراب کے کاروبار اور شراب خوری کو وقت کے قانون کی سرپرستی حاصل ہوگی۔ وہ سُود کے لین دین سے بچ نہ سکے گا کیونکہ وقت کی عدالتیں اس کی پُشت پناہ ہوں گی اور وقت کے نظام کے رگ وریشہ میں سود سرایت کیے ہوئے ہوگا۔ وہ فحاشی وعریانی کو روکنے میں ناکام رہے گا کیونکہ وقت کا نظام اپنے تمام ذرائع ووسائل۔ سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فحش لٹریچر اور رسائل کے ذریعہ پوری قوت سے اسے پھیلا رہا ہوگا۔ وہ اختلاطِ مرد وزن اور زنا اور محرکات زنا پر روک نہ لگا سکے گا کیونکہ یہ وقت کی تہذیب کے پُرکشش اور اُبھرے ہوئے پہلو ہوں گے۔ وہ اپنی اولاد کو دینی تعلیم نہ دلا سکے گا کیونکہ وقت کا تعلیمی نظام دینی تعلیم سے یکسر خالی ہوگا اور اس کا ماحول اور تربیت کا انداز غیر اخلاقی اور لادینی ہوگا۔ وہ عدالتوں سے خدائی قانون کے مطابق فیصلے نہ کرا سکے گا کیونکہ ان عدالتوں سے غیر الٰہی قانون کے تحت فیصلے ہوتے ہوں گے۔ اس کا پرسنل لا بھی ہر وقت خطرہ میں ہوگا۔ وقت کا نظام جب چاہے گا اُسے ختم کرکے یکساں سول کوڈ نافذ کردے گا اور مسلمان مجبور ہوگا کہ نکاح اور طلاق جیسے معاملات میں بھی اسلامی قانون پر عمل نہ کرسکے۔

یہ ہیں غیر الٰہی نظام زندگی کے غلبہ کے نتائج، کوئی بھی مغلوب رہ کر پھل پھول نہیں سکتا، چہ جائیکہ اسلام، جو پوری زندگی پر حاوی ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی اُمور و معاملات میں ہدایات دیتا ہے، ایسے دین پر مغلوبیت کی حالت میں کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے؟ حقیقت یہ

ہے کہ جو شخص بھی اللہ کی بندگی میں مخلص ہوگا، وہ دِل سے اس کی تمنا اور زندگی بھر اس کی جدوجہد کرے گا کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی کے سوا کسی کی مرضی نہ چلے اور اُس کے قانون کے سوا کوئی قانون نافذ نہ رہے۔ اللہ نے جس سے بڑھ کر حکیم ودانا کوئی نہیں، خود یہ واضح فرمادیا ہے کہ یہ دین غالب ہونے کے لیے آیا ہے اور رسول کی بعثت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا دین آخر کار دنیا میں غالب و نافذ ہو:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

(التوبہ : ۳۳، الصّف : ۹)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو“۔

قرآن مجید میں یہ آیت ان الفاظ کے ساتھ سورۂ توبہ اور سورۂ صف میں اور آخری الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ سورۂ فتح میں آئی ہے۔ اللہ نے دین کے نازل ہونے اور رسولؐ کے معبوث ہونے کا مقصد صریح الفاظ میں بار بار واضح فرمادیا تاکہ کسی کو کسی طرح کا اشتباہ نہ رہے۔ ان تینوں سورتوں میں ایک ہی بات مختلف انداز سے بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے کے لیے اپنا سب کچھ لگادیں۔ یہی ان کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے، یہی ان کے مومن ہونے کا ثبوت ہے اور دنیا میں اللہ کے دین کے غالب ہونے کی واحد صورت یہ ہے کہ رسولؐ کے پیروؤں کی کوششیں اس کام میں لگ جائیں کیونکہ تنہا رسولؐ نہ نظامِ باطل کو مغلوب کرسکتا ہے اور نہ نظامِ حق کو غالب چنانچہ سورۂ صف میں اس آیت کے فوراً بعد ہے:

"اے ایمان لانے والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمھیں (خدا کے) دردناک عذاب سے نجات بخشے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے پوری جدّوجہد کرو، یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہوئے۔ اس صورت میں وہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور پاکیزہ محلات میں جگہ دے گا جو ہمیشگی کی جنتوں میں ہوں گے۔ یہی عظیم الشان کامرانی ہے اور ایک اور چیز بخشے گا جو تمھیں محبوب ہے، اللہ کی مدد اور قریبی فتح اور (اے نبیؐ) اہل ایمان کو بشارت دو"۔

ان آیات سے پہلی بات یہ واضح ہوئی کہ ان آیات کا خطاب صحابہ کرام سے مخصوص نہیں ہے ، سارے اہل ایمان ان کے مخاطب ہیں چنانچہ "اے ایمان والو! سے کلام کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جہنم کے عذاب سے نجات پانے، گناہوں کے بخشے جانے اور جنت کے مستحق ہونے کی راہ یہ ہے کہ انسان اللہ اور اس کے رسولؐ پر مخلصانہ ایمان لائے اور پھر اللہ کی رضا کے لیے اس کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں اپنے وجود، اپنی صلاحیتوں اور قوتوں اور اپنے ذرائع ووسائل کو لگادے تیسری بات یہ کہ یہ اگرچہ بظاہر سرتاسر قربانی کی راہ ہے لیکن فی الواقع انتہائی نفع بخش تجارت اور عظیم کامرانی کا سودا ہے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کو، جو بہر حال ختم ہونے والی ہے اور حقیر مال ومتاع کو، جو ایک نہ ایک دن ہم سے چھن جانے والے ہیں، خدا کی راہ میں قربان کرکے اور اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے لگا کر ہم آخرت کے ابدی اور دردناک عذاب سے نجات حاصل کرلیتے ہیں اور جنت کی دائمی ولازوال اور بے پایاں وناقابل تصوّر نعمتیں پالیتے ہیں۔ کیا یہ عظیم الشان کامرانی نہیں ہے اور چوتھی بات یہ ہے کہ آخرت کی ابدی ولازوال کامرانی سے پہلے دنیوی کامرانی کی راہ بھی یہی ہے۔ جو لوگ اللہ

کے دین کو غالب و نافذ کرنے کے لیے اپنا سب کچھ لگا دیتے ہیں، اللہ ان کی مدد فرماتا ہے اور فتح وکامرانی ان کے لیے مقدر ہو جاتی ہے۔

سورۂ توبہ میں ہے:

"جو لوگ اللہ اور آخرت پر (سچ مچ) ایمان رکھتے ہیں وہ (اے نبی) اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جدوجہد نہ کرنے کی اجازت نہیں چاہتے ، اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ تم سے اس کی اجازت وہی چاہتے ہیں جو نہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں نہ آخرت پر جن کے دلوں میں شک ہیں اور وہ ان شکوک میں سرگرداں ہیں"۔ (التوبہ: ۴۴،۴۵)

ان آیات سے واضح ہوا کہ اعلائے کلمتہ اللہ کی جدّوجہد انسان کے دین وایمان کی کسوٹی ہے۔ مخلص مومن اس جدوجہد سے کترانے کے لیے بہانے تلاش نہیں کرتا، وہ تو اپنا سب کچھ اس راہ میں لگا دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص غلبۂ دین کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا نہیں کرتا اور حیلوں، بہانوں اور تاویلوں کی اوٹ میں پناہ لیتا ہے، ارشاد خداوندی کی رو سے وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ جھوٹا ہے اگر وہ خود کو مسلمان کہتا ہے۔

دعوت دین کا کام منظّم طریقے سے کیسے کریں؟

دعوت دین کا منظّم اور عملی کام اور اُس کے طریقہ کار کو بیان کرنے سے پہلے تنظیم کے متعلق چند بنیادی باتیں سمجھنا ضروری ہیں جو کہ آنے والے مضمون کے لیے تمہید ثابت ہوں گی۔

(۱) تنظیم کی اہمیت (۲) تعریف (۳) خصوصیات یا لوازم

یہ اصطلاحات کیا ہیں ان کی کیا تعریف ہے؟

ان کے حوالے سے مختصراً یہ بات عرض کرتا چلوں کہ ازاوئے شریعت یعنی قرآن اور سنت کی رو سے دعوت دین اور اقامتِ دین کے لیے اجتماعیت اور نظم شرط ہے۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ۔ یعنی اگر مسلمان کوئی اجتماعی کام کریں گے تو باہم مشورہ سے اسے طے کریں۔ اب مشورہ اور شوریٰ تب ہو گی جب اجتماعیت ہو اور ساتھ نظم بھی ہو۔

الغرض مسلمانوں کے لیے شوریٰ لازمی صفت ہے۔ اس آیت کی دلالت النص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام شورائی نظام کا متقاضی ہے لیکن اشارۃ النص کے ذریعے اس بات کی طرف بھی لازمی اشارہ ملتا ہے کہ امت میں مسلمانوں کی اجتماعی معاملات طے کرنے کے لیے اور باہم مشورہ کرنے کے لیے ایک جماعت قائم کرنے کا وجوب بھی معلوم ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ

اللہ کا تعاون جماعت اور اجتماعیت کے ساتھ ہے۔

تنظیم اور اجتماعیت کی افادیت :

ایک فائدہ یہ ہے کہ کام ایک ساتھ اجتماعی طور پر ہو جاتا ہے۔ اگر ایک آدمی انفرادی طور پہ کچھ کام کرنا چاہے تو اس کا اتنا بہتر ثمرہ اور نتیجہ نہیں نکلے گا جیسا کہ اجتماعی اور تنظیمی شکل فائدہ دیتی ہے۔

دوسرا کام میں بہتر کار کردگی، حسن اور قوت پیدا ہوتی ہے اور یقیناً دین اور تحریک کو قوت پہنچتی ہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک اور ایک دو نہیں گیارہ بن جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تنظیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو لوگوں کی صلاحیتوں کو جمع نہیں کرتی بلکہ ضرب دیتی ہے۔آپ سب یقیناًاُس مشہور سبق آموز کہانی سے واقف ہوں گے ''اتفاق میں برکت ہے'' جب وہ بوڑھا کسان مرنے کے قریب ہو جاتا ہے تو اپنے بیٹوں کو حکم دیتا ہے کہ لکڑیاں جمع کرکے میرے پاس لے آؤ۔اور پھر اُن کو حکم دیتا ہے کہ لکڑیوں کے اس گٹھے کو توڑ ڈالو جب وہ اس کے توڑنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر کہتا ہے کہ اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی کو الگ الگ کرکے توڑ دو، بیٹے چند منٹوں میں لکڑیوں کو توڑ دیتے ہیں۔

پھر بوڑھا کسان بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب تک یہ لکڑیاں اکٹھی تھیں تم اس کو توڑ نہیں سکے اور جب یہ الگ الگ ہو گئیں تو تم لوگوں نے آسانی سے توڑ دیں اس طرح اگر تم بھی اکھٹے اتفاق اور اتحاد سے رہو گے تو تم کو کوئی ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاسکتا اور اگر بے اتفاق ہو گئے تو تمھارا حشر بھی ان اکیلی الگ الگ لکڑی جیسے ہوگا۔

یہی اجتماعیت کا فائدہ ہے،جب اجتماعیت منظّم ہو اور ایک ہو تو ان کی قوت اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ خارجی عوامل ان پر کوئی اثر نہیں کر سکتی، دشمن ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتا۔یہی قرآن کا حکم ہے۔ یہی درس ہمیں قرآن مجید نے بھی دیا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا

یعنی قرآن وسنت اور دین کے ہر کام کے لیے ایک جان اور متحد رہو۔

ارکان اور ساتھیوں میں جو اچھی صلاحیتں ہوتی ہے،اُن صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ایک بامقصد کام اور جگہ پر استعمال کرنے کا موقع تنظیم ہی فراہم کرتی ہے،اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ان ارکان کی صلاحیتوں کو اجاگر نہیں کیا گیا،ان کو صحیح جگہ پر.بروقت استعمال میں نہیں لائی گئ تو ایک موقع ایسا آئے گا کہ یا تو یہ صلاحیتیں ختم ہوں گی یا یہی صلاحیتیں اسلام، دین، قوم، ملت کے خلاف کسی غلط جگہ پر استعمال ہوں گی، کیونکہ یہ انسانی

فطرت ہے کہ وہ جذبات کو کسی نہ کسی جگہ ضرور استعمال کرتا ہے۔اب اگر اس کو Field Work نہیں ملا تو یہ صلاحیتیں ضرور ضائع ہوں گی۔اب آتے ہیں تنظیم کی تعریف کی طرف۔

تنظیم کی تعریف:

عام طور پر ایک تعریف یہ کی جاتی ہے کہ: دو یا دو سے زیادہ افرد جمع ہوں،اور کسی کام اور مقصد کے حاصل کرنے کا ارادہ کرلیں تو اس کے ساتھ خود بخود ایک تنظیم وجود میں آتی ہے۔

دوسری تعریف:

تنظیم ارکان اور افراد کے اُس مجموعہ کو کہا جاتا ہے،جو ایک خاص اور متفق علیہ مقصد کے لیے ایک امیر کی اطاعت میں ایک مرکز کے ماتحت، اصول اور ضوابط کا خیال رکھتے ہوئے اصلاح معاشرہ،دعوت دین اور اقامت دین کے لیے منظّم طریقے سے ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرے۔ یہ ایک جامع تعریف ہے۔اس تعریف کا ہر ہر جملہ ایک مفید قید کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی جماعت اور تنظیم تب ہے جب یہ چیزیں موجود ہوں، افراد کا مجموعہ۔ مطلب یہ کہ انفرادی کام کرنے والوں کو جماعت نہیں کہا جاتا، ایک خاص متفق علیہ مقصد۔ مطلب کہ ہر کسی کا علیحدہ علیحدہ مقصد ہو تو بھی یہ جماعت اور تنظیم نہیں۔اس طرح ایک امیر کا ہونا اور پھر اُسی کی اطاعت میں کام اور ایک مرکز کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ دین اسلام میں امیر کی اطاعت اور مرکز کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے مسلمانوں کی جماعت کے لیے دینی مرکز مسجد قبا اور پھر مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔اسی تناظر میں دینی تحریکی کام کرنے والوں کے لیے مرکز کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مشاہدہ ہے اور آپ جائزہ بھی لیں جن حلقوں اور یونٹوں میں اپنی درسگاہ اور مرکز موجود ہے وہاں کے کام اور جہاں ساتھیوں کے مل بیٹھنے کے لیے اپنی جگہ اور مرکز نہیں اُن کے کام میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اسی طرح جماعت کے لیے اصول وضوابط کی پابندی بھی ضروری ہے۔اگر اصول وضوابط کی پابندی نہیں ہوگی تو افراتفری بنے گی۔اس کے بعد اگلا کام ہوگا اصلاح،دعوت اور اقامت لیکن اس کے لیے منظّم طریقے سے کام کرنا اور بہتر منصوبہ بندی

ضروری ہے اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھر کام آگے نہیں جائے گا اگرچہ بہتر مقصد، بہتر اصول اور اخلاص موجود کیوں نہ ہو۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو تنظیم کے لیے لازم وملزوم ہیں اور تنظیم کی اس تعریف سے معلوم ہوتی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔

نظم اور تنظیم کی خصوصیات اور لوازم:

تنظیم اور جماعت کے لیے وہ بنیادی اور اہم صفات اور امور جن کا اپنانا ارکان اور ذمہ داران تنظیم کے لیے بے حد ضروری ہے۔

(۱) عمومی لوازم (۲) خصوصی لوازم

خصوصی لوازمات چھ باتیں ہیں جو بہت ہی ضروری ہیں۔

(۱) صحیح مقصد:

یعنی تنظیم کے لیے ضروری لوازمات میں سے ایک یہ ہے کہ تنظیم کا مقصد، ہدف ، منشور صحیح ہو۔اب اس کے تناظر میں اگر دیکھا جائے، ہماری تحریک کا مقصد اصل میں مقصد بعثت نبوی ہی ہے۔ جس میں اصلاح وعقائد اعمال، دعوتِ دین، اقامتِ دین، تعلیم و تعلم وغیرہ شامل ہیں جیسے قرآن میں ذکر ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔

(۱) تلاوت الایات۔ (۲) تعلیم الکتاب والسنۃ اور (۳) تزکیہ۔

اور اقامت دین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا۔

(۲) نیت:

نیت کا صحیح ہونا یا اخلاص یہ تنظیم کے لیے ایک بنیادی اور لازمی شرط ہے باقی سارے مقاصد مثلاً دعوت، تعلیم، امامت وغیرہ اس مقصد کے ذیل میں تو ہو سکتے ہیں مگر اس سے ماورا نہیں ہو سکتے ورنہ تنظیم اور جماعت کی ساری کاوشیں ضائع ہو جائیں گی۔ اگر مقصد بہت ہی عمدہ اوراعلیٰ ہو لیکن نیت ٹھیک نہیں تو پھر خود غرضی یا مادہ پرستی ہے یا دوسرے کا مقابلہ اور دوسرے کو نیچا کرنا ہے۔ جو بہت خطرناک بات ہے۔

(۳) تقویٰ:

یہ تقویٰ اتنا مفصل عنوان ہے کہ اتنے تھوڑے وقت میں بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ تقویٰ پھر عقیدے کے تقویٰ، عمل کے تقویٰ، اخلاق و کردار کے تقویٰ حتی کہ تنظیم کے تقویٰ سب کو شامل ہے۔اگراس کو تنظیم کی طرف سے کوئی عہدہ یاکام سپرد کیاگیاہے تو اس کام کے حوالے سے بھی تقویٰ کا خیال رکھنا چاہیے یعنی عہدہ اور ذمہ داری سپرد ہوئی تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ذمہ داری انجام کو پہنچادی جائے۔اسی طرح تنظیم کی طرف سے اس کو فنڈوغیرہ کی نگرانی کا عہدہ ملاہے یا شعبہ مالیات کا مسئول مقرر ہوا ہے تو تقویٰ کا تقاضا ہے کہ اس میں خیانت نہ کرے۔

(۴)اخوت:

تنظیم کے ارکان کے مابین اخوت بھائی چارہ ایک لازمی امر ہے اور ارکان کے مابین اخوت کا جذبہ ضروری ہے۔اگر باہم تعلقات اچھے نہ ہوں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کی بنیاد پر نہ ہو۔تو تنظیم کیسے چل سکتی ہے۔

(۵) شورائیت:

اسلامی نظم کا اگلا خصوصی لازمہ شورائیت ہے۔اس سنت اور طریقہ کو قائم رکھنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بھی دیا گیاکہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ۔ (آل عمران) چنانچہ اسلامی نظم میں ہر سطح پر شورائیت کا قیام بہت ضروری ہے۔

(۶)احتساب:

یہ ایک بنیادی عنصر ہے۔شوریٰ کے بعد احتساب نہ ہو۔تو تنظیم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔مثلاً شوریٰ میں ارکان کو مختلف کام سونپ دیے گئے اب احتساب اور پوچھ گچھ نہ ہو، توکام نہیں چل سکتا۔لہٰذا نظم میں ہر ذمہ دار کے احتساب کا مناسب طریقہ ہونا چاہیے۔یہ احتساب اصلاح کے جذبے کے ساتھ اور پورے برادرانہ جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہونا چاہیے۔ہمیں اس کی واضح مثال موجود ہے،اسلام میں ایسے آزادنہ احتساب موجود تھا۔

۲۔ عمومی لوازمات:

یہ بھی تقریباً چھ امور ہیں:

(ا) منصوبہ بندی:

منصوبہ بندی تحریک کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ جس تحریک، جس حکومت، یہاں تک کہ جس آدمی کی اپنی ذات کے حوالے سے، اوقات کے یا کاروبار کے حوالے سے منصوبہ بندی نہ ہو، تو یہ آدمی ناکام ہے۔ پھر منصوبہ بندی ٹھوس ہونی چاہیے، منصوبہ بندی جتنی بہتر ہوگی اُتنا ہی تحریک اور کام آگے جائے گا، لیکن افسوس آج ہمارا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم میں جماعتی سطح پر، قومی سطح پر حتی کہ ذاتی سطح پر بھی منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ اب منصوبہ بندی ہے کیا چیز؟ اپنا مقصدِ کار متعین کرنے اور اس کا اندازہ لگانے کے بعد یہ طے کرنا کہ اس متعلقہ کام اور منصوبے پر کب پہنچنا ہے؟ کیسے پہنچنا ہے؟ پہنچنے کے لیے وسائل کیسے فراہم ہوں گے؟ یہ چار سوالات بنتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا کام، آپ کو ان کا جواب دینا ہوگا کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ کس طرح پہنچیں گے؟ پہنچنے کے لیے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہوگی۔ وسائل اور ذرائع انسانی مالی، معاشی، روحانی واخلاقی اور سیاسی کیسے فراہم ہوں گے اور کہاں سے آئیں گے؟ ایک موثر تحریک و تنظیم کے لیے یہ اہم اصول ہے۔

(۲) تنظیمِ کار یا تقسیمِ کار:

پھر صرف منصوبہ بندی ہی نہیں بلکہ منصوبہ بندی کے بعد تقسیم کار بھی ضروری ہے۔ تنظیم میں کام کرنے کے لیے ایک ڈھانچہ اور ترتیب کا ہونا ضروری ہے۔ اسی ڈھانچہ میں مختلف مناصب کے لیے فرائض ذمہ داریاں، اختیارات و حقوق کا تعین کرنا، کون کس کو جوابدہ ہے اور کس کام کے لیے ذمہ دار ہے۔ کتنے شعبہ جات ہوں گے اور پھر ان کا آپس میں کیا تعلق ہوگا۔ ان کے باہم کام کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔

(۳) افرادِ کار:

اب اس کام کے کرنے کے لیے مناسب افراد کا چناؤ کہ جس کو جو کام سونپا جا رہا ہے وہ رجال کار میں سے ہو، وہ اس کام کو سمجھتا ہو، اس کے حوالے سے اُس کی تربیت ہوئی ہو یا تربیت دینا چاہیے۔ پھر اس کے کام کی نگرانی کرنا، اس کو مراعات مہیا کرنا، ان کے مسائل حل کرنا۔ اکثر اوقات ہم ذمہ داری تو حوالہ کر دیتے ہیں لیکن ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے جس کے نتیجے میں متعلقہ کام آگے نہیں جا سکتا اور ترقی رک جاتی ہے۔

(۴) ہدایات:

اب کام سونپ دیا گیا ذمہ دار جانتا بھی ہے کہ کام کیسے کیا جاتا ہے، لیکن پھر ایک ضروری اور لازمی امر یہ ہے کہ بالائی نظم، امیر اور مرکز کی طرف سے ہدایات دینا ضروری ہے اور ذمہ دار کو بھی اس کے لیے سعی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے اس میں قیادت کا جو کردار ہے وہ بہت اہم ہے۔

(۵) باہمی تعاون اور رابطہ:

مختلف شعبوں اور افراد کو ایک دوسرے کے کام، مسائل، ضروریات اور رفتار کام سے آگاہ رکھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ سب لوگ ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے کام کر رہے ہیں اور جب تک اس بات کا پتہ نہ ہو کہ اسی نظم کے دوسرے لوگ کس انداز سے کام کر رہے ہیں تو وہ ایک باہم مربوط مشین کی طرح کام نہیں کر سکتے اور اسی طرح ایک شعبہ دوسرے شعبے، ایک رکن دوسرے رکن سے اور ایک ذمہ دار کو دوسرے ذمہ دار کے ساتھ باہم تعاون کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور کام تعاونوا علی البر والتقویٰ کی بنیاد پر آگے لے جانا چاہیے۔

(۶) رپورٹ:

آخری لازمہ کام کے متعلق مختلف قسم کی رپورٹیں تیار کرنا اور رپورٹ لینا اور رپورٹ دینا ہے۔ جس سے بالائی سطح کے نظم کو تحتانی نظم کے حوالے سے بروقت علم ہوتا رہتے تاکہ آیا کام صحیح طریقے سے ہو رہا ہے کہ نہیں۔ مقررہ منصوبہ کے مطابق ہو رہا ہے، اس میں کیا مسائل اور مشکلات پیش آ رہے ہیں۔ اس پر خرچ میزانیہ کے مطابق ہے کہ نہیں، کارکردگی کیا ہے وغیرہ۔

اسلام، تعارف اور دعوت

اسلام کی سادہ واضح اور دل کو اطمینان کی ٹھنڈک دینے والی تعلیم کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ یہ کائنات پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہی انسان کا بھی خالق ہے وہ انسانوں پر بے انتہا مہربان ہے۔ شب و روز انسان کو اپنی رحمتوں، نوازشوں اور بے حد و حساب نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ اس پروردگار کے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ، بندگی، عبادت اور اطاعت کے لائق صرف وہی اکیلا معبود ہے، اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں اس پر پختہ یقین رکھیں اور زبان سے اس حقیقت کا اعلان کریں اس یقین واعلان کے ذریعے ہی آدمی مؤمن اور مسلم بنتا ہے۔ اللہ کی بے پایاں رحمتوں اور بے حدو حساب نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے ہر دور میں انسانوں کو گمراہی اور ضلالت کی ہلاکتوں اور پستیوں سے بچانے اور راہ ہدایت دینے کے لیے رسول اور پیغمبر بھیجے، جو اللہ کی مرضی کا علم لے کر آئے، اس کا دیا ہوا ہدایت نامہ لے کر آئے، یہ پیغمبر اور رسول، نوع انسانی کے سب سے برگزیدہ سب سے افضل اور مثالی انسان تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جس دین اور ہدایت کی طرف انھوں نے لوگوں کو دعوت دی۔ سب سے پہلے خود اس پر ایمان لائے سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کیا اور اعلان کیا کہ سب سے پہلے ہم اس ہدایت کو مانتے ہیں " انا اول المسلمین" ہم سب سے پہلے مسلم ہیں اور یہ برگزیدہ ہستیاں ایمان لانے والوں اور پیروی کرنے والوں کے لیے بہترین نمونہ اور مثال بنے۔ ان پیغمبروں اور نبیوں کے سردار سب سے آخر میں آئے، ان پر نبوت ختم ہو گئی۔ اب رہتی زندگی تک جو شخص بھی ہدایت کی راہ پر چلنا چاہے اور اللہ کے دین پر عمل کرنے کا آرزومند ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس حقیقت پر تہ دل سے ایمان لائے اور کامل اطمینان کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان پر نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

ان حقیقتوں پر پختہ یقین و ایمان اور اس یقین و ایمان کا اعلان دین کا مرکزی نکتہ اور اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ اسی مرکزی نکتہ سے پورا دین اسلام پھوٹتا ہے۔ اس

کے بغیر دین کا کوئی جز ٹھیک نہیں ہوتا، اسی کو کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے اور اسی کا اقرار و اعلان کر کے آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا اور صاحب ایمان بنتا ہے۔ اس پختہ یقین اور ایمان کے اعلان کی توفیق جس خوش نصیب کو بھی حاصل ہو اس کی دینی ذمہ داری یہ قرار پاتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ تعارف میں اس کلمہ کو عام کرے، اس کی حقیقت اللہ کے بندوں کو سمجھائے، دلسوزی اور دلی تڑپ کے ساتھ اس کو لوگوں کے دلوں میں اُتارنے کی کوشش کرے اور لوگوں کو تیار کرے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ صحابہ کرامؓ نے اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر کے سخت ترین ماحول میں اس کا اعلان کیا اور اس کلمہ طیبہ کو عام کرنے اور اللہ کے بندوں تک اس حقیقت کو پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ وہ ایمان لانے کے بعد اپنے قبیلوں میں پہنچے۔ تو اپنوں تک یہ دعوت پہنچانے کے لیے بے چین رہے دوسرے قبیلوں میں پہنچے تو وہاں یہی دعوت پیش کی۔ ان کا مقصد زندگی کے معیار کو بلند سے بلند کرنا اور بینک بیلنس بڑھانا نہیں تھا بلکہ ان کا اصل ہدف اور اصل سرمایہ یہ تھا کہ وہ کتنے افراد کے دلوں میں اللہ کی یہ دعوت اتارتے ہیں اور کتنوں کو حلقہ بگوش اسلام بناتے ہیں۔

مغیرہ بن شعبہؓ کا جب ایرانی سپہ سالار رستم اور دوسرے ایرانی کمانڈروں سے سامنا ہوا تو مغیرہ بن شعبہؓ نے جچے تلے لفظوں میں ان کے سامنے اپنی حیثیت اور پیغام کا اظہار اس طرح فرمایا ": ہم لوگ تاجر نہیں ہیں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنی تجارت کے فروغ کے لیے نئی منڈیا تلاش کریں۔ ہمارا نصب العین یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصود آخرت ہے، صرف آخرت، ہم دین حق کے علمبر دار ہیں اور اس دین حق کی طرف لوگوں کو بلانا ہمارا نصب العین ہے۔"

اسلامی کمانڈر کی زبان سے یہ دل میں اتر جانے والے کلمات سن کر رستم چونک گیا۔ اس کی فطرت نے پذیرائی کی اور بولا۔ " عرب کمانڈر! وہ دین حق کیا ہے جس کی طرف تم اللہ کے بندوں کو بلاتے ہو ذرا اس کا تعارف تو کراؤ۔" حضرت مغیرہؓ یہی تو چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا ": ہمارے دین حق کی اصل بنیاد اور مرکزی نکتہ جس کے بغیر اس دین کا کوئی جز ٹھیک

نہیں ہوتا یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کا اعلان کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں"۔

حقیقت یہی ہے کہ اس اصل بنیاد ہی سے پورا دین پھوٹتا ہے اور پورے دین کا نظام اسی شیرازے سے وابستہ ہے۔ اسلام کی اس فطری تعلیم اور بنیادی نکتے کو سننے کے بعد رستم کی طلب اور بڑھی اور اس نے کہا۔ "مغیرہؓ! یہ تو بہت ہی اچھی تعلیم ہے، کیا اس دین کی اور بھی کچھ تعلیم ہے۔" رستم کے بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر مغیرہؓ نے بڑے جذبے سے کہا: "اس دین حق کی ایک تعلیم یہ ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لایا جائے۔"

ایرانی سپہ سالار کی فطرت جاگ اٹھی اور اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا" یہ تو واقعی بہت اچھی تعلیم ہے کیا تمھارے اس دین کی کچھ اور تعلیم بھی ہے؟" حضرت مغیرہؓ نے فرمایا: " ہمارا دین یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا کے سارے انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، سگے بھائیوں اور بہنوں کی طرح ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔" اللہ واحد کی عبادت اور اس سے محبت کا فطری جذبہ ہر انسان کی فطرت میں ہے ایران ہو یا ترکستان، ہندوستان ہو یا چین دین حق کی بنیادی دعوت ہر انسان کی فطرت سے مانوس ہے، کسی کے لیے اس دعوت میں اجنبیت نہیں ہے اور سارے انسانوں کے رحیم کی جانب سے آنے والی تعلیم اور بھیجے جانے والے پیغمبر تمام نوع انسانی کے رسول اور پیغمبر ہیں۔ ان کا خطاب کسی خاص نسل، گروہ اور قوم سے نہیں بلکہ نوع انسانی سے ہے ان کی پاکیزہ، بے لوث اور خیر خواہانہ زندگی کو ہر ایک کے سامنے پیش کیجیے، بے جھجک پیش کیجیے۔ یہ زندگیاں خود دین حق کے لیے دلیل روشن ہیں۔ بلاشبہ پچھلے انبیا کی زندگیوں کو ان کے متبعین نے من گھڑت افسانوں سے رنگین بنایا اور ان کی حقیقی زندگیاں ماند ہو گئیں لیکن اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی رسول سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی محفوظ ہیں اور ان کی زندگی بھی محفوظ ہے اور یہ زندگی ہر طرح کے افسانوں سے پاک ہے۔ اس زندگی کو اور ان کی انسانیت نواز تعلیمات کو بے کم وکاست اور بے جھجک ہر ملک ہر نسل ہر گروہ کے سامنے پیش کیجیے

آپ دیکھیں گے کہ ہر فطرت میں اس کلمہ کے لیے پذیرائی کا جذبہ ہے۔ بشرطیکہ آپ پوری دلسوزی حکمت اور داعیانہ تڑپ کے ساتھ پیش کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

دوسری تعلیم جو اسی سرچشمے سے پھوٹتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بندگی کرائے، آج پوری دنیا اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ دنیا کا سارا فساد اسی جڑ سے پھوٹ رہا ہے۔ آج کا ہر خوددار اور ذی شعور انسان اس مصیبت سے نجات چاہنے کے لیے بے تاب ہے۔ اس تعلیم کو یقین کی قوت اور سلیقے سے آپ جس ملک اور جس قوم میں بھی پیش کریں گے محسوس ہوگا کہ یہ مخاطب کے دل کی آواز ہے اس کے دل کی ایک کسک ہے جس کو آپ نے الفاظ کا جامہ دے دیا ہے۔ اور ہر دل کو اس کی پذیرائی کے لیے کھلا پائیں گے۔

تیسری تعلیم کہ دنیا کے تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور روئے زمین کے سارے مرد اور ساری عورتیں سگے بہن بھائیوں کی طرح ہیں ایک ایسی حقیقت اور ایسی دلنشیں تعلیم ہے جو دنیا کے اس وقت کے تمام جھگڑوں کو ختم کرنے والی ہے۔ بھائی اور بہن میں، بہن اور بہن میں بھائی اور بھائی میں باہم محبت، مودت، اخوت، پیار اور قربت ہوتی ہے نہ کہ کشاکش، نفرت، عناد اور بیزاری۔ آج جو قوموں کے درمیان نفرت بیزاری اور ایک دوسرے کے خلاف عناد اور دشمنی ہے۔، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ رب کی یہ تعلیم ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے، وہ اس حقیقت واقعی سے نابلد ہیں اور غلط افکار و نظریات کا شکار ہیں، دین حق کی اس تعلیم کو پورے زور اور حکمت کے ساتھ پیش کیجیے تو آپ محسوس کریں کہ ہر دل کو اس تعلیم سے سکون ملے گا۔ اور وہ اس کو اپنے دل کی آواز سمجھے گا۔ اور آپ کے وجود کو انسانی سماج کے لیے رحمت تصور کرے گا۔ ان حقائق اور بنیادی تعلیمات کو ایک اور عرب کمانڈر ربعی بن عامرؓ نے اسی ایرانی سپہ سالار کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا۔

”اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس فریضے پر مامور کیا ہے کہ ہم ان اللہ کے بندوں کو جن کو اللہ نے توفیق سے نوازا ہے انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور اس تنگ

دنیا سے نکال کر ایک وسیع اور کشادہ دنیا میں لائیں اور ظالمانہ نظام ہائے زندگی سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کے سائے میں لائیں۔ پس اللہ نے ہمیں اپنا دین حق دے کر اپنی مخلوق کے پاس بھیجا ہے تا کہ ہم لوگوں کو اس دین حق کی طرف بلائیں۔"

ہم سب اللہ کے بندے ہیں، ہم سب کی عبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہے جو پوری دنیا کا خالق ہے یہی وہ تعلیم ہے جس پر ہم پوری دنیا کے انسانوں کو متحد کر سکتے ہیں اور انسانی اتحاد کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اور اس حقیقت کے شعور سے قلب و نگاہ میں کس قدر وسعت، اعتماد اور قوت پیدا ہوتی ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان خوہ مرد ہوں یا عورت ہمارے بہن بھائی ہیں ہم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور سگے بہن بھائیوں کی طرح ہیں، اللہ سے تعلق و محبت کی یہ بنیاد اور صلہ رحمی کا یہ وسیع ترین تصور انسانیت کی مشترک میراث ہے، یہ وہ دعوت ہے جو ہمیشہ انبیا نے پیش کی ہے اور یہ ہر ملک ہر نسل، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر زبان کے بولنے والے انسانوں کے لیے یکساں قابل قبول ہے۔ سب کے جذبہ عبودیت کو تسکین دینے والی اور سب کے الجھے مسائل کو حل کرنے والی دعوت ہے، اس کو اپنانے میں نہ کوئی زبان آڑے آتی ہے نہ کوئی قومیت اور نہ نسل آڑے آتی ہے اور نہ کوئی ملک اور وطن اور نہ جغرافیائی حدود۔

اسلام کے داعی کو اسلام پر اسی نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دین، نسلی میراث یا ملی شعار نہیں ہے۔ یہ تمام انسانوں کا دین ہے اولاد آدم کی مشترک میراث ہے اس پر کسی قوم، کسی گروہ کا قطعاً کوئی اجارہ نہیں ہے، یہ مشرق سے طلوع ہونے والے سورج اور فضا میں چلنے والی ہوا کی طرح نوع انسانی کے لیے ایک عام نعمت ہے۔ یہ نعمت ہر انسان کے لیے ہے جو اس کو قبول کر کے اس پر ایمان لائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی سعادت پائے، خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، کسی ملک کا باشندہ ہو اور کسی قوم اور تہذیب سے تعلق رکھتا ہو۔

اسلام کا نظامِ معاملات و معاشیات

اسلام ایک ہمہ گیر دین ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے اصول و قواعد موجود ہیں اور یہ یقیناً زندگی کے تمام پہلوؤں کا کما حقہ احاطہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسی بنا پر اسلام میں معاملات و معاشیات کا ایک معتدل، جامع اور انسانیت کے دنیوی و اخروی فوائد پر مشتمل ایک نظام موجود ہے۔

اسلام رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز بلکہ بعض اوقات ضروری قرار دیتا ہے اور کسبِ حلال اس کی نظر میں فریضۃ بعد الفریضۃ کی حیثیت رکھتا ہے جیسے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ:

طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ (مشکوٰۃ)

"حلال کمائی کو تلاش کرنا فرض کے بعد ایک فرض ہے"

لیکن دوسری طرف دنیوی زندگی کے لیے متاع الغرور کے الفاظ بھی اسلام میں نظر آتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے لیے الدنیا کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا جس سے اس کی حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

اسلامی نظامِ معاشیات پر بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام و قرآن کی نظر میں معاشی مسئلے کو ایک مرتبہ و مقام تو یقینا حاصل ہے لیکن اس کی نظر میں معاش اور اس کی ترقی انسان کا بنیادی مسئلہ اور مقصدِ زندگی نہیں جیسا کہ دنیا کے دوسرے نظاموں سوشلزم، کمیونزم اور کیپٹل ازم میں سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ضروت اور راہ گزر ہے۔

ان سب باتوں کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں دنیا، اس کے وسائلِ معاش انسان کی ضرورت اور راہ گزر کے مراحل ہیں جیسا کہ بخاری شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: کن فی الدنیا کانك غریب او عابری سبیل "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی مسافر ہو بلکہ راستہ چلنے والے کی طرح دنیا میں رہو۔" اسی طرح ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ صحابہ کرامؓ نے دیکھا کہ وہ رزق کے

حصول میں بہت متحرک ہے اور پوری دلچسپی لے رہا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ اگر اس کی یہ دوڑ دھوپ اور دلچسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا "اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ ہی میں شمار ہوگی، اور اگر بوڑھے والدین کی پرورش کے لیے کوشش کر رہا ہے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہی شمار ہوگی۔ اور اگر اپنی ذات کے لیے کوشش کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچارہے تو یہ کوشش بھی فی سبیل اللہ شمار ہوگی۔ البتہ اگر اس کی یہ محنت زیادہ مال حاصل کر کے لوگوں پر برتری جتانے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے ہے تو یہ ساری محنت شیطان کی راہ میں شمار ہوگی"۔

(ترغیب بحوالہ طبرانی)

بہر حال انسان کی زندگی کی اصل منزل و مقصد اس سے آگے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں بہبود و تحصیلِ خیر ہے، لیکن ان دونوں منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لیے ضروری ہو جاتی ہیں جو اس کی دنیوی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ لہٰذا جب تک وسائلِ معاش انسان کے اصلی مقصد و منزل کے لیے راہ گزر کا کام دیں تو وہ فضل اللہ، خیر اور زینۃ اللہ ہیں، لیکن جہاں انسان اسی راہ گزر میں اُلجھ کر اسے اپنی اصل یعنی وسائلِ معاش کو راہ گزر بنانے کی بجائے اپنی منزلِ مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنالے، یعنی آخرت کو بھول کر صرف حصولِ دنیا کے پیچھے لگ جائے تو پھر یہی معاش، دولتِ دنیا، متاع الغرور، فتنہ، اور عدوُ بن جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو ایک مختصر جملہ میں بیان فرمایا ہے:

وابتغ فیما اتٰک اللہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک

(قصص ۷۷)

"تجھ کو اللہ نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی احسان کیا کر"۔

اسلامی نظامِ معاش:

اسلام ایک متوازن معیشت کا حامی ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ نہ تو یہ افراد کو اپنی محنت سے اکٹھی کی ہوئی ملکیت سے محروم کر دینے کی اجازت دیتا ہے جیسے کمیو نزم کہ وہ محنت کے باوجود مشکل و تنگدستی میں زندگی گزارے، نہ سوشلزم کے نظریے کے مطابق بغیر محنت کے عیش و عشرت میں لگے رہنے کی اور نہ سرمایہ دارنہ نظام کی طرح دولت پر سانپ کی طرح جمے بیٹھے رہنے کی، بلکہ اسلام متذکرہ بالا انتہاؤں کو ختم کرکے اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے زمین، اس کی پیداوار اور سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا اور رزق حاصل کرنا تمام انسانوں کا برابر پیدائشی حق ہے۔ کسی پر پابندی لگانے کی اجازت نہیں کہ فلاں رزق کے وسائل کو استعمال کرنے کا حق دار نہیں یا کوئی مخصوص طبقہ، نسل اس کی اجارہ دار بن کر دوسروں کو محروم کردے۔ اسلامی نظریے کے مطابق معیشت کے میدان میں ہر وہ شخص جو اپنی محنت واستعداد کے مطابق براہ راست ابتدا قدرت کے وسائل کے خزانے میں سے کوئی چیز لے اور اپنی محنت اور قابلیت سے اس کو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے کوئی دوسرا اِس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اسلام کی نظر میں جائز شرعی مالکانہ حقوق بہر حال احترام کے لائق ہیں اور جو ملکیتیں از روئے شرع جائز نہ ہوں انھیں بے شک ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں تو کوئی حکومت و مجلسِ قانون ساز اجتماعی بہتری کا نام لے کر انھیں سلب نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق دولت خواہ کسی بھی شکل میں ہو وہ اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اِسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی عطا سے ہی ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی ملکیت اصلاً اور انسان کی ملکیت تبعاً ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے :

واتوھم من مال اللہ الذی اٰتٰکم (نور: ۳۳)

”اللہ کے اس مال میں سے ان کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے“۔

جب دولت پر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اس میں تصرف کا حق عطا کیا ہے تو اس لیے اللہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی

اور اپنے مصالح کا پابند بنائے چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیا پر ملکیت تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد، خود مختار اور بے لگام نہیں بلکہ اس دولت پر اصلی مالک (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے کچھ حدود و قیود، قوانین اور پابندیاں عائد ہیں۔ جس جگہ وہ خرچ کرنے کا حکم دے وہاں خرچ کرنا اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت کر دے وہاں رُک جانا لازمی ہے۔ جن ذرائع سے دولت حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحیح قرار دی گئی ہے ان سے حاصل کرنا اور جن کے ذریعے حاصل کرنا منع فرمایا گیا ہے ان کو چھوڑنا ضروری ہے جیسے حرام، دھوکہ، ملاوٹ، سود اور رشوت وغیرہ۔

اسلام میں معاملات کی شرائط:

اس لیے اسلام میں معاملات کے لیے مندرجہ ذیل شرائط مقرر ہیں۔

۱۔ تراضی: یعنی فریقین کی رضا مندی، مثلاً دوکاندار اور خریدار دونوں آپس میں اس معاملے پر راضی ہوں، اسی طرح مزدور و مالک میں جو بھی معاملہ طے پائے تو دونوں کی رضامندی بہر حال ضروری ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی راضی نہ ہو تو اسلام اس معاملے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اس رضامندی سے شرعی رضامندی مراد ہے۔

۲۔ معاملہ باطل نہ ہو: یعنی معاملہ میں کوئی حرام چیز نہ ہو مثلاً کوئی ایسی تجارت یا زراعت کا معاملہ جس میں سود کی آمیزش یا دھوکہ ہو یا جھوٹ یا مبیعہ (بیچی جانے والی چیز) یا ثمن (قیمت) میں کوئی ایک حرام ہو تو اسلام ایسے معاملات کو بھی حرام اور باطل قرار دیتا ہے۔

۳۔ معاملہ فاسد بھی نہ ہو: یعنی فریقین آپس میں راضی ہوں اور معاملہ بھی باطل نہ ہو لیکن بعض خارجی اسباب کی بنا پر وہ معاملہ شرعاً صحیح نہ ہو جیسے بیع کے ارکان یعنی ایجاب و قبول میں کوئی نقص ہو مثلاً خرید و فروخت میں ثمن یا مبیعہ مجہول، نامعلوم ہو وغیرہ یا پھل آنے سے پہلے باغ فروخت کیا جائے وغیرہ بیع فاسد میں اگر خریدار نے سودا پر قبضہ کر لیا ہو تو بیع نافذ تو ہو جائے گی مگر سودی معاملے کے حکم میں ہوگا۔

اسلامی معیشت اور حلال وحرام کا تصور

ہر مسلمان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دین صرف عبادات تک محدود نہیں ہے کہ انسان نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی پابندی کرے اور سمجھ لے کہ دین پر عمل کرنے کی ذمہ داری پوری ہو گئی ہے بلکہ مکمل دین تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی پابندی کرے، چاہے وہ احکام عقائد سے متعلق ہوں یا اخلاق سے، عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، آدمی جس طرح مسجد میں اللہ کی عبادات کو انجام دیتا ہے، اسی طرح بازاروں، دفاتر، عدالت، خرید وفروخت اور دیگر لین دین اور معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگے یعنی تمام معاملات احکام شرع کے مطابق انجام دے۔ اسی سے دنیا وآخرت کی کامیابی نصیب ہو گی۔

اس لیے عبادات کی طرح معاملات کے شرعی احکام کو سمجھنا بھی انتہائی اہم ہے، کیونکہ لوگوں کے درمیان جو معاملات انجام پاتے ہیں، بیع وشرا، اجارہ، شراکت داری، کفالت ووکالت، سونے چاندی کے کاروبار، قرض، ادھار، رہن وغیرہ سب معاملات کے متعلق شریعت مطہرہ کے واضح احکام موجود ہیں۔ ان کی پابندی نہ کرنے سے انسان حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معاملات کو حلال طریقہ سے انجام دہی کا حکم فرمایا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ (المائدہ)

”اے ایمان والو! وعدوں کو پورا کرو۔“

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ۔

”یعنی ناپ تول پورا کرو اور لوگوں کے لیے ان کی چیزوں میں کمی مت کیا کرو۔“

اور اللہ تعالیٰ نے حرام خوری کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ (المائدہ)

یعنی یہ لوگ غلط باتوں کو سننے کے عادی اور بڑے حرام کھانے والے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات واحادیث میں حلال کھانے کا اور حرام خوری سے بچنے کا حکم فرمایا ہے اور حرام خوری پر سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"ظلم سے بچوں کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی ظلمتوں کا باعث ہوگا اور حرص سے بچو کیونکہ حرص ہی نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا، انھیں خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔" (رواہ مسلم)

اسی طرح ارشاد مبارک ہے:

"سنو! ظلم مت کرو، سنو! کسی کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔" (رواہ البیہقی)

بہر حال معاملات شریعت کے مطابق انجام نہ دینا یہ عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ اس سے انسان دانستہ و نادانستہ طور پر حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حلال و حرام کے دو اَساسی اصول:

اسلام میں حلال و حرام کو سمجھنے کے لیے دو چیزوں کو سمجھنا ضروری ہے:

(۱) حلال و حرام کا تعلق شریعت و قانون سازی کے اعتبار سے بھی اور اجر و ثواب یا گناہ وعقاب کے اعتبار سے بھی فقط اور فقط اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ حلال کمانے اور حرام سے بچنے کا اُس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خواہش اور اللہ کی ناراضی سے بچنے کا خوف نہ ہو۔

ایک شخص رشوت سے اس لیے بچتا ہے کہ یہ پیچ اور گھٹیا حرکت ہے، پیارے ملک پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ ایسے شخص کو رشوت سے بچنے کا کوئی ثواب نہیں، ثواب اُس وقت ملے گا جب وہ یہ سوچے کہ رشوت حرام ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور آخرت میں مجھے سزا ہوگی۔

(۲) اسی طرح بالفاظ دیگر حلال و حرام کا تعلق خالص آخرت کی طلب کے ساتھ ہے، یعنی حلال کو صرف اس لیے نہ کمایا جائے کہ وہ خوب نفع آور ہے اور حرام سے اس لیے نہ بچا جائے کہ اُس میں نفع کی امید کم ہے۔ یا حلال کی رغبت فقط اس وجہ سے ہو کہ یہ قانونی ہے اور

معاشرے میں رائج ہے اور حرام سے بے رغبتی فقط اس وجہ سے ہو کہ یہ قانوناً منع ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ بعض لوگ لاٹری سے بچتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کو غیر عاقلانہ، احمقانہ فعل سمجھتے ہیں، جس میں نفع کی امید نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ لاٹری سے بچنے کا یہ تصور خالص مادی اور دنیوی ہے جس پر کوئی ثواب نہیں۔ لاٹری سے بچنے کا ثواب اس وقت ہے جب اس کو گناہ سمجھا جائے، اس کو حرام سمجھا جائے اور آخرت کے خوف کے تحت اس کو رد کر دیا جائے۔

حلال وحرام کی دو قسمیں:

اسلامی معیشت میں حلال وحرام کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلامی معاشی قانون میں حلال وحرام

۲۔ اسلامی معاشی اخلاق میں حلال وحرام

اسلامی معاشی قانون میں جو چیزیں حلال وحرام ہیں، وہ اسلامی تہذیب کا خاصہ ہیں۔ دیگر تمام عالمی تہذیبوں میں ان کے ممنوع اور غیر ممنوع ہونے کا کوئی تصور نہیں، جبکہ جو چیزیں اسلامی اخلاق میں حلال یا حرام ہیں وہ ساری دنیا کے اخلاقی اصول کے مطابق ممنوع یا غیر ممنوع ہیں۔ اسلامی معاشی قانون میں درج ذیل چیزیں حرام ہیں جو دنیا کی باقی تمام تہذیبوں میں غیر ممنوع ہیں:

- ✓ سود
- ✓ جوا اور اس کی تمام جدید شکلیں
- ✓ مردار، سور، خون کی خرید فروخت (اکل وشرب کے لیے)
- ✓ تمام نشہ آور اُمور جیسے شراب، ہیروئن، چرس وغیرہ
- ✓ فحش لٹریچر، رسائل، ناول، ڈائجسٹ، فحش فنون لطیفہ، ڈرامے، فلمیں، نغمے اور موسیقی

اسلامی معاشی اخلاق میں جو چیزیں حلال یا حرام ہیں وہ دنیا کے عالمی تہذیبی اخلاق کے مطابق ہیں، مثلاً ملاوٹ، دھوکہ، لوٹ کھسوٹ، کسی کا ناحق مال دبانا، جھوٹ سے ناقص مال بیچنا، رشوت، یتیم کا مال کھانا، قرضے کی واپسی میں ٹال مٹول، بغیر ڈیوٹی یا ناقص ڈیوٹی کے

بدلے مکمل تنخواہ وصول کرنا، صارفین کو دل فریب تجارتی اسکیموں کے ذریعے دامِ فریب میں پھنسانا، محکمانہ دفاتر میں تاخیری حربے اور رشوت کی گرم بازاری، غبن اور قرضوں کی خُرد بُرد، عوام کی ضرورت کے وقت ذخیرہ اندوزی، صنعتی وتجارتی اجارہ داریاں اور قیمتوں پر ظالمانہ کنٹرول، اسی طرح جاگیرداروں کا مزارعین کی مکمل معاشی زندگی پر سفاکانہ کنٹرول، مزدوروں کا استحصال۔۔۔۔ یہ تمام اُمور بین الاقوامی اخلاقی اصولوں کے خلاف ہیں اور دنیا کا ہر مذہب، قوم، باشعور انسان ان امور کو قبیح اور ناپسندیدہ قرار دیتا ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں ان اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے لیے مناسب قانون اور اُس کی علمبرداری بھی موجود ہے۔

حلال وحرام قانونی اعتبار سے ہو یا اخلاقی اعتبار سے، اُس سے متعلق دو باتوں کا جاننا ضروری ہے:

(۱) اسلام میں دونوں قسم کے حلال وحرام کی قباحت ہے۔ ان کا گناہ وثواب، ان کی اخروی ودنیوی قباحت، ان پر اللہ کی محبت یا ناراضی بالکل برابر درجے کی ہیں، چنانچہ جو شخص قانوناً جائز کاروبار کرتا ہے لیکن اللہ کے نزدیک حرام کاروبار کرتا ہے تو اس کے مقہور ومغضوب ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۲) جو شخص اسلامی اخلاق کے حلال وحرام کا خاص خیال رکھتا ہے، لیکن اس کے ذہن کی رسائی فقط ملی، قومی محبت اور انسانیت کی خیر خواہی پر مبنی ہے۔ یعنی وہ حرام کردہ اُمور سے فقط قومی اور انسانی مصلحت کے تحت اجتناب کرتا ہے، تو یہ شخص اسلامی اخلاق کا حامل نہیں کیونکہ اسلامی اخلاق ہر قبیح اور ناپسندیدہ حرکت سے اجتناب کو اس وقت قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب اولاً اس اخلاق کے پس پردہ اجر وثواب، رضائے الٰہی، حاکمیت الٰہی کا اعتراف، توجہ وانابت اور آخرت کی طلب وجستجو شامل ہو۔ رب العالمین کے حضور اس دستک کے ساتھ بات کو ختم کرتا ہوں کہ وہ ذات ہمیں معاملات میں حلال وحرام کی سمجھ وعمل کی توفیق دے۔ آمین

زکوٰۃ کی اقتصادی و معاشی اہمیت

اسلامی معاشی نظام کی ایک اہم کڑی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف یہ انفرادی عبادت ہے تو دوسری جانب یہ سماجی فلاح و بہبود کی ایک بہترین ویلفیئر اسکیم ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد قربِ خداوندی اور پاکی کا حصول ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے کا دل، دولت کی بے جا محبت اور حرص و طمع جیسی برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ پاکی تزکیۂ نفس کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ زکوٰۃ سے مال بھی پاک ہوتا ہے۔ کسب معاش کے دوران نادانستہ طور پر ہمارے مال میں ناپاک اجزا شامل ہو سکتے ہیں اور ہمارا مال حرام اجزا کی آمیزش سے آلودہ ہو سکتا ہے، زکوٰۃ سے ایسی نادانستہ آلائشوں سے ہمارا مال پاک ہو جاتا ہے۔

یہ سماج میں معاشی عدل کے قیام کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ قرآن نے ایک جگہ اپنی مالیاتی پالیسیوں کا مقصد بتاتے ہوئے کہا: "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ "(سورہ الحشر)

تاکہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ یہ مقصد زکوٰۃ کا بھی ہے، جیسا کہ ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر صدقہ (یعنی زکوٰۃ) فرض کیا ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں کو لوٹائی جائے گی۔

یہ زکوٰۃ کے مقاصد میں شامل ہے کہ سماج کے غریب اور محروم طبقات کو معاشی لحاظ سے اوپر اٹھایا جائے اور انھیں مناسب معیار کی زندگی گزارنے کے لائق بنایا جائے۔ زکوٰۃ کے نظام کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ غریبوں کی زندگیوں میں تبدیلی واقع ہو۔

علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: "زکوۃ اس کا نام نہیں ہے کہ فقیروں کو چند روپے تھما دیے جائیں۔ زکوۃ کا مقصد یہ ہے کہ لینے والا اسے لے کر خود کفیل ہو جائے اور معیاری زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جائے"۔

زکوٰۃ دینے اور لینے کے براہ راست فوائد یہ ہیں کہ زکوٰۃ اس کے ادا کرنے والوں کو بخل سے پاک کرتی ہے اور اس کو مال کی غلامی سے آزادی عطا کرتی ہے۔ یہ دونوں مرض باطنی (روحانی) بیماریوں میں خطرناک ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان بدبختی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورہ الحشر)

زکوٰۃ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی مشق ہے۔ زکوٰۃ اللہ کی نعمت کا شکریہ ہے اور دل کو دنیا کی محبت سے پاک کرنے اور روح کو تازہ اور مال کو پاکیزہ کرنے کی دوا ہے۔

زکوٰۃ لینے والا اپنی ضرورت سے آزاد ہو جاتا ہے خواہ وہ مادی ضرورت ہو، جیسے کھانا، پہننا اور رہائش، یا نفسانی ضرورت، جیسے شادی یا پھر معنوی ضرورت ہو، جیسے علمی کتابوں کی فراہمی۔ اس لیے مال زکوٰۃ ان تمام ضرورتوں میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

زکوٰۃ آخذ (لینے والا) کو حسد و عداوت اور بغض و کینہ سے پاک کرتا ہے۔ اس لیے ایک فقیر اور ضرورت مند جب اپنے ارد گرد لوگوں کو پر سکون اور عیش کی زندگی میں دیکھتا ہے اور وہ لوگ اس کے لیے دست تعاون بھی دراز نہیں کرتے ہیں تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس کا دل کینہ اور حسد سے محفوظ رہ جائے۔ پھر اس وجہ سے بھائی چارے کی دیواریں متزلزل ہونے لگتی ہیں، محبت کے جذبات سرد پڑنے لگتے ہیں اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ زکوۃ کئی بالواسطہ طریقوں سے بھی غریبوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

دنیا بھر میں عام طور پر آمدنی پر ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ اسلام نے اس عام رجحان کے خلاف زکوٰۃ اثاثوں پر عائد کی ہے۔ کسی فرد یا کمپنی کے جملہ اثاثوں پر ڈھائی فیصد سالانہ کی شرح سے زکوۃ عائد ہوتی ہے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ازالۂ غربت اور دیگر مدات زکوٰۃ کے لیے بھاری رقوم حاصل ہو جاتی ہیں۔ متوسط درجے کے لوگ تھوڑا بہت سونا اور دیگر اثاثے رکھتے ہیں اور اپنی تنخواہوں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ انہیں اس دباؤ کا اندازہ نہیں ہوتا، جو زکوۃ نہایت مالدار اور بڑے

بڑے اثاثوں کے مالکوں پر ڈالتی ہے۔ وہ انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے اثاثوں کو کبھی بے کار نہ رکھیں اور ہمیشہ ان کا پیداواری Productive استعمال کریں۔

روزگار کی کمی اور غربت کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا کہ جو دولت اور اثاثے سماج میں معاشی سرگرمی اور پیداوار کا ذریعہ بن سکتے تھے، وہ ذخیرہ اندوزی کی شکل میں بے کار پڑے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ملک میں موجود دولت پوری طرح روزگار کی افزائش کے لیے اور معاشی سرگرمی کے لیے استعمال نہیں ہو پاتی۔ زکوۃ ایسا ہونے نہیں دیتی، چونکہ زکوۃ آمدنی پر عائد نہیں ہوتی، بلکہ اثاثوں پر عائد ہوتی ہے، اس لیے اثاثوں سے آپ دولت کمائیں یا نہ کمائیں، ہر حالت میں ڈھائی فیصد مالیت زکوۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے۔

اگر کوئی اپنے مال کو بے کار رکھتا ہے تو سال بعد زکوۃ کی ادائیگی کی وجہ سے اس میں کمی ہونے لگتی ہے۔ اگر ایک کروڑ روپے بے کار گھر میں رہیں تو سالانہ ڈھائی لاکھ روپے زکوۃ کی ادائیگی کی وجہ سے ستائیس سال میں وہ آدھے ہو جائیں گے۔ اس لیے زکوۃ مجبور کرتی ہے کہ ان اثاثوں کو معاشی سرگرمی میں مشغول کیا جائے اور کم از کم ڈھائی فیصد سالانہ سے زیادہ ان سے نفع کمایا جائے، تاکہ زکوۃ دینے کے بعد بھی وہ باقی رہ سکیں۔

یہ بے کار ذخیرے جب پیداواری کاموں کے لیے بازار میں آتے ہیں تو بازار میں دولت کی ریل پیل بڑھتی ہے اور روزگار پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایک کروڑ روپئے سونے کی صورت میں یا نقدی کی صورت میں گھر میں پڑے رہیں تو سماج کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لیکن اگر زکوۃ کی وجہ سے مجبور ہو کر انہیں بازار میں پیدواری کاموں کے لیے استعمال کیا جائے اور اس پیسے سے کوئی کارخانہ شروع ہو جائے تو اس سے کئی طریقوں سے براہِ راست و بالواسطہ روزگار پیدا ہونے لگتا ہے۔ کارخانے میں کئی مزدورں کو براہ راست ملازمت ملتی ہے۔ خام مال فراہم کرنے والوں، ٹرانسپورٹ کرنے والوں، تیار مال کی مارکیٹنگ کرنے والوں وغیرہ کو روزگار مل جاتا ہے۔ پھر کارخانے کے آس پاس مختلف قسم کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ کچھ لوگ باہر سے آنے والے مزدورں کے لیے رہائش وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں، ان کے بچوں کے لیے اسکول کھل جاتے ہیں۔ اس طرح

دسیوں طریقوں سے بالواسطہ روزگار کے مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔اس طرح چند کروڑ روپے بھی جب بازار میں فعال ہو جاتے ہیں تو بہت سے لوگوں کو غریبی سے اوپر اٹھانے کا سبب بنتے ہیں۔

دوسری جانب اثاثوں کی ذخیرہ اندوزی، قیمتوں میں مصنوعی اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ صورت حال بھی پیدا ہوتی ہے، جسے ”اثاثوں کا بلبلہ“ کہا جاتا ہے یعنی طلب میں اضافہ کی وجہ سے قیمتیں مصنوعی طور پر تیزی سے بڑھنے لگتی ہیں اور پھر اسی تیزی سے گرنے لگتی ہیں، مثلاً: زکوٰۃ لوگوں کو بے کار زمین کے بڑے بڑے پلاٹ خرید کر رکھنے سے روکتی ہے، کیونکہ پلاٹ کی قیمت پر ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا پڑتی ہے۔اس لیے پلاٹ ضرورت کے تحت اور زکوٰۃ ادا کرنے کی صلاحیت کے مطابق ہی خریدے جا سکتے ہیں اور باقی رقم پیداواری سرمایہ کاری میں استعمال ہوتی ہے۔پلاٹوں کی خریداری پر اس روک کی وجہ سے نہ مصنوعی مانگ کی وجہ سے قیمتوں میں مصنوعی اضافہ ہوتا ہے، نہ رہائش کی حقیقی ضرورت کے لیے زمین کی خریداری پہنچ سے باہر ہو پاتی ہے اور نہ وہ قیمتوں کا بلبلہ Price Bubble پیدا ہوتا ہے، جس کا مظاہرہ ملک کے کئی شہروں میں گذشتہ سالوں میں ہوا۔جب اثاثے پیداواری مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو اس سے جی ڈی پی بڑھتا ہے اور روزگار پیدا ہوتا ہے، نیز غربت ختم ہوتی ہے۔

معیشت

مدینہ منورہ اس اعتبار سے پورے جزیرہ عرب میں نمایاں تھا کہ وہاں تجارت اور زراعت دونوں کے مراکز تھے۔ طائف میں زیادہ تر زراعت ہوتی تھی تجارت کم تھی۔ مکہ مکرمہ میں صرف تجارت ہوتی تھی زراعت نہیں تھی۔ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت دونوں ہوتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے باغات اور کھیت تھے۔ کھجور اور انگور کے علاوہ بھی بہت سی دوسری پیداوار ہوتی تھی۔ تجارت میں اگرچہ اب مسلمان بھی شریک تھے، لیکن زیادہ تر تجارت اُس وقت بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک ایک کرکے ان میں سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ جو چیز اسلام کے نقطہ نظر سے قابل قبول تھی یا غلط نہیں تھی، اس کو حضور نے جاری رہنے دیا اور اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

یہ اسلام کی حکمت تشریع کا ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات اور تجارت کے ابواب میں اصل چیز حلت ہے، حرمت نہیں۔ بالفاظ دیگر اصول یہ ہے کہ لوگ جو کاروبار لوگ کر رہے ہیں اگر وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہیں ہے تو وہ کاروبار جائز ہے۔ شریعت نے بعض احکام مثبت طور پر دیے۔ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ میں جو ہجرت کے ایک دو سال بعد نازل ہوئی اس میں تجارت کے بارے میں بعض بنیادی احکام دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ تجارت وہ ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو۔ جائز معاملات میں ہو۔ اس میں کسی کو دھوکہ نہ دیا گیا ہو۔ تراضی سے ہو۔ ایک دوسرے کے طیب نفس سے ایک دوسرے کے مال کا تبادلہ کیا گیا ہو۔ جو تجارت ان ہدایات کے مطابق تھی وہ جائز قرار پائی اور جو ان ہدایات کے خلاف تھی یا ان میں ان ہدایت کی خلاف ورزی کا امکان تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادی۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ منفی چیزوں کی صراحت کر دی گئی کہ یہ چیزیں ناجائز ہیں اور تجارت اور کاروبار سے ان کو ایک ایک کرکے ختم کیا جائے۔ اس لیے عرب میں تجارت کی جتنی شکلیں تھیں ان میں سے ایک ایک کرکے کچھ شکلیں جو خالص منفی اور غیر منصفانہ تھیں

وہ ناجائز قرار پائیں اور بہت سی رائج الوقت شقوں کو جزوی اصلاحات کے ساتھ جائز قرار دے دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی بڑی بڑی پیداوار کھجور، جو، انگور، انجیر کی تھی اور کچھ پھل جن میں انار اور کیلا بہت نمایاں ہیں، کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ گندم پیدا ہوتا تھا لیکن تھوڑا تھا۔ عام طور پر لوگوں کی غذا جو ہوا کرتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی جو مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان نے کبھی مسلسل کئی دن تک گندم استعمال نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی گندم مدینہ منورہ کی بڑی پیداوار نہیں تھی۔ گندم کا بیشتر حصہ خیبر سے لایا جاتا تھا۔ یہ دور سے لانے کی وجہ سے مہنگا بھی تھا اور کم بھی تھا۔ مصنوعات میں زیادہ تر کپڑا، ہتھیار، لکڑی کا سامان شامل تھا۔ انگور کی پیداوار کی وجہ سے شراب کی پیداوار بھی تھی۔ اکثر شراب خانے یہودیوں کے تھے۔ وہ خود بھی شراب کا کروبار کرتے تھے اور ان سے لے کر دوسرے لوگ بھی قرب وجوار میں شراب کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ جب شراب حرام قرار پائی تو مہاجرین اور انصار دونوں میں شراب کا کاروبار کرنے والوں نے شراب کے کاروبار سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ چونکہ مدینہ منورہ میں مارکیٹ ختم ہو گئی اس لیے غیر مسلموں نے بھی ایک ایک کرکے شراب کا کاروبار ختم کر دیا۔

مدینہ منورہ میں جو افراد زمینوں کے مالکان تھے ان میں سے کچھ لوگ بڑے بڑے قطعوں کے اور بعض چھوٹے چھوٹے قطعوں کے مالکان تھے۔ چھوٹے قطعوں کے مالکان اپنی زمینوں پر خود کام کرتے تھے۔ بڑی زمینوں کے مالکان مختلف طریقوں سے اپنی زمینوں پر کام کرایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مزدوری دے کر کام کراتے تھے۔ کچھ لوگ مزارعت اور محاقلہ کی بنیاد پر کام کراتے تھے۔ یہ مختلف طریقے عرب میں رائج تھے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مزارعت کی بعض شکلوں کو ناجائز قرار دیا اور بعض کو جائز قرار دیا اور بعض کی اجازت دی۔ جن شکلوں میں سود، دھوکہ، استحصال یا اس طرح کی کوئی اور خرابی پائی جاتی تھی، ان شکلوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز قرار دیا اور جن شکلوں میں استحصال یا ربو نہیں پایا جاتا تھا ان کو آپ نے اجازت دے دی۔ مدینہ منورہ کی زمین اکثر بارانی تھی اس لیے سال میں ایک ہی فصل ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کنویں بھی تھے جن سے رہٹ اور اونٹ کے ذریعے پانی نکالا جاتا

تھا۔ جن باغات میں کنویں تھے ان میں سال میں دو فصلیں بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر باغات میں سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی۔

دستکاری میں گھریلو دستکاری بھی تھی اور اجتماعی دستکاری بھی تھی۔ گھریلوں دستکاری میں عموما کپڑے، سوت کاتنے، دھاگہ بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ جو بڑے کاروبار تھے اور جس میں ایک سے زائد لوگ کام کرتے تھے جس کو آپ فیکٹری یا کارخانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں زراعت، نجاری اور لوہاری کے آلات بنائے جاتے تھے۔ یہ سرگرمی عموماً بنو قنیقاع کے ہاتھ میں تھی۔ قرب وجوار کی آبادیاں زرعی آبادیاں تھیں اس لیے وہاں آلات زراعت کے کام کی خاصی گنجائش تھی۔ مدینہ منورہ کے تاجر ایمپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتے تھے۔ شام سے کپڑا اور استعمال کی دیگر اشیا منگوایا کرتے تھے۔ گندم کا بیشتر حصہ اردن سے آیا کرتا تھا۔ کاروبار میں یہودی بھی پیش پیش رہتے تھے اور شام کے مختلف علاقوں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں اور مراکز تے جہاں سے وہ ایمپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ بنو نضیر کے یہودی اس کام میں بڑے نمایاں تھے۔

ہجرت کے کچھ عرصہ بعد ایک واقعہ یوں پیش آیا کہ مسلمان بڑی تنگ دستی کے عالم میں تھے۔ یہودیوں کا ایک بڑا تجارتی قافلہ آیا۔ اس میں خوشبوئیں، جواہرات اور سمندری سامان غالبا موتی وغیرہ مدینہ کے بازار میں آکر اترا۔ مسلمان خواتین اور نوجوانوں نے حسرت کی ایک نظر سے ان سب چیزوں کو دیکھا اور دل میں محسوس کیا کہ تمام مال و دولت یہودیوں کے پاس ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ نہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی تسلی کے لیے قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔ ولقد اتیناك سبعا من المثانی و القرآن العظیم لا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم، ہم نے آپ کو قرآن اور سات مثانی عطا کیے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کی اسی عارضی نعمت پر آپ زیادہ دل میلانہ کریں۔ یہ ایک وقتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر ان کو دی ہے۔

غرض یہ تجارت بیشتر یہودیوں کی تجارت تھی۔ جس پر ان کا قبضہ تھا۔ انصار یعنی اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ان کے مقروض تھے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان

کی زمینیں ایک ایک کر کے یہودیوں کے قبضے میں جارہی تھیں۔ اس صورت حال پر مہاجرین کے آنے سے بہت فرق پڑا۔ مہاجرین تجارت کے بڑے ماہر تھے۔ مکہ مکرمہ میں اصل کام تجارت تھا۔ مہاجرین میں بڑے بڑے نامی گرامی تاجر تھے۔ سیدنا عثمان غنیؓ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، یہ بڑے بڑے صحابہ تھے اور تجارت کے فن میں طاق تھے۔ جب انھوں نے مدینہ منورہ کے بازاروں میں تجارت شروع کی تو یہودیوں کا زور بازار پر سے کم ہوتا چلا گیا اور ان کی بالادستی متاثر ہوئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بنو قینقاع کے بازار میں ہی کاروبار شروع کیا تھا۔ وہاں کے تاجروں نے بازار پر اپنی اجارہ داری بنائی ہوئی تھی۔ ایک شخص ابو رافع تھا۔ وہ تاجر حجاز کہلاتا تھا۔ پورے حجاز کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ بنو قینقاع کے پورے بازار بلکہ مدینہ منورہ کے بازار پر اس کا کنٹرول تھا۔ جو قیمت وہ قرار دیتا تھا وہ قیمت بازار کی ہوتی تھی۔ سب یہودی تاجر متحد ہو کر اس کے فیصلوں کی پابندی کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ایکا کر کے کسی غیر یہودی تاجر کو بازار میں پنپنے نہیں دیتے تھے۔ اس نے دو پیمانے بنا رکھے تھے۔ ایک پیمانہ دینے کے لیے اور ایک لینے کے لیے ہوتا تھا۔ اسلام نے بعد میں دو پیمانے رکھنے کی ممانعت کر دی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پہلے تاجر تھے جنھوں نے ابو رافع تاجر حجاز کی اس بالادستی کو ختم کر دیا اور ایک ایک کر کے اس کے غلط تجارتی طریقوں کو ختم کیا اور اس کے کنٹرول کو کمزور کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑا اہم فیصلہ یہ کیا کہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ایک نیا بازار قائم کیا جو مسجد نبوی کے قریب ہی تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے ایک متبادل بازار قائم ہو جائے اور یہودیوں کی شرارتوں اور اجاری داری سے مسلمانوں کو نجات مل جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو دنیاوی اعتبار سے بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ بڑی محترم شخصیت تھے۔ اللہ نے وسائل بھی دیے تھے اور تجارت کی مہارت بھی دی تھی۔

ان کو شکست دینا اور ان کے کاروبار کو خراب کرنا تو یہودیوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن چھوٹے مسلمان تاجروں کو یا ایسے لوگوں کو، جن کا رسوخ کم تھا، ان کو یہودی تاجر تنگ کیا

کرتے تھے۔ خاص طور پر اپنے مسلمان خریداروں کو بھی یہودی دکاندار تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کا مشہور واقعہ بھی اسی پس منظر میں ہوا جس کی وجہ سے غزوہ بنوقنیقاع ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

ان ساری چیزوں کا سد باب کرنے کے لیے اور ایک متبادل تجارتی پلیٹ فارم قائم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بازار قائم کیا جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تمھارا اپنا بازار ہے۔ اس میں کوئی بھی تمھارے ساتھ زیادتی یا کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تم سے کوئی ظالمانہ ٹیکس نہیں لے گا۔ یہودی اپنے بازار میں بیٹھنے والے مسلمانوں سے غیر ضروری ٹیکس بھی لیا کرتے تھے اور ان پر طرح طرح کے مالی تاوان اور بوجھ ڈالا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے بازار میں کاروبار کرنے والے مسلمان تاجروں کے لیے ٹیکس ریلیف کا اعلان کیا کہ کوئی اضافی بوجھ تم پر نہیں ڈالا جائے گا۔ مزید فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس بازار میں مال لا کر بیچے گا وہ اسی اجر کا مستحق ہوگا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے، جو ہمارے اس بازار میں مال لے کر آئے گا وہ اسی طرح کے اجر کا مستحق ہوگا جس طرح کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کے بازار کو کامیاب بناتا ہے وہ مسلمانوں کی معاشی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ مسلمانوں اور امت مسلمہ کی آزادی کو یقینی بنانے والا کوئی بھی عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ نے فرمایا کہ ہمارے اس بازار میں کوئی شخص اگر ذخیرہ اندوزی کرے گا تو اس کو اتنا ہی مجرم سمجھا جائے گا جس طرح کہ کتاب اللہ میں الحاد کرنے والا، کتاب اللہ کی معانی میں غتربود کرنے والا یا کتاب اللہ کے معانی کو غلط بیان کرنے والا۔

مدینہ میں اس زمانے کے بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح بارٹر کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ لوگ ایک چیز دے کر دوسری چیز لے لیا کرتے تھے۔ ابتدائی معیشت میں ہر جگہ بارٹر کا سسٹم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں بھی تھا۔ یہودیوں نے اس بارٹر سسٹم کو بھی اپنی بالادستی کا

اور اپنے معاش کنٹرول کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ زرعی پیداوار پر قبضہ اور کنٹرول عموماً یہودیوں ہی کا ہوتا تھا۔ صنعت اور تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے جب فصل کٹنے میں ابھی کافی وقت ہوتا تھا لوگوں کو چیز دیتے وقت کہتے تھے کہ یہ اچھی چیز ہے اور جب لوگوں کی پیداوار وصول ہو جاتی تھی او وہ قرض وصول کرنے آتے تو کہتے کہ تمھاری پیداوار گھٹیا ہے اس لیے تمھیں زیادہ دینا پڑے گا۔ اپنی پیداوار کو اعلیٰ اور دوسروں کی پیداوار کو گھٹیا قرار دیتے تھے، اور مثلاً ایک کلو کے بدلے میں دو کلے لے لیا کرتے تھے۔ یہ بھی استحصال کا ایک طریقہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ربا کے احکام کے تحت کاروبار کی بہت سی شکلوں کو ناجائز قرار دیا تو آپ نے اس شکل کو بھی ناجائز قرار دیا۔ اس کو ربا الفضل کہا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں چھ چیزوں کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ الذھب بالذھب والفضة بالفضة والشعر بالشعیر والملح بالملح والتمر بالتمر والحنطة بالحنطة مثلا بمثل یدا بید والفضل ربو۔ یعنی سونا اور چاندی، جو، کھجور، گندم اور نمک کا جب باہمی لین دین کیا جائے تو دست بدست کیا جائے، فورا دیں اور فورا لیں اور برابر سرابر کی بنیاد پر لین دین کیا جائے۔ زیادتی ہوں گی تو اس کو ربٰو سمجھا جائے گا۔

اس حکم نے دو اچھے نتائج پیدا کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے نتیجہ میں بارٹر کے کاروبار میں خود بخود کمی آئی اور زری معیشت یعنی مانیٹری اکانومی کو فروغ ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے استحصال کا ایک بہت بڑا طریقہ ختم ہو گیا۔ اور وہ جس انداز سے مسلمان تاجروں اور ساہوکاروں کو نقصان پہنچا رہے تھے وہ سلسلہ رک گیا۔ یہ ربٰو کی وہ قسم ہے جس کو فقہانے ربٰوالبیع یا ربٰوالفضل یا ربٰوالحدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا الگ بازار قائم فرمایا تو اس کو اور آئندہ کی معاشیات کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لیے آپ نے بعض ہدایات دیں جو ابھی تک اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بازار میں جو لوگ کاروبار کریں، وہ آزادانہ رضامندی کے ساتھ کاروبار کریں اور کوئی بیرونی قوت ان کو

کسی خاص انداز پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرے۔ یعنی مصنوعی طور پر قیمتوں میں کمی بیشی نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی نہ ہو اور کسی کو اپنا سامان بازار میں لانے سے روکا نہ جائے۔ اس زمانے میں یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ یہودیوں کے بازار میں باہر سے جو لوگ آتے تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں چمڑے کی مصنوعات کا بڑا رواج تھا۔ وہاں سے کوئی تاجر اپنا چمڑہ فروخت کرنے کے لیے آتا۔ تو جب یہودی ساہوکاروں کو پتہ چلتا کہ چمڑہ آرہا ہے تو یہودی ساہوکاروں کے نمائندے باہر سے آنے والے تاجر سے راستے ہی میں سارا ذخیرہ خرید لیتے تھے اور بازار تک اس کو آنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ یہ تاجر اگر خود بازار آئے تو اس کو قیمتوں کا پتہ چل جائے گا اور وہ اپنے مال کو بہتر قیمت پر بیچ سکے گا۔ اس سے روکنے کے لیے پہلے ہی جا کر اس کا مال خرید لیتے تھے اور پھر لا کر من مانی قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ اس طرح ان کو ذخیرہ اندوزی کا موقع بھی ملتا تھا۔ قیمتوں کے تعین میں بھی اپنی مرضی چلاتے تھے اور اس شخص کو جو اصل مال لے کر آیا ہے اس کو ایک معقول قیمت سے محروم کر دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی اور اس مداخلت کو ناجائز قرار دیا۔ حدیث میں کئی مواقع پر آیا ہے کہ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تلقی الجلب، اس سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو بازار میں آنے سے پہلے ہی جا کر اُونے پونے داموں خرید لیا جائے، اس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ تلقی جلب کے معاملہ کو آج کی معاشیات کے نظام میں کیسے بیان کیا جائے گا۔ اس کے لیے حکومت کو قواعد بنانے چاہییں۔ سرکاری ریگولیٹری اداروں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ مارکیٹ تک رسائی ہر شخص کو یکساں طور پر حاصل ہو۔ کوئی ایسا گروہ نہ ہو جو نئے آنے والوں کو مارکیٹ میں آنے سے روکے۔ اسی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا یبیع حاضر لباد، لغوی اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شہری آدمی دیہاتی کے لیے مال فروخت نہ کرے۔ یہ بھی تلقی جلب کی ایک شکل ہے۔ دیہات میں لوگ بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مثلاً اونٹ کے اون سے لوگ خیمے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح سے خوراک کا بہت سا سامان بدوؤں کے ہاں تیار ہوتا تھا۔ شہری لوگ جا کر وہاں سے بہت معمولی قیمت پر سامان خرید لیا کرتے تھے۔ آج

بھی ہمارے دیہاتوں میں یہ ظلم بہت ہوتا ہے۔ دیہاتوں میں اونے پونے داموں چیز خرید کر بڑے شہروں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ حکم ایسے ہی معاملہ کے لیے ہے کہ کوئی شہری آدمی دیہاتوں سے چیز معقول قیمت سے کم پر خرید کر مہنگی فروخت نہ کرے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الکالئی بالکالئی، یعنی ادھار کی خرید فروخت ادھار کے ساتھ درست نہیں ہے۔ آپ کا کسی کے ذمہ کوئی قرض ہے۔ اس شخص کی رقم کسی اور کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ان دونوں رقموں کا آپس میں تبادلہ ہو جائے یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ کم از کم ایک طرف کی چیز نقد ہونی چاہیے اور اس کو موقع پر موجود ہونا چاہیے۔ ان ساری اصلاحات کو ایک ایک کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا۔ پھر جب یہ اصلاحات نافذ ہو گئیں تو آپ نے بازاروں پر نگران مقرر فرمائے۔ حضرت سعید بن العاصؓ کے بارے میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ان کو وہاں بازار کی نگرانی کے لیے مقرر فرمایا تاکہ ان تمام شرائط اور قواعد کی پابندی کرائیں۔

اس زمانے میں ایک عام طریقہ یہ بھی تھا کہ ہر بااثر شخص یعنی کوئی قبائلی سردار یا چند افراد کا ایسا گروہ جن کے پاس اسلحہ، قوت، اور تعدادد ہو، وہ جنگلات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ اپنے اثر ورسوخ کے زور پر چارگاہوں یا ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے جہاں پانی اور زراعت کی بہتات ہو اور اس کو اپنے جانوروں کے چرنے کے لیے خاص کر دیا کرتے تھے۔ اس جگہ کو حمیٰ کہا جاتا تھا۔ کہ فلاں سردار کی حمیٰ ہے۔ عربوں میں بہت پہلے سے یہ رواج تھا۔ اس پر جنگیں بھی ہوئیں۔ ایک مشہور جنگ جو داحس اور غبراء کی جنگ کہلاتی ہے وہ بھی اس حمیٰ کی وجہ سے ہوئی۔ کسی سردار کے حمیٰ میں کسی کی اونٹنی چلی گئی۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے جواب میں اس کے گھوڑے کو قتل کر دیا گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اس جنگ کی داستان عربی زبان کے ادب میں تفصیل سے ملتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حمیٰ کو ختم کر کے حکم دے دیا کہ لاحمی الا اللہ و رسولہ، حمیٰ قائم کرنے کا اختیار صرف حکومت یا ریاست کو ہے۔ حکومت اپنے سرکاری جانوروں، صدقہ کے جانوروں کے لیے یا فوجی جانوروں کے لیے حمیٰ یعنی سرکاری چراگاہ مقرر کر سکتی ہے۔ باقی کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ پبلک کی زمین کو اپنے لیے خاص کر لے اور اس کو عام انسانوں کے لیے ممنوعہ علاقہ قرار دے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے قریب بعض چراگاہوں کو حمیٰ قرار دے دیا جہاں صدقے کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ ان میں ایک چراگاہ وہ تھی جہاں بنی عرینہ کے بعض لوگ بھیجے گئے تھے جنھوں نے حضور کے کارندے کو شہید کر دیا تھا۔

بازار کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بازار میں اوزان اور پیمانے متعین ہوں۔ اگر ہر شخص الگ الگ اپنے اوزان اور پیمانے رکھے گا تو بازار میں سنٹرلائزیشن اور معیار بندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانیٹری اکانومی کی حوصلہ افزائی کر کے بازار اور تجارت میں اسٹینڈرڈائزیشن کو بہتر اور مقبول قرار دیا۔ معیار بندی کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ پیمانوں اور اوزان کو متعین کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ بھی تھا کہ مختلف علاقوں میں مختلف پیمانے اور اوزان مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ کا پیمانہ اور تھا مدینہ منورہ کا پیمانہ اور تھا۔ اب مکہ کے لوگ چونکہ تجارت میں نمایاں تھے۔ دور دراز کی تجارت میں نقد رقم لے کر جایا کرتے تھے۔ سونا اور چاندی کی صورت میں ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں ہوتی تھیں، اس لیے سونے اور چاندی کی پرکھ کا معیار مکہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھا۔ مدینہ میں زراعت زیادہ تھی اس لیے چیزوں کو ناپنے کے پیمانے مدینہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ المکیال مکیال اہل المدینہ، ناپنے کے پیمانے مدینہ کے معیاری مانے جائیں گے اور والوزن وزن اہل مکہ، اور سونے چاندی کو تولنے یا گننے کے پیمانے اہل مکہ کے معیاری مانے جائیں گے۔ یعنی سکوں اور سونے چاندی کا معیار مکہ کے معیار کے مطابق ہو گا اور اس لیے کہ وہ تجارت کا مرکز ہے۔ زرعی پیمانے مدینہ کے ہوں گے کیونکہ وہاں زرعی کاروبار زیادہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار میں نگران اور انسپکٹروں کے علاوہ بہت سے اور افراد بھی مقرر فرمائے ایک صاحب الاعشار ہوتا تھا۔ یہ تاجروں کے سرمائے کا اندازہ کر کے ان سے عشر لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب الخراج مقرر فرمایا۔ یہ زمین کی پیداوار سے حصہ وصول کرتا تھا۔ ایک صاحب الجزیہ مقرر فرمایا۔ یہ غیر مسلموں سے ٹیکس لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب المساحہ مقرر فرمایا تھا جو زمین کی جانچ اور پیداوار کا اندازہ، یعنی assessment کرتا تھا۔ کئی صوبوں میں الگ الگ عامل زکوۃ مقرر فرمائے۔ کاتب صدقات الگ مقرر فرمائے۔ عبد اللہ بن رواحہ کی مثال دی جا چکی ہے جو زمینوں اور زرعی پیداوار کا تخمینہ اور assessment کرنے کے لیے خیبر بھیجے گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے معاہدات فرمائے تھے۔ حرمت سود کے بعد سے جتنے معاہدات فرمائے ان میں یہ بھی فرمایا کہ تم سودی کاروبار نہیں کرو گے اور بعض غیر مسلم قبائل سے کیے جانے والے معاہدہ میں یہ بھی لکھا کہ تم میں سے جو سودی کاروبار کرے گا تو اس کے ساتھ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدہ کیا گیا اس میں ان کو بہت سے مراعات اور حقوق دیے گئے۔ آج مذہبی آزادی کے جتنے حقوق کی بات ہوتی ہے اس معاہدہ میں ان تمام حقوق کا تذکرہ ہے، لیکن اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ومن اربومنکم فذمة الله بريئة، تم میں سے جو کوئی ربوٰ کا کاروبار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ یعنی یہ معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربا کا کاروبار کر رہے ہیں اور سود میں ملوث ہیں۔ یہ اطلاع صحیح ثابت ہونے پر حضرت عمر فاروق نے اس معاہدہ کو منسوخ کر دیا اور انھیں جلاوطن کر کے شام بھیج دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت تاجر

تاجر ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک نبوت ملنے سے پہلے کا دور جو چالیس سال پر محیط تھا اور دوسرا نبوت ملنے کے بعد کا دور، جس کا دورانیہ 23 سال کا ہے۔ اللہ کی شان کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دور میں عملی طور پر تجارت سے تو وابستہ رہے، لیکن نبوت کی بھاری ذمّہ داری ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی صرف اور صرف دین الٰہی کی تبلیغ، ترویج واشاعت اور اس کی سربلندی کے لیے وقف کردی تھی، لہٰذا عملی طور پر تجارت سے وابستہ تو نہ رہے بلکہ اپنی تجارت دوسروں کے ذریعے اور شراکت سے کرتے رہے، لیکن اس دور میں دنیا کو تجارت کرنے کے اصول اور گر سکھا گئے جو رہتی دنیا تک کے لے بہترین رہنما اصول قرار پائے۔ جس کو ہر دور میں مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی معیشت وتجارت کے لیے نسخۂ اکسیر سمجھنے پر مجبور ہوئے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ شریعت بھی تمام شریعتوں کے لیے خاتم اور اس شریعت کو لانے والے بھی تمام انبیا کے خاتم ہیں۔

نبوت ملنے سے پہلے کے دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجر ہونے کی حیثیت سے دنیا کو عملی طور پر بھی بتا دیا کہ تجارت کس طرح کرنی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ماحول اور معاشرے میں آنکھیں کھولیں، وہاں عام معمول تجارت اور ساتھ ساتھ گلہ بانی کا تھا نیز قبیلہ قریش تجارتی لین دین میں مشہور بھی تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی خوب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا تجارتی سفر شام کی طرف اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ہوا جو محض تجارت کے تجربات کے حصول کے لیے تھا اور اسی سفر میں بحیرا راہب کا مشہور واقعہ بھی پیش آیا۔ دوسرا سفر بھی اسی ملک کی طرف ہوا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تاجر سیدہ خدیجہؓ کا سامان لے کر روانہ ہوئے تھے۔ مزید دو سفر یمن کی طرف بھی ہوئے۔ بحرین کی طرف بھی سفر کے آثار بعض کتابوں میں موجود ہیں۔ تجارت کے ان تمام اسفار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات زیادہ نمایاں تھیں، ان میں

راست گوئی، حسن معاملہ، ایفائے عہد اور صداقت، وامانت قابلِ ذکر ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے ملنے سے پہلے ہی صادق وامین کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے اور انھی صفات کو دیکھ کر حضرت خدیجہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغامِ نکاح بھیجا تھا۔

اسلام کی آمد سے قبل مکہ میں عقیق وعکاظ وغیرہ مشہور بازاروں میں تجارتی نمائشیں لگتی تھیں۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس نمائش میں اپنے 20 اونٹ لائے، جن میں سے ایک اونٹ معمولی لنگڑا تھا جسے ہر کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملازم کو فرمایا کہ مجھے ضروری کام پڑ گیا ہے، تو خریدار کو اس اونٹ کا عیب ضرور بتانا اور قیمت بھی نصف وصول کرنا۔ واپس آئے، پتا چلا کہ غلام عیب بتانا بھول گیا تھا اور قیمت بھی پوری لے بیٹھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا، فوراً اسے ساتھ لیا۔ خریدار چونکہ یمن کی طرف سے آئے تھے، ایک دن ایک رات کے مسلسل سفر کے بعد ان کا قافلہ مل ہی گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ان میں ایک اونٹ لنگڑا ہے تم یا تو وہ اونٹ واپس کردو یا اپنی آدھی قیمت واپس لے لو۔ ان کی خوشی سے آپ نے وہ اونٹ ان سے واپس لے کر انھیں قیمت واپس کردی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاجرانہ زندگی کا یہ وہ حسین پہلو ہے جو تاجروں کے لیے قابل عمل نمونہ ہے۔ اکثر تاجروں کے لیے انتہائی مشکل کا باعث یہ ہوتا ہے کہ ہم شرعی حکم کی وجہ سے اپنی چیز میں نقص بتا کر اپنا نقصان کیسے کریں جبکہ خریدار کو عیب کا پتا ہی نہ ہو۔ اس کے حل کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھنے کی تلقین فرمائی۔

ایک یہودی جس سے آپ نے کچھ قرض لیا تھا، وہ آکر سختی سے اپنے مال کا مطالبہ کرنے لگا۔ صحابہؓ نے اسے روکنا چاہا، آپ نے نے فرمایا: اسے اونٹ خرید کردے دو، صحابہؓ نے واپس آکر فرمایا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اس جیسا اونٹ تو نہیں مل رہا، اس سے اچھا ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی اسے خرید کردے دو اور فرمایا: ”تم میں سے بہترین وہی ہے جو ادائیگی میں اچھا ہو“۔

نبوت ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت اور تجارت کرنے والوں کے لیے اپنی احادیث مبارکہ کے ذریعے اتنی قیمتی اور بیش بہا ہدایات دیں کہ آنے والے فقہائے کرام نے جب ان کے مسائل کو مرتب کرنا شروع کیا تو عبادات کے مقابلے میں معاملات کے مسائل تین ربع تک پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی تجارت کرنے والوں کا نام سب سے پہلے تاجر رکھا جس کو سب نے پسند کیا حالانکہ پہلے اس کو "سمسار" کہا جاتا ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث مبارکہ سے حلال کمائی کی اہمیت کو بڑے واضح اور دوٹوک لفظوں میں ذکر فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تجارت میں صدق، امانت، محنت، حسنِ ادائیگی اور نرم خوئی جیسی صفات سے آراستہ تاجروں کے لیے نویدیں سنائیں تو دوسری طرف اس پیشہ میں جھوٹ، دھوکا بازی، فریب، مکاری، ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے لیے وعیدیں بھی سنائیں۔

معاملات اور تجارت کے باب میں نویدوں اور وعیدوں کا یہ حسین امتزاج وہ آکسیجن ہے جو کسی بھی نظام معیشت کو اعتدال کے ساتھ پروان چڑھا سکتی ہے۔ اسی امتزاج کے ہتھیار سے صحابۂ کرام جب لیس ہوئے تو انھوں نے بغیر کسی جنگ وجدل کے ملکوں کے ملک فتح کر لیے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ان صفات سے آراستہ صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے غیر مسلم کو نہ صرف اپنا گرویدہ بنایا، بلکہ اسلام کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے، اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ میں یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ ہمارے بازار میں وہی شخص خرید وفروخت کیا کرے، جس نے اپنے کاروبار سے متعلق علم حاصل کرلیا ہو۔ اسی طرح معاملات اور تجارت ومعیشت کو درست کرنا ریاست کی بھی ذمہ داری ہے۔

کوئی ملک قانون شکن بڑے مگر مچھوں پر ہاتھ ڈالے بغیر چھوٹے تاجروں کو تحفظ فراہم نہیں کرسکتا۔ اس بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ ملاحظہ کریں۔ قبیلہ ارش کے ایک شخص نے ابو جہل کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا، لیکن ابو جہل قیمت دینے میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس نے مکہ کے سب شرفا سے فریاد کی، مگر کوئی اس کے لیے جرات نہ کرسکا۔ ان دنوں ابو جہل اسلام دشمنی میں زوروں پر تھا۔ ان سرداروں میں سے ایک کو مذاق سوجھا۔ اس نے کہا

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاکر کہہ وہ تجھے رقم دلادے گا، وہ آپ کے پاس آیا۔ آپ اسے لے کر ابو جہل کے پاس پہنچے۔ اس نے آپ کو دیکھا تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا، رنگ و فق ہو گیا۔ آپ نے اسے فرمایا: اس کا حق ادا کرو۔ ابو جہل نے فوراً رقم دے دی۔ ان سرداروں نے ابو جہل سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سن کر مجھ پر ناقابلِ بیان رعب طاری ہو گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ بازاروں کا چکر لگاتے، ناپ تول کے پیمانوں کی تحقیق کرتے اور تاجروں کے معاملات کو بغور دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ ایک تاجر کی گندم کے ڈھیر کے پاس سے گزرے، اس میں ہاتھ ڈالا تو وہ اندر سے گیلی نکلی۔ آپ نے دریافت فرمایا: یہ کیا؟ اس نے کہا: بارش کی وجہ سے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا: ”گیلی گندم اوپر رکھتا تاکہ خریدار کو پتا چلتا۔“ پھر فرمایا: ”یاد رکھو! جس نے دھوکے فریب سے کام لیا تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“ دو شخصوں کو وزن کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”تولو اور جھکتا ہوا تولو“۔

تو یہ ہے چیکنگ اور فوری احکامات دینے کا موثر، منظّم اور مربوط نظام جس کی بدولت ایک ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ غور کیجیے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بازاروں میں نکل کر چیکنگ کو عار سمجھتے اور گھر بیٹھے صرف رپورٹ لے لیتے تو معاشرہ، ملک اور ادارے کبھی نہ سدھرتے۔ آج ہم مسلم اقوام تجارت و معیشت کے اسلام زریں اصولوں کو فراموش کرنے کی وجہ سے اپنے ہی گھر کے برتن بیچ کر خوش حالی کے خواب دیکھ رہے ہیں کہ اداروں کو خسارہ سے نکالنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا آج غلط معاملات اور خصوصاً سودی معیشت و تجارت سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ وہ ایک ایسے نظام معیشت و تجارت کی تلاش میں ہے جس میں تجارت سے متعلق ہر ایک طبقہ اور فرد کو اس کے جائز حقوق ملیں، دنیا کی خواہش ہے کہ اس میدان میں انصاف اور میانہ روی کا دور دورہ ہو، لیکن بد قسمتی سے آج ہم نے محسن انسانیتِ اور تاجرِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور ارشادات کو معیشت و تجارت کے میدان میں پسِ پشت ڈال دیا ہے تو ہم دوسروں کے لیے اس کو کیسے معیار بنا سکتے ہیں، لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم تجارتی معاملات کو شرعی حوالے سے سیکھ کر ان پر عمل کریں۔

"سود کی لعنت"

سود کو عربی میں ربا کہا جاتا ہے۔ ربا کا لفظی معنٰی ہے زیادتی، بڑھوتری جبکہ اصطلاح شریعت میں ربا سے مراد ایسی زیادتی ہے جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے۔

اَلرِّبَا فِی اللُّغَةِ الزِّیَادَةُ والمراد فِی الْآیَةِ کُلُّ زِیَادَةٍ لَا یُقَابِلُھَا عِوَضٌ

(احکام القرآن: لابن العربی)

ربا (سود) میں وہ زیادتی بھی داخل ہے جو روپیہ کو ادھار دینے پر حاصل کی جائے کیونکہ مال کے معاوضہ میں تو راس المال (اصل مال) پورا مل جاتا ہے، جبکہ جو زیادتی بنام سود (انٹرسٹ) لی جاتی ہے وہ بے معاوضہ ہے اور بیع و شرا (خرید و فروخت) کی وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہیں جن میں کوئی زیادتی بلا معاوضہ حاصل کی جائے۔ سود کا مطلب ہرگز صرف یہ نہیں کہ آپ نے کسی کو ایک روپیہ دیا اور سال یا ماہ کے بعد اس کے بدلے میں دو روپے وصول کیے، بلکہ سود یہ بھی ہے کہ آپ نے سود پر روپے لے کر تجارت میں لگایا یا آپ نے بلا سود قرض دے دیا مگر روپے دینے کی رعایت میں قرض دار سے اپنے اصل روپے لینے کے علاوہ کچھ اور فائدہ بھی اٹھایا مثلاً اپنی خدمت لی، یا کوئی چیز سستی خریدی، تو یہ سب سود میں داخل ہے۔

الغرض اسلامی شریعت میں سود قطعی حرام ہے اور ہر طرح کا سودی کاروبار بھی حرام ہے۔ اسلامی نظام معیشت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد سود کی ممانعت بھی ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اکثر مذاہب میں سود کو منع کیا گیا تھا، لیکن اسلام نے جس شدت اور تاکید کے ساتھ اس سے منع کیا ہے کسی اور مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں کم از کم پانچ آیات میں صراحتاً سود کو منع کیا گیا ہے، اور یہاں تک فرمایا گیا کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ۔ (البقرۃ: ۲۷۸)

احادیث میں بھی بکثرت سود کی مذمت کی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ کو لکھنے والے، اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والے سب پر

اللہ کی لعنت بھیجی ہے، (مسلم، عن جابر بن عبد اللہؓ) ایک روایت میں ہے کہ سود کا وبال تہتر قسم کا ہے، جن میں سے کمتر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے (مستدرک حاکم، عن عبد اللہ ابن مسعودؓ) حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم تینتیس بار زنا کرنے سے بڑھ کر ہے، (طبرانی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ سود ان برائیوں میں سے ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب آتا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب کسی آبادی میں زنا اور سود کی کثرت ہو جائے تو گویا اس آبادی والوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو اتار لیا (مستدرک حاکم) اور ایک روایت میں ہے کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو وہ قوم قحط سالی میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔ (مسند احمد، عن عمرو بن عاصؓ)۔

ظاہر میں تو سود لینے والے کا مال بڑھ رہا ہوتا ہے، لیکن در حقیقت سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں" (البقرہ: ۲۷۶) نیز حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے سود سے بہت سارا مال کمایا، انجام کار اس میں کمی ہی ہو گی، (ابن ماجہ) اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ سود سے بھی بچو اور شبہہ سود سے بھی بچو، 'دَعَوا الرِّبٰوا وَالرِّيبَةَ'' (ابن ماجہ) ایک طرف سود کی اس درجہ ممانعت ہے کہ شاید شرک کے علاوہ کسی اور برائی کو اس درجہ مذمت کی گئی ہو، اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشن گوئی بھی ہے کہ قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی، (طبرانی، عن عبد اللہ بن مسعودؓ) نیز ایک روایت میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود خوری سے بچ بھی جائے تو اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا (ابو داؤد، عن ابی ہریرۃؓ)۔

سود کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کا تبادلہ ہو، جیسے روپیہ کا روپیہ سے، سونا کا سونا سے، چاول کا چاول سے، گندم کا گندم سے اور ایک طرف سے زیادہ مقدار ہو اور دوسری طرف سے کم، جیسے ایک سو روپیہ دیا جائے اور ایک سو دس وصول کیا جائے، اور ایک سو کیلو چاول گندم دیا جائے تو ایک سو دس کیلو چاول گندم وصول کیا جائے، اسی لیے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول مقرر فرمایا کہ قرض پر قرض دھندہ کا کسی بھی طرح کا نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے: ''كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰو'' (الجامع الصغیر، عن علیؓ) صحابہؓ اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ مقروض کا تحفہ بھی قبول کرنے میں احتیاط کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو دس ہزار درہم بہ طور قرض دیے تھے حضرت ابی ابن کعبؓ نے اپنے باغ کا کچھ پھل حضرت عمرؓ کو تحفہ پیش کیا، حضرت عمرؓ نے واپس کر دیا، (بخاری و مسلم) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی کو قرض دو اور وہ تم کو کھانے کا طبق پیش کرے، یا اپنی سواری پر چڑھائے، اور پہلے سے اس طرح کے تحفے تحائف دینے کا اس کا معمول نہ رہا ہو، تو ایسے تحائف قبول نہ کرنا چاہیے، (ابن ماجہ) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا اور اس نے مجھے کچھ تحفہ دیا، تو حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یا تو اس تحفہ کے بدلہ میں تحفہ دے دو یا اس کو اپنے قرض میں شمار کر لو، (مصنف عبد الرزاق) اس لیے قرض دینے والوں کو اس سلسلہ میں خوب احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

افسوس کہ آج کل سود کی حرمت اور شناعت لوگوں کے ذہن سے نکلتی جا رہی ہے، بہت سے لوگ بات تو جائز اور حلال منافع کی کرتے ہیں، لیکن نقصان کا خطرہ قبول کرنے کو بالکل تیار ہی نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ ان کا نفع بہر حال متعین رہے۔ اور سرمایہ کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ یہ فکر سود خوارانہ ذہنیت کی عکاسی ہے۔ جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اپنا سرمایہ خوب سوچ سمجھ کر کسی کمپنی میں مشغول کیا جائے اور کمپنی کے کاروبار کی پہلی تحقیق کر لی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان اپنے ذہن کو اس بات کے لیے تیار رکھے کہ اگر اللہ کی طرف سے اس کے لیے نقصان ہی مقدر ہے تو اسے بھی وہ ہنسی خوشی برداشت کرے گا۔ سود کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں، جس میں ناواقفیت کی وجہ سے بعض دیندار لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں ایک صورت بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کی ہے، یعنی آپ ایک مخصوص مدت کے لیے بینک میں اپنی رقم رکھتے ہیں، اور اس مدت کے پوری ہونے پر بینک دوگونہ تین گونہ صورت میں یہ رقم آپ کو واپس کرتا ہے، ظاہر ہے یہ صورت صریحاً سود کے دائرہ میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے مطلقاً سود کو حرام قرار دیا ہے، کسی خاص خطہ اور علاقہ کی قید نہیں لگائی،

جیسے شراب، زنا، چوری اور ڈکیتی، مسلم ممالک میں بھی حرام ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی، اسی طرح سود کی ممانعت بھی ہر علاقہ اور مقام کے لیے حرام ہے اور اس سے بچنا مسلمان کا فریضہ ہے۔اسی طرح پرائز بانڈز، سرٹیفکیٹس جو نفع ملتا ہے یہ بھی ناجائز ہے اور اس کے علاوہ آج کل جو مختلف کمپنیوں کی طرف سے انعامی سکیموں میں بھی سود کی آمیزش پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح کے بعض اور معاملات بھی ہیں جو سود سے خالی نہیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دنیا حلال و حرام کی پرواہ کیے بغیر جس راستہ پر جارہی ہے ہم بھی وہی راستہ اختیار نہ کریں، بلکہ اپنے آپ کو سود جیسے گناہ سے بچائیں، کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے: جس کا گوشت مال حرام سے پیدا ہوا ہو، جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔
(مشکوٰۃ: ۲۴۲)

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملک خداداد پاکستان جو اسلام ہی کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اب تک سودی نظام اور سودی بینک کاری کی لعنت میں مبتلا ہے۔ ہماری معاشی بدحالی کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہی سودی نظام بھی ہے کیونکہ رب کائنات فرماتے ہیں کہ سود کا انجام ہی تباہی ہے۔ تو اس سے زیادہ واضح دلیل اور حقیقت کیا ہو سکتی ہے اس لیے اس ملک میں اسلامی نظام معیشت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے عملی اقدام کے لیے پختہ ارادے درکار ہیں۔ایک اسلامی ملک میں اسلامی معیشت کی طرف پیش قدمی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ممالک میں مسلم ماہرین معیشت دستیاب ہوں۔ اعلیٰ معیار کے مسلم ماہرین بنکاری موجود ہوں۔ اگرچہ یہ کام بہت طویل المیعاد ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی بنکاری کا کام اتنا ہی پرانا ہے جتنا پاکستان خود پرانا ہے۔

علامہ اقبال اور قائد اعظم کے درمیان ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کے برسوں میں بعض اہم خطوط میں پاکستان بننے سے دس سال پہلے اس بات پر غور فکر کا پتہ چلتا ہے کہ شریعت کی روشنی میں پاکستان کے معاشی امور اور اقتصادی مسائل کو کیسے حل کیا جائے گا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بنک کے قیام کے افتتاح کے موقع پر کہا کہ موجودہ دور نے دنیا کو دو معاشی نظام دیے ہیں ان دونوں معاشی نظاموں نے دنیا کو مصائب اور

بیماریوں کے علاوہ دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ لہٰذا ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسلامی شریعت کے احکام کی روشنی میں ایک ایسا نظام وضع کریں جو عادلانہ ہو اور دنیا کو ان دونوں نظاموں کے ظالمانہ نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔

عالمی سودی نظام معیشت کے مضرات اور بربادیوں کو دیکھتے ہوئے اور بابائے قوم اور شاعر مشرق کی دور بین اور برحق تمنا کے پیش نظر یہ وقت کی پکار ہے کہ اسلامی نظام معیشت کی فضیلت و افادیت سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ اس عظیم مقصد کے لیے اسلامی دنیا کے علاوہ مغربی دنیا میں بھی کام ہو رہا ہے اور پاکستان میں بھی بہت کام ہو چکا ہے لیکن اس کام کو مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھانے کے لیے ماہرین کی ضرورت کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار طبقہ کا سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ عملی اقدامات کی بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کرنے اور عملی اقدام کے لیے قدم اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سود کی خباثت اور معاشی تباہ کاریاں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کر کے رزق کا ذمہ خود لے لیا اور ہمیں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا۔ ہم صرف کاروبار کا ٹھیکہ لگاتے اور اس کی ظاہری شکل بناتے ہیں۔۔ باقی سب کاریگری اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ وہ کس گاہک کو کدھر بھیجتا ہے، کس کے دل میں کیا ڈالتا ہے، سودا کیسے فائنل ہوتا ہے۔ خوش قسمت کون اور بد قسمت کون ٹھہرتا ہے؟ نقصان سے حفاظت کیسے ہوتی ہے؟ یہ سب "اوپر" سے ہوتا ہے۔

بس اتنی سی بات اگر ایک مسلمان کو سمجھ آجائے تو پھر شاید حلال و حرام کے حوالے سے کسی طویل لیکچر کی ضرورت نہ ہو۔ جب انسان اس اصلی اور جوہری سوچ سے محروم ہوتا ہے تو وہ حرام کی طرف ایسے لپکتا ہے جیسے پروانہ شعلے کی جانب، جس کے مقدر میں جل کر راکھ ہو جانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایسی سوچ کے ہوتے ہوئے پیسے کا بہت زیادہ ہونا اور اندھا دھند کمائی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پر سکون رہ کر، اپنی محنت کا حق ادا کرتے ہوئے اور صرف جائز پر اکتفا کرتے ہوئے چلتا چلا جاتا ہے۔ وہ حیرت انگیز طور پر بزنس کے میدان میں ترقی کرتا ہے۔

اب اس طرح آیئے کہ انسان سود جیسی خبیث ترین کمائی کی طرف آخر کیوں لپکتا ہے؟ وہ کیوں اپنے پیٹ میں انگارے ٹھونستا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اتنا جری کیسے ہو جاتا ہے کہ اسے اللہ کے اعلانِ جنگ کی بھی پروا نہیں رہتی۔ شاید اس کی وجہ اس کے سوا نہیں کہ وہ یقین کی اسی بنیاد سے ہٹ جاتا ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔ وہ اپنی کامیابی پیسے کی بے تحاشا کثرت کو سمجھ لیتا ہے اور پھر گمراہی کی اندھی کھائی میں لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ وہ آمدن کے فارمولے میں سے "محنت" کو بھی نکال دیتا ہے۔ وہ پیسے پر پیسے کے سراسر حرام دھندے میں پڑ جاتا ہے۔

حالانکہ سود حرام کمائیوں میں سے سب سے گندی کمائی ہے۔ سب سے پہلے تو اللہ رب العزت کے خلاف ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ سود کی مذمت بیان کرتی ایک ایسی آیت جسے سن کر کسی بھی دردمند پر لرزہ طاری ہو جائے۔ فرمایا گیا: " مسلمانو! اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو

اور جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے، اسے چھوڑ دو۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ (البقرہ ۲۷۹،۲۷۸)

پھر یہ دیکھیے کہ انسان موت پر یقین رکھنے کے باوجود اس نہایت برے دھندے کے اُخروی انجام سے بے پرواہو جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس رات مجھے معراج ہوئی، میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ ایسے تھے جیسے اژدھوں سے بھر پور گھر اور اژدھے پیٹوں سے باہر دکھائی دیتے تھے۔ میں نے کہا: ''یہ کون لوگ ہیں؟ جبریلؑ نے جواب دیا: یہ سود خور ہیں۔'' (ابن ماجہ: ۱۶۵)

سود اتنی بری بلا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو سود کے پاس سے گزرنے والے پر بھی نفرت ہے۔ دیکھیے! سود میں ملوث ہر شخص کو کس طرح مستحق سزا شمار کیا گیا۔ سیدنا جابرؓ فرماتے ہیں: '' رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے پر، سود ہ کھلانے والے پر، سودی معاملات کا حساب کتاب کرنے والے پر اور سودی معاملے میں گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ گناہ اور وبال میں یہ سب برابر کے شریک ہیں۔ (ابو داؤد ۱۱۷/۲)

یہ وہ غلیظ کمائی ہے کہ انسان اس کو کھاتے ہوئے اپنی ماں کی عصمت کا ڈاکو بن چکا ہوتا ہے۔ اس میں سے غیرت رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ ایک حیوان بلکہ سراپا شیطان بن چکا ہوتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا: سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔

سود خور اللہ و رسول ﷺ کی نظر میں حد درجہ بے حیا اور غیرت سے عاری شخص ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کہتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سود کا ایک درہم یہ جاننے کے باوجود کھانا کہ یہ سود ہے چھتیس مرتبہ زنا کرنے کے گناہ سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ پاک کی باتوں پر سے ہمارا یقین ہی اٹھ گیا ہے۔ وہ اللہ جو ہمارا مالک و خالق ہے۔ جس نے رزق کا ذمہ خود اٹھایا ہوا ہے۔ جو ہماری جائز محنتوں کو کبھی ضائع نہیں

کرتا۔ شیطان کی باتوں پر ایسا ایمان لے آئے کہ سو فیصد نقصان دیکھ کر بھی اس سے پیچھے ہٹنے کو تیا ر نہیں۔ ہم کیا سوچتے رہتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمارہے ہیں: ''اللہ سود کو گھٹاتا اور خیرات کو بڑھاتا ہے''۔(البقرہ:۲۷۶)

سود کے نتیجے میں معاشرے میں ایک طبقہ نقصان برداشت کرتا رہتا ہے اور دوسرا طبقہ فوائد سمیٹتا رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے معاشرتی، اخلاقی اور معاشی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام ہمیں سود سے مکمل طور پر روکتا ہے۔ اس کے بجائے سرمایہ کاری کی بنیاد شراکت داری اور نفع ونقصان میں شرکت متعین کرتا ہے۔

سود کو جائز قرار دینے والے یہ بہانہ بھی پیش کرتے ہیں کہ سود دراصل بچت کا نظام قائم کرنے کے لیے ہے۔ معیشت میں سود نہیں ہو گا تو بچت نہیں ہو گی۔ اس بات کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے بچت وجود میں آتی ہے تو دوسری جانب یہ بات قابل غور ہے کہ یہ ایسی بچت کو وجود دیتا ہے جو سرمایہ کاری کو روکتی ہے، جبکہ سرمایہ کاری میں کمی معیشت پر برے اثرات ڈالتی ہے۔ سود کی بنیاد پر پوری مالیاتی نظام کی تاریخ شاید تین صدیوں کی ہو گی لیکن ایک اسلامی مالیاتی نظام کی تاریخ پندرہ صدیوں پر محیط ہے، جس میں سود کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ وہ سارے فوائد اور مقاصد سود کے بغیر ہی حاصل کیے گئے جن کے لیے ہم نے سود کو ناگزیر سمجھ رکھا ہے۔

اسلام نے فضول خرچی سے منع کیا، جس سے بچت خود بخود وجود میں آتی ہے ، پھر ان بچتوں کو سرمایہ کاری کے ذریعے سرکولیٹ(Cerculate) کرنے کی ترغیب دی، تاکہ ہر شخص مال یا تو خرچ کر کے معیشت کے پہیے کو چلائے گا یا پھر موقع دیکھ کر کاروبار میں لگائے گا۔ تجوریوں میں رکھ کر مال کو جمع کرنا اسلامی نظریہ نہیں ہے۔

دوسری جانب اسلام نے قرض کو ایک ''تعاونی معاہدہ'' قرار دیا، اسے ''تجارتی معاہدہ'' نہیں بننے دیا۔ یعنی جب بھی دوسرے کی مجبوری کے پیش نظر قرض دیا جائے، وہ تعاون کی نیت سے دیا جائے، نہ کہ اس پر نفع وصول کرنے کے لیے۔ قرض کو ایک تجارتی معاہدہ قرار

دینے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ حقیقی معاشی سرگرمیاں رک گئیں اور لوگ پیسے پر پیسہ کمانے کو ترجیح دینے لگے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ وہ لوگ پیسے پر پیسہ کماتے کماتے مال دار ہوتے گئے، جبکہ اس پیسے سے حقیقی معاشی سرگرمیوں میں لگے ہوئے لوگ غریب ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت سے ان کو دے دیتے ہیں، جن سے انھوں نے قرض لیا ہوا ہے۔ یوں معاشرے میں ایک طبقاتی تفریق وجود میں آگئی۔ اس پر مزید ظلم یہ کہ یہ طبقاتی فرق بڑھتا جا رہا ہے۔

کامیابی کا تصور اور اصول

کامیابی کا تصور:

انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص ہر وقت اور ہر کام میں کامیابی کا متلاشی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے ہر قسم کے غم، پریشانی اور مصیبت سے نجات مل جائے اور ہر وقت ہر موقع پر خوش اور کامیاب وکامران ہو۔

تین تصورات:

کامیابی کے متعلق دنیا میں تین تصورات پائے جاتے ہیں (۱) مغربی تصور (۲) اسلامی تصور (۳) نالائق اور سست لوگوں کا تصور۔

۱۔ مغرب اور مغربی مفکرین نے کامیابی کو صرف دنیاوی کامیابی تک محدود کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں دنیاوی کامیابی اور ترقی، مطلوب و مقصود ہے اور یہی ان کے نزدیک انسانی معراج ہے۔ وہ لوگ جو صرف دنیاوی کامیابی و ترقی کے لیے ساری جدوجہد کرتے ہیں اور آخرت کو بالکل بھول جاتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ (بقرہ: ۲۰۰)

"بس لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب جو کچھ ہمیں دینا ہے، دنیا ہی میں دیدے جبکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"

افسوس کہ کامیابی کا یہی تصور اب مسلم معاشرہ میں بھی پنپنے لگا ہے، آج عام مسلمانوں کی نظر میں بھی دنیا کی ترقی اور کامیابی سب کچھ ہے۔

۲۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے دین اسلام کے ہاں کامیابی کا وہ تصور نہیں جو مغرب کے ہاں ملتا ہے۔ اسلام جب "کامیابی" کا کہتا ہے تو اس سے دین اور دنیا دونوں کی کامیابی مراد ہوتی ہے۔ ہمارے مسلمانوں کے ہاں " کامیابی" کا تصور معاشرے میں مروج روایتی تصور سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک کامیابی کا وہی تصور ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

"اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں جہنم کی آگ کے عذاب سے بچا"۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری اور کامیابی کا حکم دیا ہے اور اس کو زبردست کامیابی ٹھہرایا ہے۔ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ: ۷۲)

ہم مسلمانوں کے ہاں "کامیابی" کا یہی تصور ہے کہ دونوں جہانوں میں نجات اور فلاح پائیں ادھر بھی کامیابی مل جائے اور اُدھر بھی کامیابی قدم چومے۔ ہمارے دین نے ہمیں دنیاوی کامیابی کے اصول بھی بتائے ہیں اور آخرت کی کامیابی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

۳۔ تیسرا تصور سست اور نالائق لوگوں کا ہے۔ جو اپنی نالائقی، کوتاہی، سستی، غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے دنیا میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے اور آخرت کے لیے بھی توشہ تیار نہیں کرتے۔ ایسے شخص کے بارے میں قرآن میں ہے۔

"اس نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی، یہی ہے صریح خسارہ"۔

یعنی اس شخص کو دین و دنیا دونوں میں ناکامی ہوتی ہے، دونوں میں خسارہ ملتا ہے۔ اب جو شخص دنیا یا آخرت میں ناکام ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے کیونکہ خالق کائنات نے تو ہر شخص کے لیے کامیابی اور ناکامی کے اصول، ضوابط، قواعد اور اسباب سب کچھ بتادیئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ "اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتادیے ہیں" دنیاوی کامیابی کے اصول بھی بتائے ہیں اور آخرت کی کامیابی کا طریقہ بھی بتایا ہے ۔ اب یہ انسان کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرتا ہے اور کس کے لیے کوشش کرتا ہے دنیا کے لیے یا آخرت کے لیے یا دونوں کے لیے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

بے عمل دل ہو تو جذبات سے کیا ہوتا ہے ۔۔۔ دھرتی بنجر ہو تو برسات سے کیا ہوتا ہے
ہے عمل لازمی تکمیل تمنا کے لیے ۔۔۔ ورنہ رنگین خیالات سے کیا ہوتا ہے

پھر کامیابی کا راز اخلاص میں پنہاں ہے۔ اخلاص کی دولت قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ جتنی قربانی زیادہ ہوگی، اخلاص اتنا ہی بڑا ہوا ہوگا، اور قربانی اُس کی بڑھی ہوئی ہوگی جس کا ظرف بڑا ہوا ہوگا اور بڑے ظرف کے لبالب بھرے ہونے کے لیے دُعاؤں کے ساتھ مضبوط تعلق مع اللہ کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے، ورنہ کامیابی کے بجائے ناکامی مقدر بنے گی۔

کامیاب لوگوں کے عادات

جب ہم اپنی اس زندگی میں کامیاب لوگوں کو دیکھتے ہیں تو چند سوالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ان کی روزمرہ کے معمولات کیا ہیں؟ان کا لائف سٹائل کیسے ہوگا؟ یہ غیر معمولی کامیاب افراد ایسے ناقابل یقین کارنامے کیسے کر لیتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ہر کوئی ان سوالات کے جوابات معلوم کرنا چاہتا ہے اور یقیناً آپ بھی۔آیئے دیکھتے ہیں وہ کونسی باتیں ہیں جو ان لوگوں کی کامیابی کا سبب بنی۔

خاص مقصد:

اس دنیا کا ہر فرد بہت کامیاب ہو سکتا ہے اگر وہ اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد متعین کرلیں اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے ایک درست سمت کا انتخاب کر لیں۔کامیاب لوگوں کا زندگی کا ایک خاص مقصد اور ہدف ضرور ہوا کرتا ہے۔

منظّم زندگی:

کامیاب لوگوں کے عادات میں جو سب سے اہم عادت ہے وہ ان کی منظّم زندگی ہے۔ منظّم زندگی سے مراد منصوبہ بندگی کرنا اور اہداف ہیں ترجیحات کا مقرر کرنا ہے۔ہفتے میں چھٹی کا دن باقی ہفتے کی منصوبہ بندی کے لیے بہترین موقع ہوتا ہے۔

مثبت رویہ:

کامیاب لوگ مثبت رویہ رکھتے ہیں۔بہت سے کامیاب لوگوں کے قول کے مطابق صرف مثبت رویہ رکھنا کامیاب ہونے کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ یہ کامیابی کی بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے۔

سماجی روابط:

کامیاب لوگ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو اہمیت دیتا ہے اور ان کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔اپنے ارد گرد کے لوگوں کو اہمیت دینے سے ان کے دلوں میں آپ کی محبت

بڑھے گی۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے 79 فیصد کامیاب افراد باجود بہت مصروفیات کے مہینے میں 5 گھنٹے سماجی روابط کو دیتے ہیں۔

آرام و سکون:

کامیاب لوگوں کے عادات میں ایک دلچسپ عادت پر سکون رہنا ہے اس کے لیے باقاعدہ مراقبہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ یقیناً پر سکون وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو منظّم زندگی گزارتے ہیں۔

خودانحصاری:

ایک باصلاحیت ٹیم اور گروپ ضروری ہے لیکن کامیاب لوگوں کا انحصار دوسروں پر کم اور خودپر زیاد ہوتا ہے۔ خودانحصاری کی وجہ سے آپکو دوسروں سے گلے شکوے کی نوبت نہیں آئے گی۔

خودپر قابو:

کامیاب لوگ اپنے جذبات کو قابو رکھنا جانتے ہیں۔ مایوسی اور کم ہمتی ان کے حوصلے کو شکست نہیں دیتی۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ایک جذباتی فیصلہ سالوں کی محنت ضائع کر دیتی۔

مستقل مزاج:

کامیاب لوگ نہ صرف مشکلات اور ناسازگار حالات کا سامنا کرتے ہیں بلکہ اپنے ناکامیوں کو آئندہ زیادہ کوشش کرنے کی حوصلہ افزائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

صحیح معلومات حاصل کرنا:

کسی شخص یا موضوع کے بارے میں اُس وقت تک فیصلہ یا رائے نہیں دیتے جب تک متعلقہ چیز کے بارے میں پوری معلومات نہ ہو۔

وسیع النظر:

جب تک آپ تمام اوقات میں تمام لوگوں کی طرف ایک وسیع ذہن کو.برقرار نہیں رکھتے آپ ایک عظیم اور مقناطیسی شخصیت نہیں بن سکتے۔ جب آپ وسیع النظر ہوں گے تو ہر قسم کے لوگ آپ کی طرف راغب ہوں گے۔

سفارتکار:

انڈریوکارنیگی (مشہور بزنس مین) اپنی کامیابی کا راز یہ بتاتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنے ملازموں کو کام کرنے کا حکم نہیں دیا لیکن پھر بھی وہ معیار پر پورا اترتے کیونکہ میں ان سے سفارتی انداز میں پیش آتا ہوں ان کو نرمی سے سمجھاتا اور کام نکلواتا ہوں۔

بولنے سے زیادہ سننا:

کامیاب لوگ اپنے مکالمات کو دوسروں سے سیکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اپنی قدر بڑھانے کے لیے۔

تمام امور پر نظر رکھنا:

کامیاب لوگ اپنی ارد گرد تمام امور پر نظر رکھتے ہیں چاہیں اس کو اچھے لگے یا بُرے۔ صرف ان کاموں پر توجہ نہیں دیتے جس میں ان کی دلچسپی ہو۔

متوازن زندگی:

کامیاب لوگوں ہر وقت ایجنڈا پر کام نہیں کرتے بلکہ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے بھی وقت نکالتے ہیں۔ یہ ان کے ری چارج ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسروں پر خرچ کرنا:

کامیاب لوگوں کو دوسروں کو دینے کی عادت ہوتی ہے۔ رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور مخلوق خدا کے کام آتے ہیں۔ یہ صرف اپنی نہیں بلکہ پوری سوسائٹی کی کامیابی کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اگلے دن کی منصوبہ بندی:

کامیاب افراد رات کو سونے سے پہلے اگلے دن کے لیے کرنے کے کام لسٹ To Do List بناتے ہیں اور ذہنی طور اگلے دِن کے لیے پر تیار رہتے ہیں۔

صبح سویرے اٹھنا:

کامیاب لوگ صبح سویرے اٹھتے ہیں کیونکہ جتنی جلدی وہ صبح کریں گے اتنا زیادہ وقت کام کرنے کے لیے ہوگا۔ انگریزی محاورہ ہے۔ The early bird will catch the warm.

ورزش کرنا:

روزانہ ورزش آپ کو صحت مند اور آپ کے دماغ کو تازہ رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ فعال رہتے ہیں اور بڑھاپا جلدی نہیں آتا۔ ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے 70 فیصد کامیاب ترین لوگ روزانہ ورزش کرتے ہیں۔

اپنا خیال رکھنا:

کامیاب لوگ اپنی صحت، خوراک اور صفائی کے حوالے سے خصوصی خیال رکھتے ہیں۔ کم اور اچھا کھانا، روزانہ ورزش کرنا اور صفائی کا اہتمام کرنا ان کی عادت ہے۔ ایلون مسک (Elon Musk) جو ٹیسلا موٹرز کے CEO ہے سے پوچھا گیا آپ کی روزانہ کون سی عادت نے آپ کی زندگی پر بڑا مثبت اثر چھوڑا ہے جواب میں کہہ دیا Showring روزانہ نہانا۔

مطالعہ:

کامیاب لوگوں کے مطابق مطالعہ وہ چیز ہے جس کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ مطالعہ آپ کی ذہنی نشونما کرتا ہے۔ وارن بفٹ جو دنیا میں کامیاب ترین بزنس مین سمجھا جاتا ہے، ان سے پوچھا گیا کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ انھوں نے کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا روزانہ 500 صفحات مطالعہ کیا کرو اور آپ کر سکتے ہیں لیکن میں گارنٹی دیتا ہوں آپ کریں گے نہیں۔

وارن بفٹ روزانہ 600 سے 1000 صفحات مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے دن کا 80 فیصد وقت مطالعہ کو دیتے ہیں۔

پُرسکون اور باوقار زندگی گزارنے کا راز

دنیا میں اللہ کے بندوں کو جو کچھ حاصل ہے اور جن حالات و کیفیات میں وہ زندگی گزار رہے ہیں ان کا تجزیہ جب آپ کریں گے تو دو باتیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ کچھ تو ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی دولت سے نوازا ہے، تقویٰ، پاکیزگی، خداترسی اور علم و بصیرت کے جوہروں سے ان کی زندگیاں آراستہ ہیں، وہ دین سے شغف رکھنے والوں کے لیے مرکز عقیدت اور نمونہ ہیں، جبکہ کچھ لوگ وہ نظر آئیں گے جن کو اللہ نے دنیاوی مال و دولت، عیش و راحت، دنیاوی وسائل اور خوشحالی سے نوازا ہے۔ ان حالات میں ایک مؤمن اگر سکون قلب، عافیت اور طمانیت خاطر کی زندگی گزارنے کا طالب ہے تو وہ دو خصلتیں اپنے اندر پیدا کرے تو وہ ان شاء اللہ صبر و قناعت اور شکر و اطمینان کی کیفیت اپنے اندر پائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی صابر و شاکر قرار پائے گا۔

ایک یہ کہ جب بھی وہ دنیاوی نعمتوں سے نوازے گئے لوگوں کے حالات پر غور کرے تو ہمیشہ ان لوگوں پر نگاہ جمائے جو اس سے کمتر حیثیت کے مالک ہوں، یہ اندازِ فکر اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ نے جن نعمتوں سے اس کو نواز رکھا ہے ان پر اس کے دل میں شکر کے جذبات پیدا ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا اور جب وہ دینی نعمتوں سے نوازے گئے لوگوں پر نگاہ کرے تو ہمیشہ اپنے سے اونچے اور بلند حیثیت کے لوگوں پر نگاہ کرے تو ان کی پیروی کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ ابھرے گا اور ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اپنے یہاں صابر و شاکر بندہ شمار فرمائے گا اور ایک صابر و شاکر بندے کی دنیوی زندگی بھی سکون و عافیت شکر و سپاس اور صبر و قناعت کی مثالی زندگی ہوگی اور آخرت کے جہد مسلسل کے نتیجے میں آخرت کی زندگی بھی مثالی زندگی ہوگی۔

دنیا کی دولت اور دنیوی نعمتوں میں جس بندے کی نگاہ اپنے سے نیچے والے پر ہوگی وہ قناعت کے جوہر سے آراستہ ہوگا۔ وہ دنیا کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والا اور اپنی حیثیت پر اطمینان کی سانس لینے والا ہوگا۔ وہ اپنے نیچے کے لوگوں کو دیکھ کر شکر کے

جذبات سے سرشار ہوگا اور اپنے سے نیچے کے لوگوں پر ترس کھائے گا اور اسے شکر و قناعت کی قابلِ رشک زندگی گزارنے کی توفیق حاصل ہو گی۔ وہ حرص و طمع، دجل وفریب اور مادیت پرستی کی لعنتوں سے پاک ہوگا۔ اس کے برخلاف جو دنیا میں اپنے سے اونچے پر نگاہ رکھے گا وہ ہر لحہ دنیا کے پیچھے دوڑنے اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس میں پریشاں اور سرگرداں رہے گا اور ہر وقت "ھل من مزید" کی صدا لگاتا رہے گا اور جب کسی ایک اونچے مرحلے پر پہنچے گا تو دوسرے مرحلے کی فکر میں ہوگا اور اس کی زندگی اس مادی دوڑ میں حیران و سرگرداں رہے گی، اسے کبھی سکون واطمینان کی اور قناعت و شکر کی زندگی نصیب نہ ہو گی۔ اس لیے کہ بہت کچھ آگے جانے کے بعد بھی بہت سے اس سے آگے ہوں گے اور وہ اس ہوس کی آگ میں مستقل جلتا اور پیچ و تاب کھاتا رہے گا، کسی لمحے بھی اس کو اطمینان قلب اور حقیقی مسرت کی دولت میسر نہ آسکے گی۔ اطمینان قلب، قناعت و شکر اور حقیقی مسرت حاصل کرنے کا گُر تو یہی ہے کہ دنیوی زندگی میں آپ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھیں۔

رہا دین اور دین میں ترقی کرنے کا معاملہ تو اس سلسلہ میں مؤمن کا نقطۂ نگاہ ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے سے اونچے پر نگاہ رکھے۔ یہ نقطۂ نگاہ اس کو ہر لحہ سرگرم سفر رکھے۔ کسی لمحے بھی اس میں جمود اور سرد مہری پیدا نہ ہو گی بہت کچھ پا لینے کے بعد بھی اس کو محسوس ہوگا کہ وہ بہت سے لوگوں سے پیچھے ہے اور ابھی بہت کچھ پانے کے لیے باقی ہے اور اس کی آخرت کی دائمی زندگی بہتر سے بہتر بنتی چلی جائے گی اور وہ دنیا والوں کے لیے ایک مثال قرار پائے گا۔

حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"دو خصلتیں ہیں کہ جس بندے میں یہ ہوں گی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صابر و شاکر لکھا جائے گا۔ ایک یہ کہ وہ دین کے معاملے میں ان بندوں پر نظر رکھے جو دین میں اس سے آگے اور برتر ہیں اور وہ ان کے نقشِ قدم پر چلے اور دوسری خصلت یہ ہے کہ دنیا کے معاملے میں وہ ان لوگوں پر نگاہ رکھے جو اس سے نیچے اور کمتر حیثیت کے مالک ہیں پس وہ اس فضل و کرم پر اللہ کا شکر ادا کرے گا جو اللہ نے اس پر کیا ہے، تو اللہ ایسے بندے کو اپنے ہاں صابر و شاکر لکھے گا اور جو شخص

دین کے معاملے میں اپنے سے نیچے اور کمتر پر نظر رکھے گا اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے اونچے پر نظر رکھے گا اور وہ ان دنیوی نعمتوں کے نہ ملنے پر افسوس کرے گا جن سے وہ محروم ہے تو اللہ ایسے بندے کو اپنے ہاں صابر و شاکر نہیں لکھے گا"۔ (ترمذی)

اس حدیث میں اللہ کے رسول صادق و امین نے دنیا کی زندگی میں پر سکون اور با وقار اور کامیاب رہنے کا یہ گُر سکھایا ہے کہ آدمی اپنے اندر دو خصلتیں پروان چڑھانے کی کوشش کرے کہ دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے فائق اور برتر پر نگاہ رکھے اور ان کی پیروی کرے تو وہ دین میں اونچا اٹھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے کہ جس مرحلے تک وہ اونچا اٹھے گا۔ اُسے کچھ اور لوگ اس سے بھی اونچے اور فائق نظر آئیں گے اور اس طرح دین کے درجات میں یہ بلندی کا سفر تا زیست جاری رہے گا۔

اور دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر پر نگاہ رکھتے تو وہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا بے اختیار شکر ادا کرے گا جن سے وہ نوازا گیا ہے اور شکر کا یہ جذبہ کبھی ماند نہ پڑے گا۔ اس لیے کہ جو شخص بھی یہ عادت اپنائے گا اس کو ضرور دنیوی نعمتوں میں اپنے سے کمتر لوگ ملیں گے اور لازماً اس کے اندر ان نعمتوں پر شکر کے جذبات ابھریں گے جن سے یہ نوازا گیا ہے اور وہ لوگ محرورم ہیں جو اس سے کمتر ہیں اور اس کی نظر میں ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی سے حرص و ہوس اور طمع و لالچ جیسے رذائل اخلاق کو کھرچ ڈالے گا اور شکر و قناعت کے جذبات سے اس کی زندگی سے آراستہ ہوتی چلی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اس احساس سے مسرور اور خوش گمان رہے گا کہ اللہ نے بہت سے لوگوں پر اسے فضیلت دے رکھی ہے اور کتنے ہی لوگوں سے زیادہ اس کو نوازر کھا ہے اور جو کچھ اسے اللہ نے دیا ہے جن سے بہت سے اللہ کے بندے محرورم ہیں اس طرح وہ صبر و شکر، قناعت و اطمینان کی باوقار اور پر سکون زندگی گزارے گا اور کبھی حرص و لالچ میں مبتلا نہ ہو گا۔

کتابِ زندگی

وقت زندگی ہے۔ اسے بہتر طور پر استعمال کرکے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وقت ایک بیش بہا قیمتی سرمایہ اور بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ فوری ضائع ہونے والی ایسی چیز ہے جسے نہ چھوا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی طریقے سے ذخیرہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ برف کی طرح ہے کہ اگر آپ استعمال نہ کریں اور باہر رہنے دیں تو پگھل جائے گی۔ وقت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اسے آپ پیشگی استعمال نہیں کر سکتے اور نہ ہی پیشگی ضائع کر سکتے ہیں۔ اسے آپ ضائع کر دیں گے تو تسلسل وقت کے باعث اگلے لمحات آجائیں گے۔ بہر حال آپ گزرے ہوئے لمحات کو پکڑ نہیں سکتے۔

آپ دو اوقات کے درمیان کوئی رکاوٹ پیدا کرکے فاصلہ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ تسلسل کے ساتھ آرہا ہے اور تسلسل کے ساتھ جارہا ہے۔ جس انداز سے سورج اور چاند کو اپنے امور سے اور زمین کو اپنی گردش سے نہیں روکا جاسکتا، اسی طرح سے وقت کو اپنے تسلسل سے نہیں روکا جاسکتا۔ جو وقت گزر جاتا ہے وہ گزرا وقت کہلاتا ہے اور اس کے بارے میں افسوس کے لیے بیٹھ جانا بھی وقت ضائع کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ جو وقت آیا نہیں ہے اس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے اور منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے مگر اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

جو وقت قابل استعمال ہے، وہ یہی ہے جو آپ اس وقت گزار رہے ہیں۔ گھڑی کی جانب دیکھیے، کس تیزی کے ساتھ لمحے گزر رہے ہیں اور ہماری مقررہ زندگی کم ہو رہی ہے اور یہی وقت اور عمر کے لمحات ہی کتاب زندگی ہے۔

کتاب زندگی کے ورق برابر الٹ رہے ہیں ہر آنے والی صبح ایک نیا ورق الٹ دیتی ہے۔ یہ الٹے ہوئے ورق برابر بڑھ رہے ہیں اور باقی ماندہ ورق برابر کم ہو رہے ہیں اور ایک دن وہ ہوگا جب آپ اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہے ہوں گے۔ جو نہی آپ کی آنکھیں بند ہوں گی، یہ کتاب بھی بند ہو جائے گی اور آپ کی تصنیف محفوظ کر دی جائے گی۔ کبھی آپ نے

غور کیا، اس کتاب زندگی میں آپ کیا درج کر رہے ہیں؟ روزانہ کیا کچھ اس میں لکھ کر آپ اس کا ورق الٹ دیتے ہیں۔ آپ کو شعور ہو یا نہ ہو آپ کی یہ تصنیف تیار ہو رہی ہے اور آپ اس کی ترتیب و تکمیل میں اپنی ساری قوتوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اس میں آپ وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو آپ سوچتے ہیں، دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، چاہتے ہیں، کرتے ہیں اور کراتے ہیں، اس میں صرف وہی کچھ نوٹ ہو رہا ہے جو آپ نوٹ کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے کو ہرگز کوئی اختیار نہیں جو ایک شوشہ بھی اس میں بڑھا یا گھٹا سکے، اس کتاب کے مصنف تنہا آپ ہیں اور صرف آپ ہی اپنی کوشش اور کاوش سے اسے ترتیب دے رہے ہیں۔ ذرا آنکھیں بند کیجیے اور سوچیے، کل یہی کتاب آپ کے اپنے ہاتھ میں ہوگی اور شہنشاہ واحد و قہار آپ سے کہے گا۔

"پڑھ اپنی کتاب زندگی، آج اپنے نامہ عمل کے جائزہ لینے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔

(سورۃ اسراء)

پھر سوچیے ان خوش نصیبوں کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا جن کا دفتر عمل ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور ان مجرموں پر کیا بیتے گی جن کی کتاب زندگی ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائی جائے گی۔ آیئے کچھ دیر کے لیے تصور کی آنکھوں سے قرآن کے آئینے میں اس جھنجھوڑنے والے منظر کو دیکھیں۔

"وہ بھی کیسا دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے تمھارا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا، اس وقت جس کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا لو دیکھو پڑھو میرا نامہ اعمال، میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے، پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا، عالی مقام جنت میں جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ پیو اپنے ان نیک اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

(الحاقہ۔۱۸۔۲۴)

"اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا، کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا۔ (حکم ہو

گا) پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو اور پھر اسے جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکینوں کو کھلانے کے لیے ابھارتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار و غمخوار ہے اور نہ زخموں کے دھوئن کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا، جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا (کیونکہ ان خطاکاروں نے زندگی بھر اسی کے کھانے کی عادت ڈالی تھی)"۔ (سورۃ الحاقہ)

کبھی آپ نے غور کیا کہ آپ اپنی کتاب زندگی کس ہاتھ میں لینے کی تیاری کر رہے ہیں، دائیں ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں؟ دائیں ہاتھ میں وہی کتاب دی جائے گی جو خدا کی نظر میں دائیں ہاتھ کے لائق ہو گی اور بائیں ہاتھ میں وہی کتاب دی جائے گی جو خدا کی نظر میں بائیں ہاتھ کے لائق ہو گی۔ سنجیدگی سے سوچنے کی بات ہے کہ آپ شب و روز کی دوڑ دھوپ سے جو کتاب مرتب کر رہے ہیں وہ کس آرزو کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس آرزو میں آپ کس حد تک مخلص ہیں۔

بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہم اور آپ حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے اور ہر شخص سے حدیث کی رو سے پانچ سوال کیے جائیں گے۔

۱۔ اپنی زندگی کن کاموں میں لگائی۔
۲۔ اپنی جوانی کو کن کاموں میں کھپایا۔
۳۔ مال و دولت کن ذرائع سے حاصل کیا۔
۴۔ مال و دولت کن کاموں پر خرچ کی۔
۵۔ اور جو علم حاصل تھا اس پر کہاں تک عمل کیا۔

کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص جو اس زندگی میں ان سوالوں کے صحیح جوابات تیار کر رہا ہے اور ان سوالوں کو سامنے رکھ کر شعور کی زندگی گزار رہا ہے۔ ذرا غور تو کیجیے، اس بندے کی خوش نصیبی کا جو حشر کے میدان میں اس طرح آئے کہ اس کا چہرہ مسرت و کامرانی سے چمک رہا ہو اور اس کی نگاہیں دیدار الٰہی میں محو ہوں۔

”اس دن بہت (خوش نصیبوں کے) چہرے تر و تازہ اور بارونق ہوں گے اور اپنے رب کے دیدار میں محو ہوں گے جب کہ اس دن بہت سے بد نصیب ایسے بھی ہوں گے جن کے چہرے شرم و ندامت اور گناہوں کی تپش سے جھلسے ہوئے، ہیبت ناک حد تک سیاہ اور اداس ہوں گے“۔ (القیمہ: ۲۲-۲۵)

اور بہت سے (بد نصیبوں کے) چہرے اداس اور بے رونق ہوں گے اس آفت کے اندیشے سے جو ان پر آنے والی ہے۔

دنیا کی زندگی بہت مختصر ہے اور آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دنیا کی اس قلیل زندگی میں آپ کے رب نے آپ کو مہلت اور موقع دے رکھا ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے اپنے لیے آخرت کی جیسی زندگی چاہیں بنالیں۔ ہمیشہ کا سکھ بھی آپ اپنے لیے فراہم کر سکتے ہیں اور ہمیشہ کا دکھ بھی آپ ہی کے اعمال کا نتیجہ ہو گا۔ آپ ہر لمحہ دنیا کی زندگی سے دور اور آخرت کے انجام سے قریب ہو رہے ہیں۔ آپ کو شعور ہو یا نہ ہو۔ آپ کی زندگی ان پانچ سوالوں کا جواب تیار کر رہی ہے۔ یہ جوابات خدا کے فضل سے آپ کو حسن انجام سے ہمکنار بھی کر سکتے ہیں اور یہی جوابات آپ کو خدا کے غضب میں گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتاب زندگی کی صحیح مرتب اور تصنیف کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

سماجی ترقی کا راز

آج ہر کوئی سماج اور معاشرے کی ترقی کی بات کرتا اور اس کے لیے سوچتا ہے۔اس پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں اور ہر کوئی اپنا فلسفہ اور نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔دراصل سماجی ترقی کے لیے تین چیزیں ریڈھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے بغیر ایک سماج اور معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

(ا) اعلیٰ اخلاق:

انسانی سماج کی تشکیل اخلاقی خوبیوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ابو سفیان کو صرف معاف نہیں کیا بلکہ اُن کے گھر کو عام لوگوں کے لیے دارالامان قرار دے دیا۔

(۲) قانون کی بالادستی:

قانون امیر و غریب، حاکم و محکوم سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ جس معاشرے میں قانون کی بالادستی نہ ہو تو وہ معاشرہ ظلم کا اماجگاہ بن جاتا ہے۔ قانون کی عدم مساوات معاشرہ کے لیے سم قاتل ہے۔ایک چوری کے مقدمے میں آپ ﷺ کو سفارش کی گئی جس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ چوری میری بیٹی فاطمہ ؓ بھی کرتی تو میں اُس کو بھی سزا دیتا۔

(۳) معاشی استحکام:

معاشرہ میں کسب حلال اور ہاتھ کی کمائی کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ سے ایک مفلس کے سوال کرنے پر آپ ﷺ نے اس کے ٹاٹ اور پیالہ کو دو درہم کے بدلے فروخت کر کے ایک درہم اہل و عیال کے لیے خوراک خریدنے اور ایک درہم سے ہتھوڑا خریدنے کا کہا۔ ہتھوڑے کے لیے خود دستہ بنوا کر آپ ﷺ نے فرمایا پندرہ دن تک تمھیں یہاں

نہ دیکھوں۔ جب وہ آدمی مقررہ مدت بعد آیا تو اس نے دس درہم کمائے تھے۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاتھ پھیلانے اور آخرت میں چہرہ داغدار اور کالا ہونے سے کمانا بہتر ہے۔

الغرض ہمیں معاشرے کی اصلاح اور سماج کی ترقی کے لیے ان تین چیزوں پر توجہ دینی چاہیے۔ آج اس لیے ہماری ترقی رک گئی ہے کہ ہم اخلاق کے پستی میں گرے ہوئے، قانون کی بالادستی نہیں بلکہ قانون کو ہم نے اپنے تابع بنایا ہوا ہے اور ہمارا معاش بھی مستحکم نہیں بلکہ زوال پذیر ہے۔

کامیابیاں حاصل کیجیے

کامیابی ایک ایسی چیز ہے، جو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی درخت پر پھل لگے ہوں اور لوگ اسے مختلف طریقوں سے حاصل کر رہے ہوں، کوئی بانس کی لمبی لکڑی پر تیز دھار والی چیز لگا کر پھل کاٹتا ہے، کوئی سیڑھی لگا کر کوئی درخت پر براہ راست چڑھ کر اور کوئی ایسا بھی جو پتھر مارتا ہے اور کچھ لوگ تنے کو ہلاتے رہتے ہیں۔ انسان اپنی عقل اور وسائل کے مطابق پھل توڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ کوئی اوزار کم ہونے کے باوجود پھل کم پاتا ہے، کوئی پتھر مار کر زیادہ پھل توڑ لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں مواقع ہر انسان کو ملتے ہیں اور وسائل بھی اس کے پاس ہوتے ہیں، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو کس طرح کام میں لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک دن میں ایک ہزار چار سو چالیس منٹ دیے ہیں۔ عقل اور ذہن کی دولت سے مالا مال کیا ہے، دست و بازو عطا کیے ہیں، ارادہ، عزم اور خواب دیکھنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ تو آیئے آپ ان سے کس طرح اپنی پیشہ وارنہ زندگی میں فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟

۱) خواہش (Desire)

اگر آپ کسی چیز کی خواہش رکھتے ہیں تو یہ کسی بھی چیز کو پانے کے لیے پہلا قدم ہے۔ پیاس لگے تو پانی کی تلاش شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار پانی ڈھونڈ کر پیاس بجھالی جاتی ہے۔

نپولین ہل نے پانچ سو کامیاب لوگوں کی مشترک خصوصیات لکھی ہیں، ان میں سے سب سے پہلی خصوصیت ”شدید خواہش“ ہے۔ اگر آپ کے اندر کسی چیز کو پانے کی شدید خواہش نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کسی کام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

اس بات کو ذہن نشین کر لیجیے کہ خواہش کمزور ہو گی تو نتائج بھی زیادہ نہیں ہوں گے، جیسا کہ ہلکی آنچ حرارت بھی کم دیتی ہے۔

۲)فیصلہ(Decision)

کسی چیز کی خواہش کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ نے اسے کب حاصل کرنا ہے۔اسی ہفتے، مہینے، سال یا اپنی زندگی میں اسے مکمل کرنا ہے۔اس کے لیے کام کرنے کی ایک فہرست بنالیں۔

جب آپ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے فیصلہ کر لیتے ہیں تو یہ آپ کا "وژن" بن جاتا ہے۔

۳)خواب(Dream)

تمام کامیاب لوگ بڑی چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں۔آپ بھی بڑے خواب دیکھیں۔اپنے خوابوں کی فہرست بنالیں اور ایک وقت میں ایک خواب کو پانے کے لیے کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ اس کو پورا کریں۔جو شخص خواب دیکھ سکتا ہے، وہ اسے شرمندہ تعبیر بھی کر سکتا ہے۔تعبیر تو وہ لوگ نہیں کر سکتے جو خواب نہیں دیکھتے۔

۴)پختہ ارادہ(Determination)

پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے میں عزم اور پختہ ارادہ کا کردار بہت اہم ہے۔اگر آپ کسی بڑی چیز کو پانے میں سیکھنے اور رسک کا عزم نہیں کرتے تو اس کے لیے کوئی دوسرا بھی آپ کی مدد کرنے کو نہیں آئے گا اور اگر آپ نے عزم کر لیا تو پھر کوئی بھی آپ کو روک نہیں سکتا۔

کامیابی کے سفر میں ناکامی، مشکلات اور رکاوٹوں کا مت سوچیں، یہ تمام چیزیں فیڈ بیک ہوتی ہیں، جو آپ کے ارادے کو مزید پختہ اور آپ کو مضبوط بناتی ہیں۔

۵) سیکھنے سکھانے کا عمل اور جہدِ مسلسل:

کامیابی کے لیے سیکھنے سکھانے کا عمل ختم نہیں ہونا چاہیے۔بہتر سے بہترین کا سفر رُکنا نہیں چاہیے۔جب تلاش جستجو اور سیکھنے کا سفر بند ہوتا ہے تو ترقی معکوس ہوتی ہے۔علم اور کامیابی

کسی کی جاگیر نہیں۔ علم اور کامیابی طلب گار کو ملتی ہے۔ کامیابی کے لیے مسلسل سیکھنا، مطالعہ کرنا اور جہد مسلسل ایک ضروری شرط ہے۔

۶) وقف کرنا(Dedication)

اپنے آپ کو شاندار کارکردگی کے لیے وقف کردیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنا قیمتی وقت، طاقت اور رقم وقف کرنا ہوگی، اس کے علاوہ بھی وسائل ہیں، تو ان کو بھی بروئے کار لانے سے مت گھبرائیں۔

عمدہ اور شاندار کارکردگی کی کوئی منزل نہیں، یہ ایک مسلسل سفر ہے۔

۷) لے کر چلنا(Drive)

آپ کی زندگی میں آپ کے ساتھ 80 فیصد لوگ سفر کرتے ہیں، جو تنقید کرتے ہیں، وقت ضائع کرتے ہیں، اور منفی سوچ کے حامل ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے، کیونکہ دنیا میں کسی بڑی کامیابی کو سمیٹنے کے لیے لوگوں اور ٹیم کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے لیے آپ کو ان لوگوں کو ان کی تمام تر خوبیاں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا۔ آپ ان کو اپنا ہم نوا اور اپنا دست و بازو بنانے کے لئے ان کو بتائیں گے کہ آپ بہت قیمتی ہیں، آپ کے دم سے دنیا آباد ہے۔ ان کو عزت دیں، وہ بہت جلد آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے لگ جائیں گے۔ دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں ہے۔

۸) فریم ورک اور ٹیم ورک:

وژن کی تکمیل کے لیے دو چیز میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک فریم ورک دوسرا ٹیم ورک۔ فریم ورک کہتے ہیں کام کرنے کا ڈھانچہ اور سانچہ ، جس کے مطابق ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے یعنی کام کرنے کا طریقہ کار اور دستور العمل۔ اور ٹیم ورک کہتے ہیں مشترک اہداف کو حاصل کرنے کے لیے مل جل کر کام کرنے کو۔ جس ادارے، کمپنی، جماعت اور قوم کا ٹیم ورک

اچھا ہو وہ ترقی کرتا ہے۔ ٹیم ورک کے لیے لازمی ہے کہ ان میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہو، وسیع ظرف ہو۔

۹) منصوبہ بندی:

انسان پہلے خواب دیکھتا ہے اور کوئی مقصد متعین کرلیتا ہے پھر منصوبہ سوچتا ہے اور پلاننگ کرتا ہے پھر بتدریج عمل کا آغاز کرتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ جو شخص اپنے کاموں کی منصوبہ بندی نہیں کرتا ہے وہ دراصل ناکامیوں کی منصوبہ بندی کررہا ہوتا ہے۔ جس شخص کی منصوبہ بندی زیادہ سے زیادہ بہتر ہو گی اُس کے کام اتنے ہی جلد اور بہتر انداز میں تکمیل کو پہنچیں گے۔

۱۰) نظم وضبط(Discipline)

ڈسپلن سب سے اہم چیز ہے۔ یہ نظم وضبط اہداف اور ان کی تکمیل کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ تمام کامیابیوں کی بنیاد اپنی ذات کو منظم کرنا ہے۔ جو اپنے آپ کو منظم نہیں کرسکتا ہے، وہ دوسروں اور اپنے کاموں کو کیسے منظم کرسکے گا۔

ابھی سے آپ اپنی خواہش، فیصلے، عزم، اہداف اور خوابوں کو منظم کریں۔اس کے علاوہ بھی جو چیزیں آپ کی کامیابی میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں، ان کو منظم کریں۔

ہر منظم کوشش کے نتیجے میں بہت سارے انعامات اور کامیابیاں ملتی ہیں۔

تبدیلی۔۔۔ مگر کیسے؟

بری حالت سے اچھی حالت کی طرف تبدیلی، اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ قرآن کریم بھی پوری انسانیت کو تبدیلی کی دعوت دیتا ہے کہ نفس وشیطان کی غلامی سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آجاؤ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تبدیلی کیسے آتی ہے؟

یاد رکھیں! خوش نما اور جذباتی نعروں سے کبھی تبدیلی نہیں آتی، اسی طرح محض چہرے اور مہرے بدلنے کو تبدیلی سمجھنا بھی بڑی خام خیالی ہے۔ تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ پوری قوم اپنے آپ کو تبدیل کرے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کرے، سچائی کو فروغ دیا جائے، جھوٹ، دھوکا دہی اور خیانت سے بچا جائے، ہر آدمی دیانت سے کام لے، اپنے ماتحتوں اور دائرہ کار میں آنے والے لوگوں کے مابین عدل وانصاف کو فروغ دیا جائے اور سب کے حقوق ادا کیے جائیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۃ الرعد: ۱۱)

”یقین جانو کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی نہ لے آئے“۔

افسوس کہ ہماری قوم نہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور نہ حقیقی تبدیلی کو سمجھتی ہے اور نہ ہی ہمیں ہر تبدیلی کے آواز پر لبیک کہنا چاہیے۔

فتنہ وفساد اور سازش وپروپیگنڈے کے اس دور میں آنکھیں بند کرکے پیچھے چل پڑنے کی روش کو ترک کرنا پڑے گا۔ کوئی تبدیلی کی بات کرے تو اس سے پلان مانگنا چاہیے۔۔۔ کوئی انقلاب کی بات کرے تو دیکھنا ہوگا کہ اس کے دائیں بائیں کون سے لوگ ہیں؟ کون سی لابیز ہیں؟ اس کے ساتھ کتنے قابل اور باصلاحیت لوگ ہیں جو انقلاب کے نتیجے میں دیانت داری کے ساتھ نظام چلا سکیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو چاہے کوئی کتنے ہی نعرے لگالے، اس ملک کا

نظام اور تقدیر نہیں بدلے گی اور عوام کو بیوقوف بنانے کا سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ یہ دور دلیل اور شعور کا دور ہے اپنے اندر شعور پیدا کرنا پڑے گا۔

اس ملک کی تقدیر بدلنی ہے تو نظریاتی اور عملی میدانوں میں خوب بصیرت کے ساتھ اور محتاط ہو کر کام کرنا ہوگا۔ یہ ملک جس مقصد اور وژن کے تحت بنا تھا، اسے آگے بڑھانا ہوگا۔ جس لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر اس ملک کو کھڑا کیا گیا تھا، اس اساس کو مضبوط کرنا ہوگا۔ قرآن وسنت کے نظام کو دل وجان سے نافذ کرنا ہوگا۔ قومیت، لسانیت، عصبیت اور صوبائیت کے ناسور کو جڑ سے اکھاڑنا ہوگا۔ کرپشن، خیانت، اقربا پروری اور ظلم وناانصافی کا بلاامتیاز خاتمہ کرنا ہوگا۔ قابل و باصلاحیت افراد کو آگے لانا ہوگا۔ سیاسی نعرے اور سیاسی لیڈروں کے دفاع میں لڑائی جھگڑے چھوڑنے ہوں گے۔ باباجی، خواجہ صاحب، مخدوم صاحب، خادم صاحب اور دیگر صاحب جیسی شخصیت پرستی اور شخصی غلامی چھوڑ کر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ سوچ پروان چڑھانی ہوگی۔

تب جا کر تبدیلی کی کوئی صورت اجاگر ہوگی۔ ورنہ ستر سال سے جو ہم دائروں میں سفر کر رہے ہیں، وہ یونہی جاری رہے گا۔ مفاد پرست طبقہ عوام کو یونہی سبز باغ دکھاتا رہے گا، سہانے خواب دکھا کر ہم پر اسی طرح مسلط رہے گا۔

جناب عمران خان کا الیکشن کے بعد قوم سے پہلے خطاب میں اس بات کا یقین دہانی کرانا کہ پاکستان کو مدینہ کی ریاست کی طرح فلاحی ریاست بنائیں گے یقیناً خوش آئند بات ہے، اللہ تعالیٰ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن یہ بات بھی ساتھ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مدینے کی ریاست صرف فلاحی ریاست نہیں تھی بلکہ اسلامی فلاحی ریاست تھی۔ پاکستان کو بھی اس لیے حاصل کیا گیا۔ لاکھوں جانوں کی قربانیاں بھی اس لیے دی گئی تھی کہ یہ ایک اسلامی اور فلاحی ریاست ہوگی جس میں اُس وقت کے یہ نعرہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ گواہ ہے اور جس کی گونج آج بھی سننے والوں کے کانوں میں گونج رہی ہے اور جس پر بانی و قائد محمد علی جناح کے خطبات بھی گواہ ہیں۔

بانی پاکستان جناب قائداعظم محمد علی جناح کے مختلف مواقع پر کیے گئے خطاب کے تین اقتباس پڑھیے دیکھیے وہ کیا کہہ رہے ہیں اور پاکستان سے متعلق ان کے کیا کیا درخشاں خیالات اور

نظریات تھے اور وہ پاکستان کو کن معنوں میں ریاست بنانا چاہتے تھے۔ قائد اعظمؒ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں: پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت بن کر سامنے آچکا ہے، لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام ہی مقصود نہ تھا بلکہ یہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی اسلامی روش اور ثقافت کے مطابق نشو ونما پا سکیں اور اسلام کے عدل عمرانی کے اصول پر آزادنہ طور پر عمل کر سکیں۔(اکتوبر 1947ء پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی میں خطاب)

قائد اعظمؒ نے پاکستان براڈکاسٹنگ سروس کی افتتاحی تقریب پر قوم کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا: ”نئی مملکت کی تخلیق کی وجہ سے پاکستان کے شہریوں پر زبردست ذمہ داری آن پڑی ہے، انھیں یہ موقع ملا ہے کہ وہ دنیا کو دکھا سکیں کہ ایک قوم جو بہت سے عناصر پر مشتمل ہے کس طرح امن وآشتی کے ساتھ رہ سکتی ہے۔

اسی پیغام میں آپ نے فرمایا: اے میرے ہم وطنو! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان بیش بہا وسائل کی سرزمین ہے لیکن اس کو ایک مسلم قوم کے شایان شان ملک بنانے کے لیے ہمیں اپنی تمام توانائیوں کی ضرورت ہوگی۔

تین مختصر اقتباسات آپ نے پڑھ لیے، آپ جو کوئی بھی ہیں، آپ طالب علم ہیں، آپ استاد ہیں، کسی نجی کمپنی یا سرکاری ادارے کے ملازم ہیں، بیوروکریسی میں کسی عہدے پر فائز ہیں، فوج میں کسی بڑے رینک کے آفیسر ہیں، عدلیہ میں کسی بھی حیثیت کے جج ہیں، آپ اینکر ہیں، صحافی ہیں، آپ تاجر ہیں، صنعت کار ہیں، کسان ہیں، آپ عوامی نمائندے ہیں، آپ جو بھی ہیں۔

آپ اپنی ذات کو سامنے رکھیں اور ان اقتباسات کو پڑھیں۔ کیا ہم ملک کو اپنی کوشش کی حد تک وہاں لے جاسکے جہاں ہمارے قائد نے اس ملک کو پہنچانے کے خواب اپنی

آنکھوں میں سجائے تھے؟ کیا ہم اسلامی روش اور ثقافت ، اسلام کے عدل عمرانی کے اصول اپنا سکے؟ ان پر آزادانہ عمل تو بعد کی بات رہی!

آج ملک میں حالات نازک ترین سطح پر ہیں۔ اداروں کی نظر آنے والی چپقلش نے ملک کو خطرات کے دوراہے پہ کھڑا کر دیا ہے۔ عوامی نمائندوں کی مبینہ نالائقیاں اور ریاستی حفاظت کے ذمہ داران کی طاقت کے سرچشمہ ہونے کی خواہش اور پھر اسی طاقت کے حصول میں مختلف طرح کے اوچھے ہتھکنڈے وہ خطرناک کھیل ہے جس کا یہ ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب بیرونی دشمن بھی اس ملک پر بری نظریں جمائے کسی "موقع" کے انتظار میں ہوں۔

اس لیے ہر شخص اور ہر ادارے کو ذاتی مفاد اور انتقام سے نکل کر قومی اور ملکی مفاد کے لیے کام کرنا ہوگا اور آئین میں بیان کردہ حدود میں رہ کر کام کرنا ہوگا اور سب سے بڑھ کر صحیح معنی میں قانون کی بالادستی کو اپنی روح کے ساتھ قائم کرنا ہوگا۔ وطن عزیز کے ہر باشندے کو دعا کرنی چاہیے کہ رب کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ملک کو صحیح معنی میں اسلامی فلاحی ریاست بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ آمین

یالیت قومی یعلمون

کاش! میری قوم سمجھ جائے

ملک اور معاشرے صرف کسی نظریے کی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتے اور مستحکم ہو سکتے ہیں۔چونکہ ہمارے ملک میں معاشرے کی رہنمائی عام طور پر سیاسی اور مذہبی قیادت کرتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان میں نہ صرف یہ کہ سیاسی اور مذہبی قیادت اس ملک کو اس کی نظریاتی بنیادوں پر چلانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ بلکہ اب حالات کا بگاڑ یہاں تک آ پہنچا ہے کہ دونوں میں تصادم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

معاشروں میں غریب اور امیر، مذہبی اور غیر مذہبی ،آزاد خیال اور متشدد اور اسی طرح کے دوسرے تضادات ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں اور معاشرہ تغیر اور اصلاح کے عمل سے گزرتا رہتا ہے، لیکن اگر کوئی بیرونی دشمن اور بالادست قوت اس معاشرے کو توڑنا چاہے اور اسے مقامی لوگوں میں سے مقتدر طبقات اور موثر اداروں کے افراد کافی تعداد میں مل جائیں، جو اس کے اشارے پر چلنے کے لیے تیار ہوں، تو اس معاشرے کا داخلی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جانا یا خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں آج جو تقسیم ہمیں گہری ہوتی نظر آ رہی ہے اس میں حکومت اور ریاستی ادارے ، سیکولر سیاسی جماعتیں ،میڈیا اور سول سوسائٹی کے سیکولر عناصر خصوصاً دانشور، صحافی اور این جی اوز ایک طرف ہیں اور ملک کے مذہبی عناصر، دینی سیاسی جماعتیں، علمائے کرام ،دینی مدارس ، مساجد، مذہبی تحریکیں اور ان سب کے کارکن ،ہمدرد اور حامی افراد دوسری طرف ہیں ۔خدانخواستہ جس کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں نکلے گا اور دشمن تو یہی چاہتا ہے بلکہ اسی کا انتظار کر رہا ہے کہ اس طرح کی خانہ جنگی شروع ہو تا کہ اسے پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضے کا اور پاکستان کے حصے بخرے کر کے اسے توڑنے کا موقع ملے۔ ان دنوں سیاست دانوں اور بیوروکریسی کی کرپشن کے قصے ہر فرد کی زبان پر عام ہیں۔ قتل وغارت کی گرمی عام

ہے۔ کئی لوگ بے روزگاری اور بھوک سے تنگ آکر خودکشی کر رہے ہیں۔ ضمیر فروش دہشت گردوں کے گروہ ہر صوبے میں دندنا رہے ہیں۔

ملک کی عام صورت حال یہ بن گئی ہے بقول کسے کہ:

ہمارے ملک کی صورتحال بھی عجیب ہے۔ مولوی صاحبان لڑ رہے ہیں۔ جاہل دین سکھا رہے ہیں۔ پاپ اسٹار تبلیغ کر رہے ہیں۔ کھلاڑی سیاست کر رہے ہیں۔ ماڈل سمگلنگ اور سمگلر عمرے کر رہے ہیں۔ فوج ملک چلا رہی ہے۔ سیاستدان کاروبار کر رہے ہیں اور عوام سو رہے ہیں۔ پتہ نہیں اس اندھیری رات کی سحر کب ہو گی؟

غرض مادہ پرستی، بداخلاقی، بددیانتی، بے دینی، بے چینی، اضطراب اور بے سکونی کا ایک عفریت ہے جس نے افراد معاشرہ کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے اور بدقسمتی یہ کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اس طوفان سے بچنے کا خیال ہے اور امت کو اس خوفناک بحران سے نکالنے کی تڑپ جن کے اندر موجود ہے۔

ہمارے نزدیک اس بڑھتے ہوئے اخلاقی بحران کا سبب یہ ہے کہ اس معاشرے میں سارے کام ہو رہے ہیں لیکن جو کام نہیں ہو رہا وہ انسان سازی کا کام ہے، وہ مسلمان سازی کا کام ہے، وہ کردار سازی کا کام ہے۔ یہ کام تبھی ہو سکتا ہے جب دلوں میں ایمان کی آبیاری کی جائے، لوگوں کے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے، رذائل اخلاق سے بچنے اور فضائل اخلاق پر عمل کرنے کی ان کی ٹھنڈے دل سے برسوں تربیت کی جائے۔

یہ کام درس گاہوں میں ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہوتا ہے، لیکن ہم نے ان دونوں اداروں کو تعمیر کی بجائے تخریب کی راہ پر لگا رکھا ہے۔ دونوں شعبوں پر اسلام اور مسلم دشمن مغربی فکر و تہذیب کا رنگ غالب ہے۔ دشمن ان میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے کثیر سرمایہ کاری کر رہا ہے اور ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہا ہے اور یہ سب کچھ وہ ہمارے ہاتھوں کرا رہا ہے لیکن ہم بے حس اور خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

حکومت اور فوج تو خود فریق ہے۔ علمائے کرام اور دینی جماعتیں بھی فریق ہیں تو قوم کی رہنمائی کون کرے گا اور اسے طوفانوں سے نکال کر ساحل پر کون پہنچائے گا؟ اور اگر کوئی

شترمرغ کی طرح سرریت میں دبا کر یہ سمجھتا ہے کہ کوئی طوفان نہیں آیا تو ہم اس کی عقل وفکر کی سلامتی کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔

اے وہ لوگو! جو ملت کا درد رکھتے ہو، جو اس کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانا چاہتے ہو! اگر تم اصلاح احوال کے خواہاں ہو تو انسان سازی کی فیکٹریاں لگاؤ، کردار سازی کا کام کرو۔ آپ کو تعلیمی حکم یہ ہے، یہ پیغمبروں کی سنت ہے، یہ قوموں کی اصلاح وبگاڑ کا پیمانہ ہے۔ اگر یہ کام کروگے تو اچھے انسان بنیں گے، اچھا معاشرہ بنے گا اور اچھی ریاست وجود میں آئے گی اور اگر یہ کام نہیں کروگے تو تباہی تمھارا مقدر ہوگی۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بقراط کی عقل کی ضرورت ہے نہ افلاطون کی فراست کی، قرآن حکیم کی ایک آیت ہی اس کے لیے کافی ہے۔ یالیت قومی یعلمون

یہ ہے وہ صورت حال جس سے ہم ڈر رہے ہیں کہ ہم جس کشتی میں سوار ہیں خدانخواستہ اس میں چھید نہ ہو جائے۔

الحمد للہ! پاکستان اسلام کے نام پر مسلمانوں کا وہ واحد ملک ہے جو ایک نظریے کے تحت معرض وجود میں آیا ہے۔ یہاں کروڑوں مسلمانوں کی جان ومال، ایمان اور عزت محفوظ ہے۔ یہ امت کی امنگوں کا محور اور امیدوں کا مرکز ہے۔ ہم خدانخواستہ اس کو نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔ فوری طور پر ہمیں نہیں سوجھ رہا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے اور قوم میں داخلی طور پر اتحاد، یکجہتی اور استحکام کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا ہم اہل پاکستان کے سامنے سوال اٹھا رہے ہیں کہ کوئی ہے جو اس ملک کو بچا سکے؟ کوئی ہے جو اس معاشرے کو تقسیم در تقسیم اور خانہ جنگی کی طرف بڑھنے سے روک سکے اور اسے تباہی سے بچا سکے؟ کوئی ہے جو اس ملک وملت کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے سنجیدگی سے سوچے اور کچھ کر کے دکھائے۔

نوجوان نسل اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی

جس طرح پاؤں آگ میں ڈالنے سے جل اور پانی میں رکھنے سے بھیگ جاتا ہے، سورج مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ قوموں کی تعمیر و ترقی، حکومتوں کے عروج و زوال اور انقلابات زمانہ کے رونما ہونے میں نوجوانوں کا ناقابل فراموش حصہ ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے ابتدائی دور کی فتوحات ہوں یا تیرہ صدیاں بعد اسلام کے نام پہ بننے والی مملکت خداداد پاکستان کی آزادی۔ وہ ایرانی انقلاب کا تذکرہ ہو یا مصطفیٰ کمال اتاترک کی تحریک آزادی۔ علم و فن کی جولان گاہوں کی بات کریں یا تہذیب و ثقافت کی رفعتوں کی جانچ۔ ہر طرف جوانوں کا جنون نظر آتا ہے۔ کسی دانشور نے کیا پیاری تمثیل دی! نوجوانوں کی مثال آگ اور بوڑھوں کی، پانی کی سی ہے۔ جہاں کہیں نوجوانوں کا جذبہ و جوش اور بوڑھوں کا ہوش جمع ہو جائیں تو یہ سٹیم کی طرح زندگی کی گاڑی کو دھکیل کر منزل تک پہنچا دیا کرتے ہیں۔

عہد رفتہ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں جتنے بھی نامور اور مشاہیر پیدا ہوئے، انھوں نے اپنے ماں باپ سے تربیت پائی اور جوانی ہی میں بہت بلند مقام پالیا۔

وہ نوجوان ہی تھے جنھوں نے خلافت فاروقی میں قیصر روم اور کسرائے ایران کا جڑ سے خاتمہ کر دیا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کی شوکت آج کی امریکا اور برطانیہ کی طرح دلوں پھر دھاک جمائے بیٹھی تھی۔

ایرانی رستم کو ٹانگ سے پکڑ کر، نہر سے باہر نکال کر جس نے قتل کیا وہ "ہلال" نامی بہادر، حضرت عمرو بن العاصؓ کی فوج کا ایک نوجوان ہی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے جو سب سے آخری لشکرِ اسلام روم کی جانب روانہ کیا گیا، اس کے ہونہار کمانڈر اسامہ بن زیدؓ اٹھارہ سالہ نوجوان تھے۔ محمد بن قاسم کو سندھ کے راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے فوج کا چیف کمانڈر بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ آج سترہ سال کا بچہ گھر نہیں سنبھال

سکتا۔ ان سترہ، اٹھارہ سال کے بچوں نے پوری فوج کو سنبھالا اور سینکڑوں میل تک دین اسلام کو پھیلادیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ عین عالم شباب میں وقت کے بڑے شیخ بن چکے تھے۔ محبت الٰہی کے لاکھوں پیاسوں کو جام بھر بھر کر سیراب کرنے لگے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے ماں باپ سے اچھی تربیت پائی، پھر جوانی میں آسمان ہدایت پر ستارے بن کر چمکے۔ صرف یہی نہیں اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں۔ "البیرونی" دسویں اور گیارہویں صدی کا مشہور ماہر فزکس اور فلکیات ہے۔ اس نے پاکستان کی ایک تحصیل "پنڈدادان خان" کے قصبہ "نندنا" کے ٹیلے پر بیٹھ کر زمین کا محیط اور قطر اتنی درستی کے ساتھ ناپ لیا کہ آج کے ترقی یافتہ اور بھر پور ٹیکنالوجی کے دور تک اس میں صرف 79 کلومیٹر کا فرق معلوم کیا جاسکا۔ بیسیوں کتابوں کے اس مصنف کی عمر صرف ستائیس سال تھی۔

قارئین کرام ! دنیا کو مسلم نوجوانوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی صورت میں، ثقافت و حضارت کے روپ میں، علم و فن کے رنگ میں اور تاریخ و جغرافیہ کے طور پر بھی۔ یہ چھٹی صدی ہجری کی بات ہے، جب آرام دہ جہاز تھے نہ فلک پرواز طیارے اور نہ ہی صبار رفتار موٹریں۔ ایک شخص مغرب اقصی سے اٹھتا ہے اور ساری دنیا کا سفر کر ڈالتا ہے۔ اچکے لٹیروں کی لوٹ مار کا خوف آڑے آتا ہے نہ وحشی درندوں کی چیر پھاڑ کا ڈر۔ طوفانوں سے بغل گیری کا خدشہ اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر سکتا ہے نہ ہی بادشاہوں کا قہر۔ جب اس نے پچیس سالہ طویل اور صبر آزما سیاحت کا آغاز کیا تو وہ بائیس سالہ نوجوان تھا۔ دنیا اس کو "ابن بطوطہ" کے نام سے پہچانتی ہے۔

ماضی کی تابناکیوں سے تاریکیوں کے پردوں کو ذرا سرکا کر دیکھیے تو جتنی بھی قدآور شخصیات ہیں، ان میں چند باتیں مشترک نظر آئیں گی:

وہ وقت کے بے انتہا قدردان تھے۔ دل کے سچے اور کردار کے سُچے تھے۔ انھوں نے ایک دن کیا، پوری زندگی گزارنے کا نظام الاوقات بنایا ہوا تھا۔ ان کے سامنے ان کا خاص مقصد اور منزل ہوتی تھی جس تک پہنچ جانا ہی زندگی کی آخری خواہش ہوا کرتی تھی۔ وہ نوجوان زندہ ضمیری کے ساتھ ساتھ درس خودی کو دل میں جاگزیں کر چکے ہوتے تھے، بقول علامہ اقبال

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

لیکن آج کا نوجوان کل کے بوڑھے سے بھی نکما ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہے۔ وقت ضائع کرنے میں بلا کا ماہر اور مشتاق ہو گیا ہے۔ موبائل فون پہ گھنٹوں بات کرنا معمول کی بات ہے۔ انٹرنیٹ کی چیٹنگ پہ زندگی کے قیمتی لمحات برباد کرنا روزمرہ کے معمول میں داخل ہو گیا ہے۔

ذرا سوچیے! کہ ہمارے آباؤ اجداد نے تو ہمیں ورثے میں عزت، عظمت، خودی، خود داری، حکومت و سلطنت اور سب سے بڑھ کر اسلام کی دولت عطا کی تھی، مگر افسوس! ہم نے اپنے اجداد کی اس میراث کو کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عظمت کی بلندیوں سے ذلت کی گہرائیوں میں جا گرے۔ "اندلس" جہاں آٹھ سو سال مسلمان حکومت کرتے رہے، جب مسلمان اپنے اسلاف کے راستے سے ہٹے تو وہاں ایسے رُسوا ہوئے کہ ان کا نام و نشاں تک مٹ گیا۔ برصغیر جو ہمارے اسلاف سے ہمیں ورثے میں ملا تھا۔

صد افسوس! ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے اور ہزار سالہ حکومت کے بعد اسی ملک میں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔

اب پاکستان، جو ہمارے اجداد نے خون کے دریاؤں میں غوطے لگا کر ورثے میں ہمیں دیا ہے۔ اس میں بھی ہم نے خانہ جنگیاں شروع کر رکھی ہیں۔ ہمارے نوجوان ناکارہ ہو گئے۔ چوکوں چوراہوں پر سگریٹ کے کش بھرتے، راہ گیروں کو پریشان کرتے اور بے تکے نعرے مارتے گھنٹوں برباد کر دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم سے یہ نعمت چھن جائے اور ہم کف افسوس ملتے رہ جائیں، ہمارے جوانوں کو اپنے بزرگوں کی اٹوٹ پیروی کرنی چاہیے، تعمیری سوچ پیدا کرنی چاہیے، دنیا میں آئے ہیں تو کچھ کر گزرنے کی دُھن ہونی چاہیے، اپنے دریا کی موجوں میں طوفان پیدا کرنا چاہیے، اپنی خودی کو مسلمان کرنا چاہیے، تقدیر سے شکوہ نہیں، تقدیرِ یزداں کو بنانا چاہیے۔ اقبال مرحوم فرماتے ہیں۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

پاکستان کی قدر/ مقصد پر نظر

غلامی جیسی ذلت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلت نہیں اور آزادی جیسی نعمت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں۔ قرآن کریم نے آزادی کو بطور نعمت ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات دی تو اسے ایک نعمت گردانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے باسیوں کو گویا دو آزادیوں سے نوازا۔ ایک انگریز اور دوسری ہندوؤں کی غلامی سے آزادی۔ اس نعمت پر ہمیں اللہ کے حضور شکر گزار ہونا چاہیے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کی ہر حوالے سے ناقدری کی جارہی ہے۔ حکمران تو رہے اپنی جگہ، عوام بھی اس نعمت کی ناقدری میں کسی طور پیچھے نہیں۔ جس چیز کے لیے آزادی کی جنگ لڑی گئی اسے پس پشت ڈال کر ہم ان لاکھوں شہیدوں کے خون سے غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

69واں جشن آزادی منانے کے موقع پر کم سے کم اتنا ضرور غور کرنا چاہیے کہ ہم اپنی معاشی پالیسیوں اور خارجہ اور داخلہ امور طے کرنے میں کیا آزاد ہیں؟ کیا ہم دفاعی معاملات اور تجارتی ترجیحات خود طے کر رہے ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو بلاشبہ ہم آزاد ہیں اور آزادی پر فخر کرنا ہمیں زیب دیتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو کم از کم حکمرانوں اور قوم کو اس یوم آزادی کے موقع پر اپنے مقاصد میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے معاملات کو خود طے کرنے کے عزم کے ساتھ آزادی کے تحفظ اور اس کی برکات سے مستفید ہونے کا عزم کرنا چاہیے۔

پاکستان بنے قریباً 70 سال ہو گئے آج ہم یوم آزادی منا رہے ہیں لیکن افسوس نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود وطن عزیز پاکستان اپنے تخلیقی مقاصد حاصل نہیں کر سکا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی منزل سے دور بدور ہوتا چلا جارہا ہے۔ تحریک آزادئ پاکستان "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" کے نعرۂ مستانہ سے شروع کی گئی۔ بت کدہ میں یہ وہ زمانہ تھا جس مسلمان نے بھی خواہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا، مرد تھا یا عورت، جوان تھا یا بوڑھا، یہ آواز سنی تو کلمے کے تقدس اور

غلبہ اسلام کے لیے دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے مسلمانانِ ہند نے اپنا تن من دھن قربان کرنے کی وہ بے مثال قربانیاں پیش کیں کہ دنیا آج بھی ورطۂ حیرت میں ہے۔ جوانوں نے اپنے شباب کے نذرانے دیے، والدین نے اپنے جگر گوشوں کو پیوند خاک ہوتے دیکھا، باعصمت دوشیزاؤں کی عصمتیں تار تار ہوئیں، خون کی ہولی کھیلی گئی، آگ و خون کے دریا پار کرکے اور سب کچھ لٹا کے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

لیکن پاکستان بننے سے لے کر آج تک اکثر ایسا طبقہ اس پر مسلط رہا جو نہ پاکستان کا خیر خواہ نہ مقصد پاکستان کے ساتھ مخلص۔ منافقین کے روپ میں غدار، اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں اسلام کے روشن چہرے کو مسخ کرنے کی مذموم سازشوں میں مصروف رہے۔ ماڈریٹ اسلام اور ماڈریٹ مسلمان کی اصطلاحیں اور روشن خیال جدید معاشرے کے نعرے اس ملک کو اپنی منزل سے دور اور پٹڑی سے اتارنے کی سازشوں کا حصہ ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ اس پاک سرزمین پر اسلام کا نام لینے والوں کو دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ اسلامی وضع قطع رکھنے والوں پر کڑی نظریں رکھی جارہی ہیں۔

اسلام کا قلعہ کہلانے والا یہ ملک آج اسلام اور ملک دشمنوں کے نرغے میں ہے۔ اس ملک اور اس کے قومی اداروں کو صلیبی قوتیں اسلام کی بیخ کنی کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔

بد دینی، بے حیائی، عریانی اور بے پردگی کے سیلاب کو خوش آمدید کہا جارہا ہے، اسلام اور اسلامی شعائر کا سرعام مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہمارا ملکی میڈیا اس میں ہمہ وقت پیش پیش رہتا ہے۔ آئینی طور پر متفقہ چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے۔ ''سوال کی حرمت'' کی آڑ میں وہ وہ سوال اٹھائے جارہے ہیں کہ جن کے پس پشت ''خاص'' لوگوں کا ''مخصوص'' ایجنڈا کارفرما نظر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان ہر لحاظ سے خطرات سے دوچار ہے۔ نظریات اور جغرافیائی سرحدوں پر ظاہری و خفیہ میدانِ کارزار سرگرم ہے۔ بیرونی دشمن اور کچھ اندرونی آستین کے سانپ ملکی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہیں۔

پاکستان دنیا کے نقشے پر واحد اسلامی ملک ہے جو نظریے کے بنیاد پر معرض وجود میں آیا لیکن 70 سال گزرنے کے باوجود آزادی کے مقاصد حاصل نہ کیے جاسکے۔ آج پورا ملک بدامنی،

قتل و غارت، قومی، لسانی، صوبائی تعصّبات کی وجہ سے آگ اور خون کے کھیل میں رنگین ہو چکا ہے۔ ارباب اقتدار اگر ملک کو امن و امامن اور امن کا گہوارا بنانا چاہتے ہیں تو ملک و قوم کا خیر خواہ بن کر اس میں اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کو رائج کریں۔ ملک کے امن کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن و سنت کے نظام کو نافذ کیا جائے، تب ہی جا کر ملک اپنی آزادی کے حصول اور مقاصد حاصل کر سکے گا۔

مقامِ شکر ہے کہ ہمارا اکثر آئین اسلامی ہے، اگرچہ اس پر عمل درآمد میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ اس وقت پاکستان ہر لحاظ سے خطرات سے دو چار ہے۔ نظریات اور جغرافیائی سرحدوں پر ظاہری و خفیہ میدانِ کارزار سرگرم ہے۔ بیرونی دشمن اور کچھ اندرونی آستین کے سانپ ملکی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہیں۔

جس طرح نعمت کی قدر کا صلہ نعمت میں اضافے کی صوت میں ملتا ہے، اسی طرح نعمت کی ناقدری کی سزا وہ نعمت چھن جانے کی صورت میں ملتی ہے۔ ہم اس انتہا تک نہ جائیں کہ جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔

اس نعمت کی قدر اور شکر یہ ہے کہ اسے جن مقاصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا ان مقاصد کے پورا کرنے میں ہم حتی الامکان پوری کوشش کریں۔ ہم آواز اٹھائیں جہاں تک اٹھا سکتے ہیں۔ لوگوں میں شعور پیدا کریں، انھیں پاکستان سے محبت کرنا سکھائیں، جس طرح ذاتی گھر کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح اس کی بھی حفاظت کریں۔ جیسے اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، ایسے ملک کو بھی صاف ستھرا رکھیں، قوانین کا احترام کریں، ملکی وقار کی ضمانت بنیں۔

دشمن کے عزائم کو خاک میں ملائیں۔ ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر ملک پاکستان کی حفاظت کے لیے دعا مانگیں۔ ایک ملک صرف زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ دھرتی ماں ہے۔ ہم اس کی عزت، اس کے وقار کے لیے تن من دھن قربان کرنے کے لیے ہر دم تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ پیارے وطن کا حامی و ناصر ہو۔

دینی مدارس اور سانحۂ راولپنڈی

مدارس اور مساجد ہمارے دین کے اہم مراکز ہیں اور معاشرے میں اہم کردار ادا کرنے والے ادارے ہیں، لیکن صورت حال اس وقت یہ ہے کہ دینی اداروں کی طرف عوام اور خواص، اپنوں اور غیروں، دوستوں اور دشمنوں سب کی توجہ بڑھتی جارہی ہے۔جب دشمن نے دینی اداروں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا، منفی ذہن سازی شروع کی، ان کا وقار مجروح کرنے کی کوشش کی۔۔۔ تو چونکہ ان اداروں کے بانیان اور منتظمین کی نیت میں اخلاص کامل تھا۔اس لیے اس پروپیگنڈے کا اثر صرف ان لوگوں کے ذہن پر پڑا جن کے دل پہلے سے داغ دار تھے۔جن حضرات کے دل میں ایمان کی روشنی تھی وہ اس سے بچے رہے۔مغرب اس وقت مدارس کے خلاف تین طرح کی کوشش کر رہا ہے۔

پہلی کوشش یہ ہے کہ دنیا والے اہل مدارس سے بیزار رہیں اور اہل مدارس دنیا والوں کے لیے ایسے ہی نامانوس ہو جائیں جیسے کہ خود ان کے یہاں عیسائی مذہبی ادارے معاشرے پر اپنی گرفت کھو چکے ہیں اور روز بروز بے بس ولاچار ہوتے جارہے ہیں۔عیسائیت کا کردار مغربی دنیا میں صرف اتوار کی سروس تک محدود ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ مذہب اسلام کے نام لیوا اور اس کے داعی بھی مساجد تک محدود ہو جائیں اور دم درود، نذر و نیاز کے علاوہ ان کا معاشرے میں کوئی کردار نہ ہو۔اس روان دواں زندگی، جیتے جاگتے معاشرے اور ہر پل بدلتے عالم سے ان کا کوئی سروکار نہ ہو۔ان کو متحرک و فعال زندگی سے کاٹ کر آثار قدیمہ کی سی حیثیت دلادی جائے۔

دوسری کوشش مدارس کے دشمنوں کی یہ ہے کہ مدارس کو جن راستوں سے، جن ذرائع سے وسائل حاصل ہوتے ہیں، اس کا انھوں نے بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، بڑی دقت نظر سے سروے کیا ہے کہ یہ مدارس اپنی ذاتی آمدنی نہیں رکھتے، ان کے مقابلے میں چلنے والے عصری ادارے کروڑوں کے بجٹ پر چلتے ہیں، مگر اس طرح مثبت نتائج نہیں دیتے جس طرح یہ بے سروسامان ادارے نتائج دیتے ہیں۔ان کے پاس اپنے بجٹ کو پورا کرنے کے لیے

کوئی خاطر خواہ، کوئی مستقل نظام نہیں ہے اور اس کے باوجود یہ چل رہے ہیں۔ فروغ بھی پا رہے ہیں، ترقی بھی کر رہے ہیں۔ نئے سے نئے مختلف النوع ادارے وجود میں بھی آ رہے ہیں اور نتائج بھی دے رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے۔ واللہ! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب صفہ کے ساتھ بیٹھنے کا معجزہ ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے چلتے ہیں؟ لہٰذا اُن کی دوسری کوشش یہ ہے کہ مدارس کے ذرائع آمدن منجمد اور مفلوج کر دیے جائیں۔

تیسری بات وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اہل مدارس اس دنیا کے لوگ نہیں ہیں، یہ اس دنیا کا نظام نہیں چلا سکتے۔ یہ آسمان کے اوپر کی بات کر سکتے ہیں۔ زمین سے نیچے پر بھی گھنٹوں گھنٹوں بات کر سکتے ہیں، لیکن زمینی حقائق کا حل ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔ دنیا جن مسائل کا حل چاہتی ہے یہ ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ زمانے کی قیادت نہیں کر سکتے۔ یہ نظام نہیں چلا سکتے۔ لہٰذا اس مصرف بے جا میں آپ اپنی اولاد، عطیات، افرادی وسائل کیوں خرچ کرتے ہیں؟ آپ ان کو محبت و عقیدت کا مقام کیوں دیتے ہیں؟ ان کے سفید کپڑوں کا بھرم کیوں رکھتے ہیں؟ انھوں نے حسد اور بغض کی وجہ سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے چبا ڈالیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ فرسودہ روایات کے امین ہیں اور دقیانوسی نظریات کے حامل ہیں۔

اسی طرح لوگوں کو مدارس اور دینی مراکز اور مساجد سے بد ظن کرنے کے لیے یہ طریقہ بھی اپنایا جا رہا ہے کہ یہاں پر ایسے واقعات رونما کیے جائے کہ جس کی دہشت سے لوگوں کو گھبرا کر ان مدارس اور مساجد سے تعلقات ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ملک خداداد میں کئی مساجد اور مدارس میں کئی دھماکے اور حملے کیے گئے اور اب تک ہو رہے ہیں جس کی بین ثبوت دس محرم الحرام ۲۰۱۵ کو تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی کا سانحۂ فاجعہ ہے۔

دار العلوم تعلیم القرآن ملک کے اہم ترین علمی اداروں اور دینی مراکز میں سے ہے۔ یہ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان کا صدقہ جاریہ اور ان کی یادگار ہے اور دینی تحریکات کا مرکز چلا آرہا ہے۔

دار العلوم تعلیم القرآن حضرت شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان نے 1940ء میں قائم کیا تھا۔ یہاں تقریباً نصف صدی تک قرآن و توحید کا درس دے کر 1980ء میں شیخ القرآن اس دار فانی سے کوچ کر گئے ان کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے قاری احسان الحق ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے بعد شیخ القرآن کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد اشرف علی صاحب سال ہا سال سے دار العلوم کے مہتمم ہیں۔

عاشورا محرم ہر سال آتا ہے، جلوس بھی ہر سال گزرتے ہیں، مگر ایک طے شدہ وقت پر اپنی رسم ادا کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں، راجا بازار سے بھی ہر سال یہ جلوس اپنے روایتی راستوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ جایا کرتا ہے۔ راجا بازار سے اس جلوس کو چار بجے گزرنا ہوتا ہے، مگر اس بار یہ جلوس ایک بجے سے دو بجے کے دوران یہاں پہنچ چکا تھا، پھر اتفاق یہ کہ اس بار یوم عاشورا کو جمعہ بھی تھا جلوس میں بھی ہزاروں لوگ شریک تھے اور دار العلوم تعلیم القرآن کی مسجد میں بھی ہزاروں لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے دور دراز سے یہاں پہنچتے ہیں، جو جمعہ ادا کرنے کے بعد واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ راولپنڈی راجا بازار میں جمعہ کو عام تعطیل ہوتی ہے۔

دار العلوم تعلیم القرآن کے نیچے دکانوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے، یہاں کپڑے کی ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے جسے مدینہ مارکیٹ کہا جاتا ہے اسی مارکیٹ کے اوپر اساتذہ کی رہائش گاہیں تھی، دارالعلوم تعلیم القرآن کے ترجمان ماہ نامہ تعلیم القرآن کا دفتر تھا، طلبہ کی رہائش گاہیں تھیں، جیساکہ عرض کیا اس سال جلوس اپنے مقررہ وقت سے پہلے یہاں پہنچ گیا، اس وقت مسجد میں خطیب تقریر کر رہے تھے اور تقریر میں شان حسینؓ ہی بیان کر رہے تھے جلوس کی انتظامیہ نے مطالبہ کیا کہ مسجد میں ہونے والی تقریر بند کروائی جائے۔ مسجد کی انتظامیہ سے بات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ صرف آدھ گھنٹہ جلوس کو فوارہ چوک پر روک دیں

تاکہ جمعہ کی نماز ادا کی جاسکے، مگر جلوس کی انتظامیہ نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا، اتنے میں دس بارہ نوجوان تقریر کے دوران ہی مسجد میں گھس گئے، جہاں انھوں نے فائرنگ کی اور دس نمازی موقع پر شہید ہو گئے، اس فائرنگ سے یہاں بھگدڑ مچ گئی۔ اسی اثنا میں درجن بھر مزید مسلح افراد مسجد اور مدرسہ میں پہنچ گئے، انھوں نے نمازیوں پر حملہ کر دیا، جس کے باعث ایک سو سے زیادہ نمازی، طالب علم اور اساتذہ زخمی ہو گئے، پھر انھیں خنجر مارے اور انھیں شہید کر دیا، انھی بلوائیوں نے پولیس سے رائفلیں چھین کر فائرنگ کی، حالات کی سنگینی دیکھ کر پولیس بھی بے بس ہو گئی۔ اسی اثناء میں تعلیم القرآن کے نیچے مدینہ مارکیٹ کو آگ لگا دی گئی، لیکن افسوس کہ اس عظیم حادثے کو میڈیا نے کوریج نہیں دیا آخر یہ کیوں؟

دن رات میڈیا پر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف طاقت ہی واحد آپشن ہے تو پھر ان دہشت گردوں کے متعلق میڈیا نے کیوں خاموشی اختیار کیے رکھی جنھوں نے "ماتمی جلوس" کی آڑ میں حفظ قرآن کے معصوم طلبہ اور بے گناہ نمازیوں کے خلاف دہشت گردی کا ارتکاب کیا۔ ان کے گلے کاٹ کر گھسیٹا گیا، مسجد کی بے حرمتی کی گئی اور قرآن حکیم اور احادیث کی کتب کو نذر آتش کیا گیا۔

بال کی کھال نکالنے والا میڈیا آخر کیوں خاموش رہا؟ اس وقت سوشل میڈیا میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ یہ ایک جانبدار میڈیا ہے جو صرف وہی دکھاتا ہے جس کا حکم اس کے پشتیبان ان کو دیتے ہیں۔ "دو گروہوں میں تصادم" جیسے الفاظ تو اب تک کسی نے میڈیا کی ڈکشنری میں نہیں دیکھے، مگر سانحہ راولپنڈی میں "سچائی" کو چھپانے کے لیے یہ الفاظ سننے کو ملے۔

یہی طرزِ عمل انتہا پسندی کو فروغ دینے کا سبب ہے۔ سانحہ راولپنڈی پر اکثریت حیران تھی کہ آخر میڈیا کو کیوں سانپ سونگھ گیا؟ اگر واقعہ بڑا نہیں تو کرفیو کا نفاذ کیوں عمل میں آیا؟ الیکٹرانک میڈیا کے پراسرار بلیک آؤٹ پر سارا ملک انگشت بدنداں رہا۔ واقعات کو چھپانے کے عمل نے افواہوں کو جنم دیا۔ راولپنڈی کے باسی، افواہوں میں گرے رہے، اکثریت کو

سوشل میڈیا کا سہارا لینا پڑا۔ ملک کے دوسرے شہروں میں بھی حالات اسی وجہ سے خراب ہوئے۔

عرصہ دراز سے ہمارے علما یہی دہائی دیتے رہے ہیں کہ اگر اس ملک کو فرقہ واریت کی دھکتی آگ سے بچانا ہے تو ہر فرقہ کی عبادت کو اس کے عبادت خانوں تک محدود کیا جائے، کیونکہ عبادت، عبادت خانے میں ہی ہوا کرتی ہے نہ کہ چوکوں چوراہوں میں۔ یہ سیاسی جلسے جلوس تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کا عبادت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر دوسروں کے سینے پر لونگ دل "عبادت" کے رواج کو کنٹرول نہ کیا گیا تو اس ملک کو شام و عراق بننے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ فرقہ واریت کے خلاف صبح و شام بولنے والی میڈیا اور حکومت کو بھی اپنے رویے پر بھی غور کرنا چاہیے۔

محرم الحرام کے اس پورے عشرے میں فرقہ وارانہ رسومات کو جس طرح قوم کے اعصاب پر مسلط کیا جاتا ہے کیا یہ کسی بھی طور اسلام یا پاکستان کی کوئی خدمت ہے؟ جب تک حکومت تمام مکاتب فکر کے لیے یکساں رویہ نہیں اپنائے گی اور ایک ضابطہ اخلاق کی پابندی نہیں کروائے گی، اس وقت تک ان واقعات کی روک تھام ممکن نہ ہو گی۔ آخر تعلیم القرآن کے نماز جمعہ کے اجتماع کو کیا سیکورٹی فراہم کی گئی؟ کیا ساری سیکیورٹی فقط ماتمی جلوسوں کے لیے مختص تھی، فرقہ واریت کے انسداد کے نام پر ظلم پر خاموش نہیں ہوا جاسکتا، یہ نہیں ہو سکتا کہ بے گناہ مسلمانوں اور معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہے اور ہم فقط اس لیے خاموش رہے کہ فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو۔

اگر حکومت نے سانحہ راولپنڈی کے بعد صرف بیانات سے کام چلایا اور اقدامات نہ کیے تو پھر امن کی ضمانت مشکل ہو گی۔ یہی باتیں مولانا سمیع الحق، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا اشرف علی سمیت دیگر علمائے کرام نے نماز جنازہ کے اجتماع سے لیاقت باغ میں اپنی تقاریر میں کہی اور عطا اللہ بندیالوی نے پریس کانفرنس کے ذریعے اس کا اظہار کیا لیکن حکومت کی حالت زار پر بھی افسوس ہے اور بعض ان سیاسی و مذہبی رہنمائیوں پر بھی کہ جنھوں نے اس واقعہ پر افسوس اور غم کا اظہار تک نہیں کیا

اور خانہ خدا میں مظلوم نمازی، بے گناہ معصوم طلبہ ، شہدا کے سفاک قاتل مجروں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور سزا دینے کے مطالبے کے چند الفاظ منہ سے نکالنے کی توفیق بھی نصیب نہیں ہوئی۔

الغرض یہ ایسا واقعہ ہے جس کا دکھ اور صدمہ عرصہ دراز تک بھول نہیں سکے گا۔ ارباب اقتدار اور سیاسی ومذہبی قیادت کو روز روز کے اس طرح کے واقعات کو رکوانے کے لیے سنجیدگی سے سوچ کر لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے ورنہ غفلت کی صورت میں خدانخواستہ اس کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں کیونکہ کچھ لوگ اس وطن عزیز میں بھی عراق، لبنان، شام جیسے حالات پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک و قوم کی حفاظت فرمائیے اور ظلم ڈھانے والوں کو دنیا اور آخرت میں عبرت ناک اور بدترین سزا کا مستحق بنادیں۔آمین

یوم ختم نبوت اور آئین پاکستان

مفکر پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے مضامین میں قادیانیت کو یہودیت کا چربہ، اسلام، مسلمانوں کے غدار اور ملک کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ بقول ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کہ ”قادیانی پاکستان میں وہ پوزیشن حاصل کرنے کی تگ ودو میں مسلسل مصروف ہیں، جو یہودیوں کو امریکا میں حاصل ہے، تاکہ پاکستان میں اُن کی مرضی و منشا کے خلاف کوئی پالیسی تشکیل نہ پاسکے“۔

علما اور مسلمانانِ پاکستان کی جدوجہد سے علامہ اقبالؒ ہی کی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان کی قومی اسمبلی نے 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم اور اقلیت قرار دیا ہے۔ اب آئینِ پاکستان میں عقیدہ ختم نبوت کے منکر یعنی قادیانی غیر مسلم ہیں، لیکن اُس وقت سے لے کر آج تک آئینِ پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ آج بھی ہر قادیانی آئینِ پاکستان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خود کو مسلمان کہتا ہے، لہٰذا قادیانی آئینِ پاکستان کے منکر اور وطن کے غدار ہیں۔ تاریخ ان کی وطن دشمنی اور غداری کے واقعات اور شواہدات سے بھری پڑی ہے۔

اس پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے آئینِ پاکستان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پاکستان کے اہم عہدوں پر کیسے براجمان کیا جاسکتا ہے؟ حال ہی میں نئی حکومت کی طرف سے اقتصادی کونسل کے اراکین میں سے قادیانی جماعت کے ایک متحرک رکن کو شامل کرلیا گیا ہے، جو محب وطن قومی حلقوں میں تشویش کا باعث اور آئینِ پاکستان کے خلاف ہے، جس پر حکومت کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور قوم کی اُمنگوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

یہ بات صرف مذہبی جذباتیت نہیں، بلکہ پاکستان کے مفاد میں زمینی حقائق، آئین کی پاسداری اور پاکستانی قوم کے جذبات کا احترام اور ان کا اجتماعی فیصلہ ہے۔ حکمرانوں اور اداروں کو

اس بات کا ادارک ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس، حرمت اور ختم نبوت دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے نزدیک ریڈ لائن ہے، جو بھی اسے پلانگنے کی کوشش کرے گا تو دنیا کا ادنٰی سے ادنٰی مسلمان اسے برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ ناموس رسالت اور ختم نبوت کا مسئلہ امتِ مسلمہ اور خصوصاً پاکستانی قوم کے لیے اتنا حساس مسئلہ ہے کہ اس بارے میں وہ کسی بھی قسم کی مفاہمت اور سمجھوتے کو تیار نہیں اور یہ ایک قطعی حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ختم نبوت کے معاملے میں امت مسلمہ اور پاکستانی قوم سے لچک، برداشت اور رواداری کی توقع رکھنا حماقت ہے اور جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ مولانا ظفر علی خان نے کیا خوب کہا:

نماز اچھی روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھے
مگر میں باوجود اس کے مسلمان ہو نہیں سکتا
میں جب تک کٹ مروں نہ خواجۂ (بطحا) یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد میرا ایمان مکمل ہو نہیں سکتا

گستاخانہ خاکوں کے منسوخی کے بعد؟

مسلمانوں کا ایمانی جذبہ بالاخر رنگ لایا اور ہالینڈ (نیدرلینڈز) پالمینٹ میں منعقدہ 10 نومبر کو متوقع گستاخانہ خاکوں کے نمائشی مقابلہ اُن کی حکومت نے منسوخ کر دیا۔ یقیناً اُس کے خلاف اجتماعی مہم میں حصے لینے والے تمام شخصیات، ادارے، حکومتیں اور جماعتیں مبارکباد کے مستحق تو ہیں لیکن معاملہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ ملعون گیرٹ ویلڈر نے اپنے ٹوئٹر پیغام میں کہا ہے کہ " معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا، مسلمان اس اعلان منسوخی کو اپنی فتح خیال نہ کرے۔"

توہین رسالت کی مذموم حرکت کے جواز میں اہل مغرب آزادی اظہار رائے کے فلسفے کے حوالے دیتے ہیں حالانکہ اسی طرح کے شر انگیزی کا آزادی رائے سے کوئی تعلق نہیں۔ تعجب ہے کہ مغرب نسلِ انسانی کے معزز شخصیات انبیا علیہم السلام کی عزت وناموس کو وہ مقام دینے کو تیار نہیں جو کسی بھی ملک کے لیے عام شہری کو حاصل ہے، حالانکہ انسان کی عزت و تکریم تمام آسانی مذہب کے ساتھ ساتھ آج کے فلسفہ انسانی حقوق کا بھی حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی میثاق برائے سیاسی وشہری حقوق کی دفعہ 20 مشق 2 میں ہے کہ کوئی ایسا اظہار خیال جو قومی، سیاسی، نسلی یا مذہبی منافرت پر بنی اور وہ کسی بھی طرح کے ناروا امتیاز، عداوت یا تشدد کا موجب بنے، اسے قانوناً ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔

دوسری طرف مغرب میں یہودوں کے جھوٹی افسانہ ہولوکاسٹ پر اظہار رائے کی آزادی سلب کردی گی ہے کیونکہ وہ یہودیوں کے جذبات کے خلاف ہے، جبکہ محسن انسانیت کی توہین کی اجازت دے کر ڈیرھ ارب مسلمان کی جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا کوئی پرواہ ہے نہ کوئی قانون۔ الغرض یہ معاملہ صرف منسوخی کا اعلان کرانے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ارباب اقتدار مستقل حل تلاش کریں۔ اوائی سی کے ذریعے اقوام متحدہ سے عالمی سطح پر اس کے لیے سخت قانون سازی کی جائے جس کے لیے حوصلہ، حکمت ودانش اور اجتماعیت کے ساتھ موئثر کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اس سلسلے میں ملائشیا کے مہاشیر محمد، ترکی کے طیب اردگان سے مشاورت کریں اور سعودی عرب کے شاہ سلمان کو بھی ساتھ لیں، یہ بات یقیناً بے نتیجہ نہ ہوگی۔ جیسے چوتھی عرب جنگ کے موقع پر امتِ مسلمہ متحد ہو کر شاہ فیصل مرحوم نے یورپ سے کہا تھا کہ اگر امریکہ اور یورپ اسرائیلی جارحیت کی مدد جاری رکھیں گے تو ہم تیل کی ترسیل بند کریں گے جس کا فوراً یہ اثر ہوا کہ وہ اسرائیل کی حمایت سے منحرف ہوئے۔ وزیر اعظم عمران خان اس وقت پاکستانی عوام کے ایک مقبول رہنما ہیں، ان کے پاس یہ موقع ہے کہ وہ اسلامی دنیا میں بھی قائدانہ کردار ادا کر کے اس مسئلے کے حوالے سے اپنا نام تاریخ میں امر کر دیں۔

آسیہ مسیح کیس پس منظر و پیش نظر

جون 2009 میں شیخوپورہ کے گاؤں نانکانا والی کے ایک عیسائی خاتون آسیہ مسیح نے مسلمان خواتین کے ساتھ بحث ومباحثہ کے دوران رسول اللہ ﷺ کی شان میں نازیبہ زبان استعمال کی۔ گستاخی کے ارتکاب کے بعد پرامن طریقے سے عورت کو اس علاقے کے قاری سلام نے پانچایئت کے سامنے پیش کیا اور ہزاروں لوگوں کے سامنے اقرار مجرم کیا۔ علاقے کے ایس پی نئیر بخاری نے رپورٹ درج کر کے اہل علاقہ نے اس کیس کو شیخوپورہ کے ڈسٹرکٹ کورٹ میں لے گئے، جہاں گواہوں کے بیانات قلم بند ہوئے اور اس عیسائی خاتون کو نومبر 2010 میں موت کی سزا سنادی گئی۔ اس خاتون کے شوہر اسحاق مسیح نے فیصلہ کیا کہ وہ اس فیصلے کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کرے گا۔ ایک ماہ کا گزرنا تھا کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے فیصلہ کیا کہ اگر لاہور ہائی کورٹ فیصلہ برقرار رکھتی ہے، تو وہ صدارتی معافی کے اختیار کو استعمال کروانے کے لیے صدر آصف علی زرداری سے اس عیسائی گستاخ خاتون کی معافی کے لیے اپیل کرے گا۔ اس دوران لاہور ہائی کورٹ نے اس معافی کی اپیل پر Stay order دے دیا اور اس عیسائی گستاخ خاتون کی خلاف ڈسٹرکٹ کورٹ شیخوپورہ کے جج محمد نوید اقبال کے فیصلے کو برقرار رکھا، اس عیسائی گستاخ خاتون کو کورٹ نے جیل میں ڈال دیا گیا۔ سلمان تاثیر نے اپنی گورنری کا اثر ورسوخ استعمال کر کے جیل میں اس گستاخہ سے ملاقاتیں کی اور پریس کانفرنس کر ڈالی کہ ایسے کالے قانون کو ہم نہیں مانتے جس سے کسی اقلیتی کی جان کو خطرہ ہو۔ میڈیا میں اس معاملے پر بحث ومباحثہ ہونے لگا۔ اور 4 جنوری 2011 کو کوہسار مارکیٹ اسلام آباد میں سلمان تاثیر کے ڈیوٹی گارڈ 26 سالہ ملک ممتاز قادری نے سلمان تاثیر کو قتل کر دیا۔ دوسری جانب وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور شہباز بھٹی ان کوششوں میں تھے کہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 295c کو تبدیل کیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ انھی الزامات کی ضد میں یہ وزیر بھی آگیا۔ 2 مارچ کو اس وزیر کو اس کے گھر کے باہر قتل کر دیا گیا۔ 16 اکتوبر 2014 کو ایک بار اس عیسائی خاتون کی اپیل کو مسترد کر دیا گیا۔ 20 نومبر 2014 کو صدر پاکستان کو پھر معافی کی اپیل کی گئی۔ 24 نومبر 2014 کو اسحاق مسیح نے پھر اپنی بیوی کے لیے

سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور 22 جولائی 2015 میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس عیسائی خاتون کی سزائے موت تب تک معطل کر دی جب تک اپیلوں کا فیصلہ نہیں آجاتا۔ 26 مارچ 2016 میں دوبارہ ہائی کورٹ میں سماعت مقرر ہوئی۔ 13 اکتوبر 2016 کو تین رکنی بینچ تشکیل دیا گیا۔ اسی صبح اسی بینچ کے جج، جسٹس اقبال حمید الرحمان نے اس کیس کی سماعت سے انکار کر دیا۔ اسی جج نے صدر پاکستان ممنون حسین کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس ثاقب نثار نے 26 اپریل 2017 کو اسی عیسائی خاتون کی اپیل کی درخواست مسنوخ کر دی۔

اس گستاخہ خاتون کو بچانے کے چکر میں ایک گورنر پنجاب سلمان تاثیر موت کے منہ میں چلا گیا۔ اسی آسیہ مسیح کو بچانے کے چکر ایک وفاقی وزیر بھی زندگی سے ہاتھ دو بیٹھا۔ اسی آسیہ مسیح کے خلاف ممتاز قادری نے پھانسی کے پندہ قبول کر لیا۔ اس طرح تین لوگ اپنی جان سے ہاتھ دو بیٹھے لیکن توہین رسالت کے قانون 295c کے تحت ایک ثابت شدہ گستاخ کو پھانسی نہ دی جا سکی۔ بین الاقوامی NGOS، بڑے بڑے پادری، فرانس کے پوپ دوم، روم کے کیتولک ساری کمیونٹی خاتون کو بچانے میں لگے گئی۔ لیکن حکومتی مشینری بالکل مفلوج ہو گئی ہے۔ اب 31 اکتوبر 2018 کو چیف جسٹس ثاقب نثار کی قیادت میں تین رکنی بیچ نے آسیہ مسیح ثابت شدہ گستاخ ملعونہ کی اپیل کی سماعت کی اور فیصلہ محفوظ کر لیا۔ کیا وجہ ہے کہ 9 برس گزر گئے، اعلیٰ عدالتوں سے سزائے یافتہ گستاخ کو سزا کیوں نہیں دی جا سکی۔ آخر رسول اللہ ﷺ کی ناموسِ رسالت کا قانون کس طرح بے اثر ہو گیا۔

یہ حکومت وقت، وزیر اعظم، چیف اف آرمی سٹاف اور چیف جسٹس سے 20 کروڑ عوام کی طرف سے سوالیہ نشان ہے۔ کیا یہ توہین رسالت کے شرعی اور آئینی قانون پر سمجھوتہ تو نہیں ہے؟ فیصلہ کا طریقہ کار غیر پیشہ ورانہ تھا اور اسے جلدی میں سنا گیا جس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ کیا یہ فیصلہ عالمی دباؤ میں تو نہیں کیا گیا۔ کیس کمزور نہیں تھا۔ کم از کم اتنا جاندار ضرور تھا کہ ہائی کورٹ تک فیصلہ برقرار رہا۔ اتنے حساس کیس کو سپریم کورٹ نے صرف ایک ہی دن میں کیوں نمٹا دیا؟

31 اکتوبر غازی علم دین کا یوم شہادت بھی ہے۔ کیا اس دن کا انتخاب قصداً کیا گیا کیونکہ فیصلہ کئی دن پہلے سے محفوظ تھا۔ وزیر اعظم عمران خان سے پادریوں کی ملاقاتیں بھی اس فیصلے کے پس منظر میں موجود تھیں۔ پورا ملک غیر ملکی امداد پر چل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب معاشی بلیک میلنگ کا نتیجہ اور ای ایم ایف کی امداد کا شرط ہو؟ پاکستان سیاہ ترین دن جس میں گستاخہ آسیہ ملعونہ کو سزائے موت سے بری کر دیا۔ مکان کتنا دور تھا، لوگوں کتنے تھے، کیس اور گستاخی پر بحث ہی نہیں کی گئی شک اور شبہ کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا۔ اس پر اس طریقے کو اختیار کرنے، ریاست کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کے باوجود ایسا ہوا تو حکمران بتائے اب یہ لوگ کس کے پاس جائے۔ یہ عوام کو قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔۔؟

آسیہ مسیح کیس کے بعد اقدامات

صورت حال یہ ہے کہ پورا ملک ایک عجیب سے صدمے سے دوچار ہے۔ اس صدمے کی وجہ یہ نہیں کہ کسی ملزم کو بری کیوں کیا گیا؟ بلکہ اس کے محرکات میں مسلمانوں کے وہ حب رسول ﷺ کے جذبات سرِ فہرست ہیں، جن کی وجہ سے وہ کسی قسم کی گستاخی شانِ رسالت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ مسلمان اعمال واخلاق اور معاشرت کے حوالے سے تو کمزور ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ تاج دار ختم نبوت ﷺ کی عزت و حرمت اور ناموس وو قار کے معاملے میں کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

جہاں تک مغربی ممالک اور بین الاقوامی سیکولر لابیوں کا تعلق ہے انھوں نے تو یہ بطور پالیسی طے کر رکھا ہے کہ نہ صرف اپنے ممالک میں توہین رسالت کے واقعات کی سرپرستی کرتی رہیں گی بلکہ مسلم ممالک میں بھی ایسے افراد اور لابیوں کی پشت پناہی کریں گی جو مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلتی رہیں اور مذہبی اقدار و شخصیات کی اہانت اور بے توقیری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ برطانیہ کے سلمان رشدی، بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین، مصر کے ڈاکٹر نصر ابوزید، گوجرانوالہ پاکستان کے سلامت مسیح اور بہت سے دیگر افراد کو اس بنیاد پر مغربی ممالک میں پناہ دی گئی ہے اور ان کے اخراجات اور تحفظ کی سرکاری طور پر ذمہ داری اٹھائی گئی ہے کہ وہ توہین مذہب کے مرتکب ہوئے ہیں اور انھوں نے توہین رسالت کے قبیح اور مذموم جرم کا ارتکاب کر کے بین الاقوامی سیکولر لابیوں کو نفسیاتی تسکین مہیا کی ہے۔

آسیہ مسیح کے ساتھ مغربی ملکوں اور لابیوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ مبینہ طور پر ایک مغربی ملک نے تو آسیہ مسیح کو پورے خاندان سمیت سیاسی پناہ اور تحفظ کی پیشکش بھی کر دی ہے اور آسیہ کے شوہر نے یورپ ممالک سے پناہ بھی مانگی ہے۔ قرار دادِ مقاصد کا معاملہ ہو، قادیانیوں کے بارے میں دستور و قانون کی بات ہو، یا تحفظ ناموس رسالت کا مسئلہ ہو۔

اب دینی حلقوں کے خلاف سب سے بڑا مورچہ سپریم کوٹ بار اور وکلا کا فورم ہوگا۔ اس کے لیے دینی حلقوں کو اب نئی صف بندی کرنا ہوگی، وکلا برادری میں اپنے ہم خیال تلاش کرنا

ہوگا،انھیں متحرک کرنا ہوگا اور اس کے لیے حکمتِ عملی اور طریق کار بھی از خود طے کرنے کی بجائے سینئر اور تجربہ کار وکلا کے مشورہ سے اور ان کی راہنمائی میں مرتب کرنا ہوگا۔ ورنہ آسیہ مسیح کیس صرف ٹیسٹ کیس ہے،اس سے بڑے بہت سے کیس مستقبل قریب میں دینی حلقوں کو چیلنج کرنے کے لیے لائن میں لگے ہوئے ہیں۔

بقول پروفیسر ڈاکٹر مشتاق، دینی طبقے کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ قانونی اور عدالتی نظام سے یکسر لاتعلق رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کے دباؤ اور منبر کی طاقت کے ذریعے وہ حکومت اور عدالت کو"ٹف ٹائم" دے کر مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران میں یہ طبقہ کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور جب فیصلہ ان کے توقعات کے خلاف آئے تو پھر شدید احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ معاملہ آسیہ کیس میں ہی نہیں دیگر مقدمات میں بھی ہے۔ سود کا مقدمہ ہی لے لیجئے۔ 2002ء سے یہ مقدمہ وفاقی شرعی عدالت میں لٹکا ہوا ہے آج تک اس میں دینی طبقے کی جانب سے کوئی مؤثر حصہ نہیں ڈالا گیا لیکن کل کلاں اگر عدالت نے فیصلہ دیا جو دینی طبقے کو ناقابل قبول ہو تو پھر شدید احتجاج کا سلسلہ شروع کر کے فیصلے کو تبدیل کرنے یا معطل کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت دینی طبقے کو soul searching کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے لیے صحیح لائحۂ عمل تجویز کر سکتا ہے۔

اسلام کا نظامِ سیاست وریاست

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔یعنی زندگی کا کوئی بھی شعبہ دائرہ اسلام سے باہر نہیں اور چونکہ سیاست وریاست بھی انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے چنانچہ یہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہے اور اس کے بارے میں بھی اسلام میں واضح ہدایات موجود ہیں۔اسلام اور سیاست کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔اسلام اور حکومت وریاست دو جڑواں بھائی ہیں دونوں میں سے ایک بھی دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔اسلام دین ودنیا کے مابین تفرق کا قائل نہیں اور نہ ہی یہ مسجد ومدرسے تک محدود ہے۔

اسلام اور سیاست کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے .اور ان کی آپس میں اتنی گہری وابستگی ہے کہ اگر سیاست وریاست اور حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم و بے انصافی کا ذریعہ بن کر چنگیزیت بن جاتی ہے بقول اقبال۔

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب مسلمانوں نے محمد فاتح کی قیادت میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو اس وقت عیسائیوں کے دو گروہ رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے درمیان اس بات پر جھگڑا اور مناظرہ تھا کہ عیسیٰؑ نے اپنی عمر میں میدہ کی روٹی کھائی ہے یا نہیں۔وہ انھی جھگڑوں میں مصروف تھے کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ پھر ان کے درمیان آپس میں اسی طرح کے معمولی مسائل پر جھگڑے ہوتے رہے اور دونوں طرف بہت قتل عام ہوا۔اگر حکومت رومن کیتھولک کی ہوتی تو پروٹیسٹنٹ کو قتل کرتے اور اگر حکومت پروٹیسٹنٹ کی ہوتی تو رومن کیتھولک کو قتل کرتے۔ پھر عیسائیوں نے ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے مذہب اور سیاست و حکومت کو جدا کر دیا کہ حکومت مذہب سے جدا چیز ہے اور ہر گروہ و مسلک والے اپنے اپنے مذہب و مسلک کے مطابق زندگی گزاریں اور اعلان کیا ہے کہ مذہب کا تعلق صرف گرجے کے ساتھ ہوگا، مذہب کا حکومت

کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اتوالقیصر ما للقیصر وللہ ما للہ ۔ حکومت کا معاملہ حکومت کے ساتھ اور اللہ کا معاملہ اللہ کے ساتھ۔ Politics & Religion are two different thingsاس طریقے سے ان کے درمیان جھگڑے ختم ہو گئے اور حکومت آزاد ہو گئی۔ پس یہاں سے جمہوریت شروع ہوئی، سیاست اور دین جدا جدا چیزیں ہونے کا تصور دنیا میں عام ہونے لگا، لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ اور خیال عیسائیوں کا ہے اگر ان کے دین ومذہب میں حکومت نہیں تو نہ ہوگی کیونکہ ان کے پیغمبر عیسیٰؑ نے حکومت نہیں کی تھی۔ ہمارے اسلام میں سیاست اور حکومت بھی مذہب اور دین پر بنا ہے، ایک دوسرے سے جدا نہیں کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی پھر آپؐ کی وفات کے بعد سب سے پہلے مسئلہ خلافت امتِ مسلمہ نے حل کیا اور ابو بکر صدیقؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ ابو بکر صدیقؓ سمیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سات شاگردوں ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان ذوالنورینؓ، علی مرتضیٰؓ، حسن بن علیؓ، امیر معاویہ بن سفیانؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ نے حکومت کی۔ اور پھر یہی حکومت وخلافت تابعینؒ وتبع تابعینؒ میں جاری رہی۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میرے بعد بارہ امیر ہوں گے (بخاری: ۲/۱۰۷۲)، اور فرمایا" یعنی میری نبوت کے بعد خلافت ہوگی (بزاز)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ اللہ کی زمین پر اللہ کا دین کامل اور اسی کا قانون نافذو جاری ہو۔ ان کی یہ جدو جہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی۔ ان پاک ہستیوں نے ایمان اور عقیدۂ توحید کے بیان کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں جو بھی منکر و بے اعتدالی دیکھی خواہ اخلاقی ہو یا معاشی یا سیاسی اس کی اصلاح پر توجہ دی اور اصلاح عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات معاشرت کے ساتھ ساتھ سیاست وریاست کی اصلاح پر بھی بہت زور دیا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ "بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کرامؑ کیا کرتے تھے۔"

بنا بریں قرآنی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی طرزِ سیاست وخلافت قائم کی جسے بعد میں خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین نے اسی معیاری شکل میں انبیائے کرام علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ کے

مطابق جاری رکھا۔ یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ سیاست سے ہماری مراد موجودہ مغربی وجمہوری سیاست نہیں بلکہ خالص اسلامی سیاست وریاست مراد ہے۔

اسلامی سیاست:

سیاست کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں جبکہ شریعت کی اصطلاح میں سیاست القوم سے مراد قوم کو جملہ دینی و دنیاوی ضروریات مہیا کرنا ہے، انھیں مصائب سے بچانا اور ان کی کامرانی ومنفعت کے لیے جملہ تدابیر، دنیوی واخروی سعادت و بھلائی کے لیے جدوجہد اور مفید وسائل اختیار کرنا سیاست ہے۔ چونکہ سیاست وریاست دینِ اسلام کا اہم جز ہے اس لیے اس کو قرآن وسنت، اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طریقے پر کرنا ضروری ہے جو کہ صدق وسچائی کی بنیاد پر استوار ایک اُصولی سیاست ہے اور اگر سیاست اس طریق پر نہ ہو تو وہ دین نہیں بلکہ بدعت و خباثت رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور میں نام نہاد سیاسی پارٹیوں نے جھوٹ، دھوکہ اور وقتی مصلحتوں پر مبنی سیاست شروع کر رکھی ہے اور اسے اسلامی سیاست کا نام دیا ہے۔

اسلامی سیاست کی بنیاد تین اُصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یعنی توحید، رسالت اور خلافت۔ ان اصولوں کو سمجھنے کے بغیر اسلامی سیاست کے تفصیلی نظام کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے پہلے ان کی مختصر تشریح ضروری ہے۔

توحید ورسالت:

توحید کے معنی ہیں کہ اس دنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا خالق، پروردگار اور مالک ایک اللہ جل شانہ ہے۔ حکومت وفرمان روائی اس کی ہے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے۔ الوہیت، بندگی واطاعت اور حاکمیت بلاشرکتِ غیرے اسی کے لیے ہے۔ ہماری یہ ہستی جس کی بدولت ہم موجود ہیں، یہ جسمانی آلات وطاقتیں جن سے ہم کام کرتے ہیں، اور وہ اختیارات جو ہمیں دنیا کی موجودات پر حاصل ہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ہماری پیدا کردہ ہے یا حاصل کردہ ہے اور نہ ہی اس خالقِ دوجہاں کی عطائی میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ اس لیے اپنی ہستی کا مقصد، اپنی قوتوں کا مصرف اور اپنے اختیارات کی حدود وقوانین مقرر

کرنا نہ تو ہمارا کام ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا حق ہے۔یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے جو کہ ہمارا خالق اور ہمیں اختیارات عطا کرنے والا ہے۔توحید کا یہ اصول انسانی حاکمیت کی سرے سے نفی کرتا ہے۔خواہ وہ ایک انسان ہو، خاندان ہو یا ایک گروہ و طبقہ، حاکمیت کا حق کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔حاکم صرف اللہ ہے اور اسی کا حکم قانون ہے۔

اللہ کا حکم جس کے ذریعے سے بندوں تک پہنچتا ہے اسے رسول کہتے ہیں اور اس کی ڈیوٹی رسالت کہلاتی ہے۔اور رسالت کے ذریعے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ ایک کتاب جس میں خود اللہ تعالیٰ نے قانون بیان کیا ہے اور دوسرا اس کتاب کی مستند تشریح جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول و فعل (احادیث وسنت) کے ذریعے پیش کی ہے انھی دو چیزوں کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں ''شریعت'' ہے اور یہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست وخلافت قائم ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست (خلافت):

خلافت کا مطلب ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا مامور ہے یعنی اللہ کی طرف سے اس کی ملک میں دے دیے گئے اختیارات اسے اسی کی مرضی اور قانون کے مطابق استعمال کرنا ہوں گے۔اسلام زمین پر انسان کو خلیفہ قرار دیتا ہے جو دراصل اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرکے اسی کی حاکمیت کے تحت خلافت کرے گا اور اس کے مقرر کردہ قوانین وحدود کے اندر رہ کر نظامِ خلافت چلائے گا، کیونکہ منصبِ نبوت مختلف اجزا سے مرکب ہے۔مِن جملہ ان میں سے ایک جزو حی اور شریعت میں تشریح وتاسیسِ قوانین یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسؤلانہ قوت تو اس جز کے اعتبار سے نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا ہے۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔اب اس کی جگہ کسی دوسری چیز (قانون) کا آنا نقص ہوگا نہ کہ تکمیل۔ لیکن منصبِ نبوت اس اصلی جز کے ساتھ بہت سے تبعی اجزا پر بھی مشتمل تھا اور ضروری تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا رہے اور وہ ہے خلافت۔پس خلفائے راشدینؓ اور امرائے اسلام کو جو نیابت پہنچی اس میں وحی وتشریع کی قائم

مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن ان میں باقی تمام اجزا و خصائصِ نبوت کی نیابت یقینی طور پر داخل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت وسلطنت، نظام و قوام، سیاست، قیادتِ فوج و حرب، فتح و عمرانِ ممالک وریاست، مجالسِ شوریٰ وغیرہ، حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا۔ اس لیے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافت میں بھی خلفائے راشدین کے وجود ان تمام منصوبوں کا جامع تھا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحبِ خلافت بھی تھے، صاحبِ اجتہاد و قضا بھی اور صاحبِ سیاست و نظمِ احکام ریاست بھی اور پھر یہی صفات و کمالات دوسرے امرائے اسلام میں بھی ہونے چاہیے۔ اسلام کا نظامِ ریاست نہ تو موجودہ غلط مغربی جمہوریت کی طرح ہے اور نہ ہی بادشاہت و آمریت کی طرح بلکہ وہ ایک صحیح معتدل و منصفانہ شورائی نظامِ خلافت پر قائم ہے۔ جو ایک شورائی نظام کے تحت چلتی ہے۔ مجلس شوریٰ اسلامی نظامِ حکومت کا ایک اہم ستون ہے جس کے بغیر خلافت نہیں چل سکتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

"اور ان سے مشورہ لیتے رہا کیجیے۔" (عمران: ۱۵۹)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور ان کا ہر کام مشورہ سے ہوتا ہے۔" (شوریٰ: ۳۸)

اسلامی نظام، اہمیت اور طریقہ کار

پندرہویں صدی کے اختتام پر مسلمانوں کے ہاتھ سے اُندلس نکل گیا جہاں تقریباً ایک ہزار سال مسلمانوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ صرف حکومت ہی قائم نہیں کی تھی، بلکہ علوم و فنون میں بھی پوری دنیا کے امام بن گئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جس دن سے مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہوا، یورپ میں ترقی کی سرسراہٹ اسی دن سے شروع ہو گئی۔ اُندلس کے سقوط کے نتیجے میں مسلمان پوری دنیا میں زوال کی طرف لڑھکنے لگے، اور یورپ میں اسی کے بعد سے ترقی کے آثار پیدا ہوئے، ورنہ اُس وقت تک یورپ جہالت کی تاریک گھٹاؤں اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اُندلس کے سقوط کے تقریباً 100 سال بعد ہی یورپ کو ایک بڑی مادی کامیابی یہ حاصل ہو گئی کہ انھوں نے ایک طرف امریکا کو دریافت کیا اور دوسری طرف ہندوستان کا بحری راستہ واسکوڈی گامانے دریافت کر لیا۔ بعض واقعات کے اثرات کئی صدیوں تک چلتے ہیں، یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے دو واقعات تھے لیکن ان دو واقعات نے پوری دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ کو بدل ڈالا، اور قوموں میں انقلاب برپا کر دیا۔ یورپ میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا، نئی سائنس اور نئی ٹیکنالوجی تیزی سے بڑھی، جو بڑی حد تک علماء اندلس کی کاوشوں اور ثمرات سے خوشہ چینی کر کے پیدا کی گئی۔ علمائے اندلس کی وہ کتابیں ہم تک کم پہنچی تھیں جن سے یورپ نے استفادہ کیا، اور پھر یورپ میں تیز رفتار تبدیلیاں فکری میدان میں بھی عمل میں آئیں، معاشی میدانوں میں بھی انقلابات رونما ہوئے، اور سیاسی میدان میں بھی تیز رفتار انقلابات آئے۔ انگلستان کا صنعتی انقلاب اپنے ساتھ بے شمار نئے مسائل لے کر آیا اور 18ویں صدی کے اختتام پر انقلاب فرانس مزید دور رس تبدیلیاں لے کر آیا۔ انگلستان کا صنعتی انقلاب اور فرانس کا سیاسی انقلاب، یہ دو انقلابات ایسے ہیں جنھوں نے پوری دنیا کی زندگی کا رُخ بدلا۔

ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں، ہمارے لیے اس میں سب سے بڑا چیلنج اسلام کی رو سے دینی اقدار، دینی روایات، عقائد اور اسلامی فقہ کے

میدان میں ان مسائل کا حل اور جواب تلاش کرنا ہے جو ان بڑے بڑے انقلابات نے پیدا کیے ہیں۔ خلاصے کے طور پر اتنا عرض کرتا چلوں کہ اور بھی کئی بڑے بڑے میدان کھل گئے ہیں، جن میں مسلمانوں کو اپنی بھرپور صلاحیتیں لگانے کی ضرورت ہے اور یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے میدان ایسے حالات میں کھلے جب مسلمان اپنی تاریخ کے زوال پذیر دور سے گزر رہے تھے۔ ہمارے اسلاف کے زمانے میں، جب امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ائمہ مجتہدین کو حالات سے واسطہ پڑا، وہ ہمارا عہد عروج تھا، یونان کا فلسفہ آیا تھا، علماء اس میں مہارت پیدا کرکے اس کے جوابات دیتے تھے، نئی حکومتیں اور نئی فتوحات ہوئی تھیں، فقہی مسائل کے نئے میدان کھلے تھے، ان کا حل کرنے کے لیے نابغۂ روزگار ہستیاں موجود تھیں، فقہا، مجتہدین موجود تھے۔ ابو منصور ماتریدی، فخر الدین رازی اور امام غزالی رحمہم اللہ جیسے اللہ والے مفکرین موجود تھے۔

اب ہوا یوں ہے کہ انقلاب شاید اس سے بھی زیادہ ہمہ گیر ہے، اور مسائل اس سے زیادہ پھیلے ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ پیچیدہ ہیں، لیکن اُمت اپنے زوال کے دور سے گزر رہی ہے۔ علما میں بھی وہ صلاحیتیں اور جسمانی طاقتیں نہیں ہیں، اُس درجے کا اخلاص و تقویٰ بھی باقی نہیں رہا، لیکن اللہ کو یہ دین قائم رکھنا ہے، ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ ہر زمانے میں اُمت کے اندر ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی جو ان مسائل کا اسلامی حل اُمت کے سامنے پیش کرتی رہیں گی۔

اس وقت پانچ بڑے بڑے میدان ہیں جن میں کام کی ضرورت ہے۔

(۱) ایک فکری اور فلسفی میدان ہے۔ جب یونانی فلسفہ ترجمہ ہو کر مسلمانوں کے پاس آیا، چونکہ وہ مادی فلسفے اور بے دینی نظریات کو لے کر آیا تھا۔ اس لیے علمائے اسلام نے اس فلسفے کو سیکھا اور اس کے طرز استدلال میں مہارت پیدا کی، اور پھر اسی طرز استدلال سے انھی کے ہتھیار کو اس ملحدانہ فلسفے کو توڑنے کے لیے استعمال کیا۔

ہمارے بزرگوں نے یہ ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اسی قسم کا ایک چیلنج آج بھی فلسفے کے رُخ سے آیا ہے، اور اس کے تحت جو فکری گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں، ان سب کی جڑ آپ دیکھیں

گے کہ مادی فلسفہ ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس سے ہمارے عقائد پر حملہ ہو رہا ہے یہ علمائے اسلام مسلمان دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ جدید مغربی فلسفے نے جو نئے سوالات اور نئے شبہات اسلامی عقائد میں پیدا کیے ہیں ان کا جواب دیں، لہٰذا اس فلسفے کو سیکھنا، اس میں مہارت پیدا کرنا اور انھی کے استدلال کے ہتھیار سے ان کے فلسفے کو چکنا چور کر کے اسلامی عقائد اور نظریات کو ثابت کرنا ہے۔۔

(۲) دوسرا میدان معاشی میدان ہے اور یہ انگلستان کے صنعتی انقلاب کے بعد تیزی سے بڑھا ہے، اور اسی معاشی میدان میں دو بڑے نظریات اور دو بڑے بڑے نظام دنیاکے سامنے آئے ہیں جن کو دنیا نے دیکھا اور پرکھا ہے، ایک سرمایہ دارانہ نظام، اور اُس کی ضد سوشلزم نظام۔

دنیا میں اس وقت جو مختلف معاشی نظام رائج ہیں ان میں یہ دو نظام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) جس کو عربی میں "الرأسمالیۃ" کہتے ہیں، اور دوسرا اشتراکی نظام (Socialism) جس کو عربی میں "الاشتراکیۃ" کہتے ہیں، اسی کی انتہائی صورت اشتمالیت (Communism) ہے جسے عربی میں "الشیوعیۃ" کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ کاروبار یا معاملات ہو رہے ہیں وہ انھی دو نظاموں کے ماتحت ہو رہے ہیں، سوویت یونین کے زوال کے بعد اگرچہ سوشلزم ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے تو ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی اس نظریے کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی ہے، لیکن ایک معاشی نظریہ کے اعتبار سے وہ دنیا کے معاشی نظریات میں اب بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

اہل اسلام کا فریضہ ہے کہ وہ یہ بتلائیں کہ سرمایہ داری نظام اور سوشلزم کے درمیان اسلام کا محاکمہ کیا ہے؟ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ معاشی نظام کا مسئلہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھا جا رہا ہے۔ اس نے فقہی میدان میں بے شمار سوالات پیدا کیے ہیں، اتنے پیچیدہ اور اتنے مشکل مسائل پیدا کیے ہیں کہ ان کے حل کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔

(۳) ایک میدان سیاست کا میدان ہے۔ سیاست میں نئے نئے نظریات سامنے آئے ہیں، نئے انداز حکومت سامنے آئے ہیں، نئے مسائل سامنے آئے ہیں، علمائے اسلام کی ذمہ داری ہے

کہ وہ اس میں اسلام کے موقف کو واضح کریں کہ کون سی سیاست، اسلامی سیاست ہے؟ اور کون سی سیاست ملحدانہ اور کافرانہ سیاست ہے؟ اور موجودہ سیاسی نظام جو جمہوریت کے نام پر یا مختلف ناموں پر چل رہے ہیں، ان میں اور اسلام میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟

(۴) ایک میدان طبّی میدان ہے۔ طب کے میدان میں نت نئی ایجادات نے انقلاب برپا کیا ہے، اور اس کی وجہ سے بے شمار فقہی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ تمام فقہا اور اہل فتویٰ کے لیے بلا شبہ وہ اس وقت کا چیلنج ہے۔ نئے نئے سوالات آرہے ہیں کہ فلاں کام جائز ہے یا ناجائز؟ فلاں طریقہ علاج جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۵) ایک میدان قانون کا میدان ہے، اور یہ میدان تو ایسا ہے کہ در حقیقت اس میدان کو سب سے پہلے سر کرنے والے مسلمان ہی ہیں۔ قانون کو فقہ کی صورت میں سب سے پہلے جس انداز میں منضبط اور مدون کیا گیا، اس سے پہلے کوئی نظیر تاریخ دنیا میں نہیں ملتی، لیکن اس کے بعد قانون ایک مستقل فن اور علم بنا اور یورپ ہی اب اس کا بھی امام بن گیا۔

یہ پانچ بڑے بڑے میدان ہیں۔ ایک جدید فلسفہ کی سمت سے آنے والے مسائل ہیں، دوسرے معاشی راستے سے آنے والے مسائل ہیں، تیسرے سیاست کے راستے سے آنے والے مسائل ہیں۔ چوتھے طب کے راستے سے آنے والے مسائل ہیں۔ پانچویں قانون کے راستے سے آنے والے مسائل ہیں۔ ضرورت ان پانچوں میدانوں میں کام کرنے کی ہے۔

الحمد للہ علمائے اسلام اور دانشورانِ ملت ان تمام میدانوں میں کام کر رہے ہیں لیکن جتنی رجالِ کار کی ضرورت ہے جتنا وقت لگانے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے وہ کم ہے۔

الغرض سیاسی اور معاشی نظام ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک سیاسی نظام مضبوط بنیادوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا ہے جب تک کسی ریاست کا معاشی نظام بہتر خطوط پر قائم نہ کیا جائے۔ اسی طرح نہ معاشی نظام نشو نما پا سکتا ہے جب تک سیاسی نظام اس کی حفاظت نہ کر رہا ہو۔ اس لیے معاشی نظام اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا میں مختلف سیاسی تحریکات نے جنم لیا ہے، ان تحریکات کے ساتھ معاشی نظام ضرور نظر آتا ہے کہ وہ کن خطوط پر معاشی نظام کو قائم کریں گے۔ عوام کی نظر بھی معاشی نظام پر ہوتی ہے کیونکہ معاشی نظام نے

ہی عوام کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے معاشی نظاموں سے اسلام کا ہی بتایا ہوا عدل اجتماعی بہتر ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہے، اسی نظام کے نفاذ میں ہی انسانوں کی فلاح مضمر ہے۔

سوال یہ ہے کہ تو پھر مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر کیوں نہیں۔ اس کا سادہ جواب یہی ہے کہ کسی بھی اسلامی ملک میں اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر معاشی نظام کی بنیاد ہے ہی نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ تقریباً تمام مسلم ممالک میں معاشی نظام کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام ہے تو غلط نہ ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی مغربی ممالک نے غور و فکر کے ساتھ سرمایہ داری نظام کے بد اثرات سے اپنے عوام کو کسی حد تک بچا لیا ہوا ہے جبکہ مسلم ممالک میں سرمایہ داری کے بد اثرات عوام پر پڑ رہے ہیں اور وہ خستہ حالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلمانوں کی پستی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔

چونکہ سیاسی نظام اور معاشی نظام لازم و ملزوم ہیں جب کسی ملک کا سیاسی نظام غلط بنیادوں پر قائم ہوگا، خاص طور پر جس ملک میں آمرانہ نظام ہوگا، تو وہاں معاشی نظام بھی اپنی بد صورت میں موجود ہوگا۔ وہاں لازمی طور پر معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوگا۔ ایک طبقہ مراعات یافتہ ہوگا جو ایک آمر کے سائے میں دولت کا بہاؤ اپنی طرف کرے گا۔ دوسرا محروم طبقہ جو ضروریاتِ زندگی کا محتاج ہوگا۔ جب کوئی ملک طبقاتی تقسیم میں بٹ جاتا ہے، تو اس کی تباہی دروازے پر دستک دے رہی ہوتی ہے۔ امریکہ کے تھنک ٹینک ایک تو اس بات پر غور و فکر کرتے ہیں کہ مسلم ممالک کو کس طرح طبقاتی تقسیم میں منقسم کیا جائے اور دوم کس طرح اسلامی ممالک کی دولت پر قبضہ جمایا جائے۔ غور کرکے دیکھ لیجیے کہ مسلمانوں کے مخالف مغربی ممالک کس طرح اپنی منصوبہ بندی میں کامیاب ہیں۔ اکثر مسلم ممالک کے سربراہ امریکہ کے مقرر کردہ ہیں۔ وہ امریکہ کے مفادات ہی کے محافظ ہیں۔ وہ آمر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں (ایک مخصوص اشرافیہ) کے تعاون کے ساتھ عوام کا خون چوس رہے ہیں اور ان کو تاریک وادی میں دھکیل رہے ہیں تاکہ وہ یاس کے اس نقطہ پر پہنچ جائیں جہاں قومی موت وارد ہو جاتی ہے۔ دوم نہایت ہی عمدہ منصوبہ بندی سے مسلم ممالک کی دولت (تیل) پر قابض ہو چکے ہیں یہی

دولت جو مسلمانوں کی خوش حالی کے لیے تھی، وہی دولت مغربی ممالک کی خوش حالی کا سبب بنی ہوئی ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کی خوش حالی کے لیے پہلی بات جو ضروری ہے وہ یہ کہ اپنے ممالک میں شورائیت قائم کریں، سربراہ مملکت عوام کا نمائندہ ہو کسی باہر کی طاقت کا متعین کردہ آمر نہ ہو۔ دوم جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا جائے۔ سوم قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں "العفو" پر عمل ہو تاکہ سرمایہ داری کے بد اثرات سے عوام محفوظ ہو جائیں۔ چہارم نظام زکوٰۃ کو اصلی روح کے ساتھ معاشرہ میں نافذ کیا جائے کیونکہ یہی تقسیم دولت کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب تک کوئی ملک معاشی لحاظ سے مضبوط نہیں وہ دفاعی لحاظ سے بھی مضبوط نہیں ہو سکتا اور اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کی ترقی کے لیے یہ لازم ہو گیا ہے کہ دور حاضر کے مسائل اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسلامی اصولوں پر اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کریں۔

ریاست مدینہ کا نظم و نسق

یہ ایک کثیر القبائل، کثیر المذہبی اور کثیر الثقافتی حکومت تھی جس میں بالادستی شریعت کو حاصل تھی۔ آخری قانون اللہ اور اس کے پیغمبر کا فرمان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بطور حاکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ تمام فریقوں کو داخلی خود مختاری بھی دی گئی اور سابقہ روایات کی اچھی چیزوں کو اس میں جگہ دی گئی۔ اسلام کا ایک مزاج جو مدینہ منورہ کے دور میں بہت نمایاں ہوا۔ وہ دوسری اقوام اور دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کی مثب اور تعمیری چیزوں کو اپنا لینے اور اپنے نظام میں سمو لینے کا ہے۔ مسند امام احمد کی روایت میں حضور نے فرمایا کہ یعمل فی الاسلام بفضائل الجاھلیة، کہ اسلام میں جاہلیت کے زمانہ کی تمام فضیلتوں اور اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا۔ اس لیے کسی بھی قوم، کسی بھی علاقہ یا کسی بھی زمانہ میں جو بھی اچھی چیز مروج ہے تو اس کو اسلامی نظام میں اختیار کر کے قبول کیا جائے گا اور کسی اچھی بات کو اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جائے گا کہ وہ کسی غیر اسلامی پس منظر سے آئی ہے۔

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں باقاعدہ نظم و نسق قائم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے نقبا کی تقرری کے کام کو مکمل فرمایا۔ اس دستاویز یا دستور کے بعد جب مدینہ منورہ کے داخلی نظم و نسق کے کام سے ذرا فرصت ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آس پاس کے قبائل پر توجہ دی اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے رابطوں کا آغاز فرمایا۔ اس غرض کے لیے مختلف قبائل میں بہت سی مہمات بھی بھیجی گئیں۔ پہلی مرتبہ جو دستہ بھیجا گیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے جنوب میں بنی ضمرہ کے قبیلہ میں بھیجا۔ وہاں ان گفتگوؤں اور مہمات کے نتیجہ میں ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ عہد نبوی کے وثائق کے مجموعوں میں دستیاب ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے شمال میں جہینہ قبیلہ کے پاس ایک دستہ بھیجا گیا۔ ان سے بھی دوستی کا معاہدہ ہوا اور وہ بھی اس بندوبست میں شامل ہو گئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو مدینہ منورہ کی بنیادی ریاست تھی جو معاہدہ کے شرکا پر مشتمل تھی۔

پھر مدینہ منورہ کے وہ آطام یا بستیاں تھیں جو معاہدہ میں تو شریک نہیں تھیں لیکن عملاً انھوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دائرہ آپ کہہ سکتے ہیں جو حضور نے مدینہ کے چاروں طرف ایک حلقہ اثر کی صورت میں قائم کیا۔ اس دائرہ میں مدینہ کے چاروں طرف بسنے والے قبائل کی دشمنیوں کو ختم کرنا اور ان کو اسلام کے حق میں مائل کرنا اور مسلمانوں سے دوستی کرنے کے لیے آمادہ کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے جنوب میں ان قبائل سے رابطے ہوئے جو مکہ مکرمہ کے راستہ میں تھے، بنو ضمرہ سے، پھر بنو جہینہ سے معاہدہ کیا گیا۔ پھر مزینہ کا قبیلہ جو بہت بڑا قبیلہ تھا اور مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد تھا ان سے معاہدہ کیا گیا۔ یہ سب معاہدات ہجرت کے بہت ابتدائی دنوں میں اور بہت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ان دوستانہ معاہدات سے مدینہ کے دفاع کو منظم کرنے اور مسلمانوں کو امن و سکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردم شماری بھی کروائی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ آپ نے فرمایا اکتبولی من تلفظ بالاسلام، میرے لیے ان تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کر دو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ گویا مسلمان باشندوں کی پہلی مردم شماری ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس کی تاریخ کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد اور دوسری مرتبہ بعد میں ممکن ہے یہ واقعہ دو مرتبہ ہوا ہو۔ ممکن ہے تین مرتبہ ہوا ہو، لیکن مدینہ منورہ آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردم شماری کرائی اور صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کا پہلی مرتبہ ریکارڈ مرتب کیا گیا۔

مدینہ منورہ میں سب سے پہلا انتظامی معاملہ جو حضور کے سامنے پیش تھا، وہ امن و امان کا مسئلہ تھا کہ ان متنوع قبائل کی موجودگی میں، جن میں لگ بھگ آدھے دشمن قبائل تھے، شروع میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، ان سب میں امن و امان کیسے قائم کیا جائے۔ خاص طور پر باہر سے آنے والے مسلمانوں کو سیکورٹی کیسے فراہم کی جائے۔ مدینہ منورہ میں

جرائم کے واقعات پہلے کثرت سے ہوتے رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد جرائم میں بہت کمی آگئی۔ لیکن پھر بھی قتل، چوری، بدکاری، شراب خوری اور ڈاکہ اور اغوا وغیرہ کے چیدہ چیدہ واقعات یہودی کرتے رہتے تھے۔ ایک ایک کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کا سد باب کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ میں پہرے کا انتظام بھی کیا۔ بعض افسران کا تقرر بھی کیا جن کو ہم پولیس افسران کہہ سکتے ہیں۔

تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری، جو ایک نمایاں انصاری سردار تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے امن و امان کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس طرح ان کو ہم مدینہ کا پہلا پولیس افسر کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مقرر کردہ کارندے ہوتے تھے جو شہر کے مختلف علاقوں اور قریب کے دیہاتوں میں جا کر امن و امان کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان علاقوں یں امن و امان کا فریضہ انجام دیتے تھے جہاں مسلمان آبادیاں زیادہ تھیں۔ جیسے جیسے مسلمان آبادیاں بڑھتی گئیں، امن و امان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غیر مسلم آبادیاں جیسے جیسے کم ہوتی چلی گئیں خاص طور پر تین بڑے یہودی قبائل کو نکالنے کے بعد جرائم میں بڑی نمایاں کمی آگئی۔ جرائم اور اس طرح کے واقعات کی بیشتر مثالیں ہجرت کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ بعد میں اس طرح کی مثالیں نسبتاً کم ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مدینہ منورہ کے مقامی نظم و نسق پر بھی توجہ دی۔ ٹاؤن پلاننگ کے بارے میں بعض ہدایات دیں۔ مدینہ منورہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تعمیرات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ مکرمہ سے آنے والے بہت سے حضرات نے وہاں زمینیں خریدیں اور اپنے مکانات بنائے۔ چھوٹے مکان بھی بنائے گئے، بڑے مکان بھی بنائے گئے اور بعض صورتوں میں یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ مکانات کے نقشے اس طرح سے بنائے جائیں کہ مدینہ منورہ کی آبادی کے لیے کسی مشکل کا ذریعہ نہ ہوں۔ چنانچہ گلیاں کیسے بنائی جائیں اور مکانوں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات جاری فرمائیں۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ گلی میں کم از کم سات ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ گلی میں ایک طرف کے مسکن اور دوسری طرف کے مکان کے درمیان فاصلہ کو ہاتھ کی لمبائی سے ناپا جاتا تھا۔ اگر ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ لمبا ہوتا ہے تو سات ہاتھ سے مرادی ہے کہ ساڑھے دس فٹ کے قریب چوڑی گلیاں ہونی چاہییں۔ ظاہر ہے اس زمانے میں گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ تانگے بھی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے۔ اس لیے اتنے فاصلہ میں دو سواریوں کا آسانی سے گزرنا ممکن ہے۔ اگر اس سے کوئی سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ گلیوں اور سڑکوں میں اتنا فاصلہ ہونا چاہیے کہ آمنے سامنے سے آنی والی دو گاڑیاں بیک وقت گزر سکیں۔

مہاجرین کی آمد کا سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا۔ ان کی آباد کاری بھی ہوتی رہی۔ اس مقصد کے لیے مکانات بنانے کی ضرورت بھی پیش آتی رہی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بڑی اور عالیشان عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ بعض صحابہ جو بڑے اصحاب ثروت میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ذرا بڑے مکان بانے کی خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، جو رشتہ میں حضور کے ماموں بھی ہوتے تھے، مکہ مکرمہ کے مالدار لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے ایک بڑا مکان بنانا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ جب ان کو حضور کی ناپسندیدگی کی اطلاع ملی تو انھوں نے مکان کا وہ حصہ گرادیا جس کو دیکھ کر حضور نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ شہر میں آبادی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ بہت سے لوگ جو شہر میں آکر بس گئے تھے ضروری مالی وسائل نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پاس اتنے امکانات نہیں تھے کہ بڑے بڑے مکانات تعمیر کر سکیں۔ اس لیے ان حالات میں اگر بڑی بڑی عمارتیں بنانے کی اجازت دے دی جاتی تو ایک ایسی روبہ ایسی مسابقت کے پیدا ہونے کا امکان تھا کہ دولت مند اور اہل ثروت لوگ بڑے بڑے مکانات بنانے لگیں اور مدینہ منورہ میں جگہ کی قلّت ہو جائے اور یوں اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کے لیے مکانات کی تعمیر مشکل ہو جائے۔ کشادہ اور آرام اور وہ مکان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی اور ایک

حدیث میں ایک مکان کی ضروریات کی نشاندہی بھی فرمائی کہ ایک مکان میں آدمی کے اپنے رہنے کے لیے کمرہ ہونا چاہیے۔ اس کے بچوں کے لیے کمرہ، مہمانوں کے لیے کمرہ، ملازموں اور خادم کے لیے کمرہ، اس کے علاوہ اگر غیر ضروری کمرے بنائے جائیں تو اس کو پسند نہیں فرمایا۔ گیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جو ناگزیر ضروریات ہیں ان کا بندوبست مکان میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ غیر ضروری طور پر بڑے بڑے مکان بنانا اور شان و شوکت کا اظہار کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔ ریاست مدینہ میں وزراء بھی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے آج کی طرح کی وزارتیں نہیں ہوتی تھیں کہ الگ الگ وزارت اور عملہ ہو۔ البتہ مختلف معاملات پر مشورہ لینے کے لیے اور ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے بعض صحابہ کرام متعین تھے۔ تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی حیثیت وزیر اول کی سی تھی۔ امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں سعید بن مسیب سے روایت کی ہے کہ کان ابو بکر من النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکان الوزیر، کہ حضرت ابو بکر کا درجہ حضور کی بارگاہ میں وہی تھا جو وزیر کا ہوتا ہے۔ فکان یشاورہ فی جمیع امورہ، ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے، ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقدم علیہ احدا، اور کسی کو بھی ان کے اوپر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر عطا فرماتا ہے اور برے حاکم کو برے وزیر عطا فرماتا ہے۔ جب کوئی حاکم اچھے کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو اس کی ٹیم میں شامل کر دیتا ہے اور جب برے کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو برے لوگوں کو اس کی وزارت میں شامل کر دیتا ہے۔

مختلف شعبے:

اس کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے انتظامات پر توجہ دی اور اس ننھی سی ریاست میں مختلف شعبے قائم فرمائے۔ ہم آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صیغہ خاص تھا۔ ایک توقیعات و فرامین اور دستاویزات کا شعبہ تھا۔ ایک شعبہ احتساب تھا۔ شعبہ داخلہ، شعبہ خارہ، شعبہ مالیات، شعبہ عساکر یعنی فوجی نظم و نسق، شعبہ تعلیم، یہ سارے شعبے ایک ایک کر کے قائم کر دیے گئے۔

سب سے پہلا اور ابتدائی کام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سربراہ ریاست کے طور پر کرنے کی ضرورت پیش آئی وہ شعبہ خارجہ کی تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دشمنوں کے اس سمندر میں کیسے محفوظ و مامون بنایا جائے۔ اس غرض کے لیے اس پاس کے قبائل سے روابط ناگزیر تھے۔ دستور مدینہ بھی ایک طرح سے مختلف قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات تھی۔ اس میں بھی خارجہ معاملات کا ایک عنصر موجود تھا۔ پھر جہینہ، ضمرہ اور زنہ کے ساتھ جو تعلقات اور معاہدے کیے گئے وہ بھی امور خارجہ کی پہلی کڑی یا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں حضور علیہ السلام کے سامنے تین مقاصد تھے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی کہیں توصراحت ملتی ہے اور کہیں ان معاہدات کے الفاظ سے ان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بنیادی ہدف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو فروغ دیا جائے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ چنانچہ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والوں معاہدوں میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کے داعیوں کا راستہ نہیں روکیں گے۔ مسلمان داعی اگر کہیں جارہے ہوں تو ان کو مہمان نوازی اور تحفظ فراہم کریں گے۔ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیں گے۔ اس کے عوض میں مسلمان ان کے ساتھ یہ اور یہ کریں گے۔

ان معاہدات کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب کے معاشرہ میں امن وامان قائم ہو۔ عدل وانصاف کو فروغ ہو اور تمام قبائل کو اس طرح سے ایک لڑی میں پرو یا جائے کہ وہ ان مشترکہ مقاصد کی خاطر عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پھر آخری مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کا ایک رعب اور دبدبہ عرب میں قائم ہو کہ کوئی دوسری قوت ان کی طرف میلی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ ریاست مدینہ کی خارجہ پالیسی کے یہ تین بنیادی اہداف تھے جن کے تحت معاہدات کیے گئے۔ اور اس طرح تبلیغ اسلام کو آسان بنایا گیا۔ اندرونی استحکام کو یقینی بنا گیا۔ انسانی جان کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا۔ دشمنوں پر معاشی دباؤ قائم رکھنے کے سامان کیے گئے۔ دشمن کے دوستوں سے دوستی کی کوشش کی گئی۔ دشمن کے دشمنوں سے دوستی مزید بہتر بنائی گئی۔ دشمن کے اطراف میں اپنے دوستوں کی ایک ڈھال بنائی

گئی۔ یعنی خیبر کے یہودیوں کے اطراف میں بھی اور قریش مکہ کے اطراف میں بھی بسنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدے کیے گئے۔ دشمن قبیلوں کے درمیان اگر کوئی اتحاد تھا تو اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ معزز دشمنوں کا احترام کر کے ان کا دل جیتنے کی کوشش کی گئی۔

تالیف قلب ریاست کے شعبہ خارجہ کی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تالیف قلب کے طور پر بہت سے اقدامات کیے گئے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط کا سامنا کرنا پڑا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے بڑی تعداد میں کھجوریں اور جو کی کمیت بھیجی اور کہلا بھیجا کہ ہماری طرف سے یہ سامان خورد نوش مکہ کے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اس طرح کے اقدامات وقتاً فوقتاً کیے گئے۔ یہ صیغہ خارجہ تھا جس میں بنیادی ذمہ داری سیدنا عمر فاروق کی تھی۔ ان کا قبیلہ مکہ مکرمہ میں بھی شہری ریاست میں امور خارجہ اور سفات کا ذمہ دار تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مہمات بھیجیں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں بہت کثرت سے مہمات بھیجی گئیں۔ مدینہ منورہ کے چاروں طرف حتیٰ کہ مکہ مکرمہ کے قریب کے رہنے والے بعض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدات کیے گئے۔ اسی اثنا میں حضور نے سفیر بھی بھیجے۔ بعض سفیروں کے نام لیتے ہیں۔ ایک سفیر جن کو کئی مواقع پر حضور نے بھیجا اور اس زمانے کی سب سے بڑی ریاست کے حکمران کے پاس بھیجا وہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی تھے۔ بنی کلب سے آپ کا تعلق تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور با اثر قبیلہ تھا۔

ان کے بارے میں ایک بات تمام سیرت نگاروں نے لکھی ہے کہ صحابہ کرام میں ان سے زیادہ خوبصورت آدمی کوئی نہیں تھا۔ جب وہ قیصر روم کے پاس دمشق پہنچے اور بتایا گیا کہ عرب سے ایک بہت خوبصورت سفیر آیا ہے تو تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں میں اس خوبصورت نوجوان کو دیکھنے کے لیے کھڑی تھیں، جو عرب سے پیغمبر عربی کا خط لے کر آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قیصر روم کے دربار میں بھی بھیجا تھا۔

جب کبھی جبرئیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں آتے تھے۔ کئی مرتبہ صحابہ کرام نے بیان کیا کہ ہم نے دحیہ کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور ابعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ریاست سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ حضور کے بتانے سے لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ جبرئیل امین تھے جو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں کئی بار حضور کے پاس آئے۔

بقیہ سفیروں میں حضرت عمرو ابن امیہ الضمریؓ کا ذکر ہو چکا ہے جو نجاشی کے دربار میں نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے ہی اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ آئے ان کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ مختلف حکمرانوں کے پاس جب حضور کا سفیر جایا کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ مکتوب الیہ کے لیے کوئی ہدیہ بھی دیتے تھے۔ باہر سے کوئی سفیر آیا کرتا تو اس کو بھی ہدیہ دیا کرتے تھے۔ حضور کی طرف سے سفراء کو ہدیہ دیا جانا اتنا طے شدہ طریقہ کار تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستر مرگ پر تھے اور دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اجیزوا الوفود کما کنت اجیزھم، جیسے میں مختلف وفود کو انعامات دیا کرتا تھا تم بھی انعامات دیتے رہنا اور ہر آنے والے سفیر کو کوئی نہ کوئی انعام دے کر بھیجنا۔

سیرت کی روشنی میں مدینہ کی ریاست کے قیام کا پس منظر

یہ حقیقت ہے کہ نبی دنیا کا طالب نہیں ہوتا لیکن پھر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں ایک ریاست، حکومت اور اقتدار قائم کرنا پڑا۔ دنیاوی اقتدار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے اور اس کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکومت قائم کرتے ہیں اور ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تاثر پیدا ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان اور منفرد کارنامے کو محض ایک ریاست کا قیام، محض دنیاوی معاملات کی تکمیل، محض انتظامی نظم و نسق کی بہتری اور فراہمی سمجھ لیا جائے۔

جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ منور تشریف لے گئے جہاں آپ نے ایک ریاست قائم فرمائی۔ شریعت کے تفصیلی احکام نافذ فرمائے۔ معاشرتی، تمدنی، عائلی اور دیگر اصلاحات نافذ فرمائیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مغربی مستشرقین میں سے بہت سوں کو یہ سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے کہ ایک پیغمبر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے خاص طور پر عیسائی حضرات پیغمبری کے جس تصور سے مانوس ہیں وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا زہد و استغناء ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دنیا سے بیزاری اور ترک دنیا کا رجحان ہے۔ ان کے تصور میں رہبانیت، ترک دنیا اور دنیا کے تمام معاملات سے لاتعلق رہنا ہی نبوت کی شان ہے۔ اس لیے ان میں سے بہت سوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک نبی اور پیغمبر ریاست کیسے قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے معتدل سے معتدل ترین لوگوں نے بھی اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا۔ منٹگمری واٹ، انگریز مستشرق جو بہت معتدل مشہور ہیں۔ انھوں نے (Muhammad at Mecca) محمد مکہ میں اور (Muhammad at Madina) محمد مدینہ میں کے نام سے دو بہت مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے بین السطور میں ہر جگہ یہ بات نمایاں ہے کہ مکہ میں تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز ایک نبی کا تھا، لیکن مدینہ میں آپ کے مزاج، انداز اور پیغام میں تبدیلی آئی اور وہاں جا کر آپ ایک بادشاہ اور حکمران بن گئے۔

یہ اعتراض یا شبہ ایک تو اسلام کے مزاج اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی خاتمیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض زاہدوں، اور مستغنیوں کی تربیت کے لیے تشریف نہیں لائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تارک الدنیا لوگوں کی فوج بنانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ آپ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃٌ کی جامعیت پیدا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ أنا نَبِیُّ الۡمَلۡحَمَۃِ أَنَا نَبِیُّ الۡمَرۡحَمَۃِ، میں جہاں رحمت کا نبی ہوں وہاں میں جنگ کا نبی بھی ہوں۔ ایک اور موقع پر فرمایا "أَنَا الضَّحُوۡكُ الۡقَتَّالُ" میں جہاں انسانوں کے لیے مسکراہٹیں بکھیرنے کے لیے آیا ہو وہاں بدکرداروں اور ظالموں کے لیے شمشیر براں بھی ہوں اور مجھے ان کے ساتھ جنگ کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں پہلے دن ہی سے دونوں چیزیں جمع تھیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر الزمان، خاتم الرسل، دانائے سبل ہیں۔ آپ کا اصل مقصد اور ہدف جس کی خاطر آپ کو دنیا میں بھیجا گیا وہ قرآن مجید میں فرائض چہارگانہ کی صورت میں بیان کر دیا گیا۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ، یعنی قرآن مجید کی آیات تلاوت کرکے لوگوں تک پہنچانا، وَ یُزَکِّیۡہِمۡ، لوگوں کی اعتقادی، اخلاقی، روحانی اور اندرونی اصلاح کرنا یعنی تزکیہ نفس، وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ، کتاب اللہ کے اسرار و رموز کی تعلیم دینا اور اس کی بنیاد پر اللہ کی وحی کی روشنی میں جو دانائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، جس کے سرچشمے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے جاری ہوئے، ان کی تعلیم انسانیت کو دینا۔ یہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی ذمہ داری۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا، کسی اور شریعت کو نازل نہیں ہونا تھا، کسی اور کتاب کا نزول مقدر میں نہیں تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو جامع اور کامل اسوہ حسنہ بنایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں افراد اور عام انسانوں کے لیے نمونہ ہیں، وہاں آپ کی ذات مبارکہ حکمرانوں کے لیے، فرمانرواؤں،

فاتحین، جرنیلوں اور سربراہان مملکت کے لیے بھی نمونہ ہے۔ اس لیے اللہ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں نبوت اور حکمرانی دونوں کی صفات جمع فرمائی جائیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبدیلی فرمائی، جو انسانی تاریخ کی اتنی ہمی گیر تبدیلی ہے جس کی مثال دنیا کی مدون تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ تبدیلی جس نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تربیت سے اصلاح پذیر نہ ہوا ہو اور اس کے اثرات اور ثمرات اور اس کے آثار و برکات اس نے قبول نہ کیے ہوں۔ اس ساری تبدیلی کے تحفظ کے لیے، اسلام کے تمدن کی بقا کو یقینی بنانے اور اسلامی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ریاست ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ریاست اور حکومت اسلام کا مقصد نہیں بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کی منزل نہیں، نشان منزل ہے۔ اسی ضرورت کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ریاست قائم فرمائی جو ہمیشہ کے لیے تمام ریاستوں کے لیے اسی طرح کا نمونہ ہے اور نمونہ رہے گی جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہر انسان کے لیے نمونہ ہے۔ اس ریاست نے جو قوانین نافذ کیے وہ تمام قوانین کا سرچشمہ ہیں اور تمام قوانین کے لیے معیار اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کفار کو دعوت دے رہے تھے تو آپ نے بارہا یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لینے والے عرب و عجم کے حکمران بن سکتے ہیں۔ حتی کہ بہت ابتدائی دور میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم جناب ابوطالب زندہ تھے اور کفار مکہ کی طرف سے ابھی دشمنی اور مخالفت میں بہت شدت پیدا نہیں ہوئی تھی تو کفار مکہ نے چاہا کہ ابوطالب کے ذریعے مصالحت کی کوئی شکل نکل آئے اور افہام و تفہیم کی کوئی ایسی فضا بن جائے جس میں یہ کشیدگی اور یہ شدت ختم ہو جائے۔ ابوطالب نے اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ مجھے اس سے زیادہ خوشی اور کس بات سے ہو سکتی ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے اور کفار مکہ کے بڑے بڑے

نمائندہ سردار بھی آ گئے۔ ابو طالب نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ کوئی بات کہنے آئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چچا! آپ جو بات پسند کرتے ہیں میں ااس کے لیے تیار ہوں، آپ حکم فرمائیں۔ اس پر مکہ کے سرداروں نے اپنی بات کہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ بہت اہم ہے۔ غور کرنے کی بات ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان سے صرف ایک ایسے کلمہ پر ایمان لانے کی بات کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ اس کو مان لیں تو پورے عرب ان کے ماتحت ہو جائیں گے اور تمام عجم ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ یعنی عرب و عجم کی فرمانروائی اور برتری ان کو حاصل ہو جائے گی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ایک دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ مکہ سے باہر شاید ہی کوئی اسلام کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ کے آخری دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے وفود سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر جب حج کے موقع پر حضور دین کی دعوت دینے مختلف قبائل کی قیام گاہوں پر تشریف لے جا رہے تھے۔ تو اس موقع پر ہر قبیلہ سے آپ فرماتے تھے کہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لو تو عرب اور عجم دونوں تمھارے زیر نگیں ہو جائیں گے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے ارشادات یہ بات واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام کے مزاج اور پیغام میں پہلے دن سے ہی یہ عنصر موجود تھا، بلکہ وہ عناصر موجود تھے جن میں زندگی کی مکمل تبدیلی، نظام معاشرت کی مکمل اصلاح، فرد اور معاشرہ کے ساتھ ساتھ حکومت کی مکمل اصلاح اایک پروگرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد ایک نیا اور اجنبی عنصر اسلام کی تعلیم میں شامل ہو گیا جو مکی دور میں شامل نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

لیکن اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا خاندان اور آپ کی ذات گرامی ایک ایسا بین الاقوامی مزاج اور کردار رکھتے تھے کہ جو عرب میں بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدا امجد جناب قصی جنھوں نے مکہ مکرمہ کی شہری ریاست

قائم کی ان کے ذاتی تعلقات اپنے زمانے کے کئی حکمرانوں سے قائم تھے۔ ان کا بچپن اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ شام میں گزرا تھا۔ وہ وہاں کے حالات و معاملات سے اچھی طرح واقف تھے۔ غالباً شام میں طویل سکونت کی بنا پر ہی ان کو قیصر روم کے دربار میں بھی تعارف حاصل تھا۔ ان کے تعلقات یمن کے حکمرانوں سے بھی تھے۔ قصی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قریش کی تجارت کو مختلف علاقوں میں منظّم اور مرتب کیا اور ان کی انھی کوششوں اور تعلقات کی وجہ سے قریش کا تعارف بقیہ دنیا کے بہت سے حصوں میں ہوا۔ جناب قصی کو جب مکہ مکرمہ پر قبضہ بحال کرکے وہاں کا نظام بحال کرنے اور امن وامان قائم کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے ایک باقاعدہ شہری ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس ریاست کو قائم کرنے میں جناب قصی کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔ انھوں نے قبیلہ خزاعہ سے جو کعبہ کی تولیت پر عرصہ سے زبردستی اور ناجائز طور پر قابض تھا، جنگ کی اور کعبہ کے انتظام سے ان کو بزور بے دخل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جناب قصی کی اس مہم میں قیصر روم نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

جناب قصی کی قائم کردہ اس شہری ریاست کا تذکرہ مغربی مصنفین نہیں کرتے۔ مغربی مصنفین جب سٹی اسٹیٹ کی بات کرتے ہیں تو صرف یونان یا زیادہ سے زیادہ روما کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ مغربی مصنفین مکہ کی شہری ریاست کا ذکر نہیں کرتے لیکن کسی کے تذکرہ نہ کرنے سے تاریخ کے حقائق نہیں بدل سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ کی شہری ریاست کئی سو سال تک قائم رہی۔

اس ریاست میں قصی نے پہلے دس شعبے قائم کیے اور ان کو قریش کے دس قبائل میں تقسیم کیا۔ پھر وقت کے ساتھ مزید شعبے قائم ہوتے گئے جو مختلف قبائل میں تقسیم کیے جاتے رہے۔ یوں کل اکیس عہدے قائم ہوئے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ پیدائشی اور خاندانی طور پر اس عہدے کا حامل بھی ہوتا تھا، جو اس خاص قبیلے کا عہدہ تھا۔ جناب صدیق اکبرؓ کے خاندان میں عدالتی ذمہ داری تھی اور خاص طور پر یہ ذمہ داری کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جائے یا زخمی کر دیا جائے تو اس کی دیت یا تاوان ادا کرنے کا معاملہ۔ ایسے تمام مقدمات کا فیصلہ جناب صدیق اکبر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں سفارت کا عہدہ تھا۔ آپ کہہ سکتا ہیں کہ

وزارت خارجہ کا عہدہ۔ دوسرے قبائل سے معاملہ اور گفتگو کے لیے جب قریش کی نمائندگی کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت عمر فاروقؓ یا ان کے خاندان کے بزرگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اسی طرح سے مختلف خاندانوں میں مختلف عہدے قائم تھے۔ بنی عبد الدار جو عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا وہ بیت اللہ کا متولی تھا اور بیت اللہ کی چابی بنی عبد الدار کے سربراہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ جناب قصی کا قائم کردہ یہ عہدہ آج تک قائم ہے۔ آج بھی بنو عبد الدار ہی کے ایک سردار کے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ اور حجاز کا کوئی بھی چھوٹا یا بڑا حکمران آج تک اس خاندان سے بیت اللہ کی چابی واپس لینے کی ہمت نہیں کرسکا۔

یہ بات محض تاریخی اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک اور تصور بھی ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منور تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں بھی ایک شہری ریاست قائم فرمائی۔ آپ کی قائم کردہ یہ نئی شہری ریاست مدینہ دراصل مکہ مکرمہ کی ایک جلاوطن حکومت تھی جو مدینہ منور میں قائم کی گئی۔ اس لیے کہ آپ نے انھی صحابہ کرام کو وہی عہدے وہاں بھی دیے جو مکہ مکرمہ میں ان کے خاندانوں کو حاصل تھے۔ قاضی کا منصب حضرت ابو بکر صدیقؓ کو حاصل تھا۔ بیرونی سفارت کی ذمہ داری حضرت عمر فاروقؓ کو کئی مرتبہ سونپی گئی۔ بقیہ معاملات میں جہاں جہاں متعلقہ قبائل سے اگر صحابہ موجود تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ ذمہ داریاں انھوں ے ہی انجام دیں۔

جناب قصی کے بعد ان کے جانشینوں میں سب سے نامور اور غیر معمولی شخصیت جناب ہاشم بن عبد مناف کی تھی۔ جلد ہی انھوں نے ریاست مکہ کے سربراہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وہ بڑی مشہور اور بین الاقوامی شخصیت تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کے والد تھے۔ جناب ہاشم اس اعتبار سے بڑے نمایاں ہیں کہ نہ صرف عرب کے قبائل میں بہت معتبر تھے بلکہ قیصر روم کے دربار میں براہ راست شناسائی رکھتے تھے۔ قیصر روم ان کی شخصیت سے متاثر تھا۔ جب وہ تجارت کا قافلہ لے کر شام جاتے اور قیصر روم شام میں ہوتا تو وہ ملاقات

کے لیے جناب ہاشم کو بلایا کرتا اور روایت میں آتا ہے کئی مرتبہ بعض معاملات میں ان کی ذہانت اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے ان کی رائے بھی لی۔ جناب ہاشم نے قریش کے قبیلہ کے لیے روم کی سلطنت سے بہت سی مراعات حاصل کیں۔ یمن میں ایرانیوں کی جو کالونیاں تھیں، وہاں سے بھی قریش کے لیے رعایتیں حاصل کیں۔ اس طرح آس پاس کی دوسری ریاستوں مثلاً حبشہ سے مراعات حاصل کیں۔ یہ تمام مراعات اور سہولتیں قبیلہ قریش کو جناب ہاشم کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔ پہلی مرتبہ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک صاحب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ یہ صاحب سوید بن صامت تھے جو مدینہ میں اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کی وجہ سے الکامل کی وجہ سے مشہور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ انھوں نے توجہ سے بات سنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں دلچسپی لی۔ ان کے پاس حکمت لقمان کے کچھ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا میرے پاس بھی اس طرح کی چیز ہے جو آپ بیان فرمارہے ہیں۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول تو نہیں کیا لیکن مخالفت بھی نہیں کی۔ اس کے بعد سوید بن صامت کا انتقال ہو گیا۔ سیرت نگاروں میں اس پر بحث ہوتی رہی کہ سوید بن صامت اسلام قبول کر چکے تھے یا نہیں۔ اور کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے یا نہیں۔

اس کے بعد اگلے سال مدینہ منور کا ایک اور گروہ مکہ مکرمہ حج کرنے کے لیے آیا۔ یہ قبیلہ اوس کی ایک شاخ بنو عبد الاشہل کے کچھ لوگ تھے۔ یہ قریش مکہ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتے تھے جس کے مطابق خزرج کے ساتھ لڑائی میں قریش مکہ اوس قبیلہ کا ساتھ دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بھی بات کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ انھوں نے بہت غور سے آپ کی بات سنی۔ اخلاق سے پیش آئے۔ اور کہا کہ ہم اس وقت تو ایک اور کام کے لیے آئے ہیں، اس لیے اس موقع پر ہم کسی اور کام پر توجہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قبول نہیں کی۔

اہل مدینہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا باقاعدہ رابطہ اس وقت ہوا جب آئندہ سال یعنی غالباً سنہ گیارہ نبوت میں مدینہ منورہ سے آنے والے چھ حجاج کرام کے ساتھ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی۔ چھ کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا اور مدینہ چلے گئے۔ بعض لوگوں نے اس کو پہلی بیعت عقبہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے حضرات نے اس کو بیعت قرار نہیں دیا کیونکہ اس موقعہ پر کسی باقاعدہ بیعت کا ذکر نہیں ملتا۔ کسی سیرت نگار نے ان حضرات کی بیعت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ان حضرات نے واپس جا کر مدینہ منور میں دعوت اور تبلیغ کا کام کیا۔ اگلے سال جب یثرب کے لوگ حج کے لیے آئے تو بارہ حضرات کا ایک باقاعدہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان بارہ میں سے پانچ حضرات تو پچھلے سال والے تھے اور سات افراد نئے تھے۔ ان بارہ افراد نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ بیعت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی مبلغ کو بھیجیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان کا تعلق بھی بنی عبد الدار سے تھا۔ انھوں نے مدینہ جاکر اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔ ان کی تبلیغ بہت موثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔ جلد ہی مدینہ منور کے ہر گھر، خاندان اور برادری میں اسلام کا نام اور چرچا پھیل گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ مسلمان بھی ہو گئے۔ اس کے اگلے سال ۷۲ افراد اسلام قبول کرنے کے ارادے سے بقیہ حجاج کے ساتھ آئے۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ بیعت کی اور عقبہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کیں۔ عقبہ وہ جگہ ہے جب آپ منیٰ سے مکہ مکرمہ کی طرف آئیں تو دائیں طرف ایک بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی شکل دیوار کی سی ہے۔ اس کے اندر ایک راستہ جاتا ہے جہاں ایک مسجد ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں یہ ملاقاتیں ہوئیں۔

یہ بات بڑی دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان ملاقاتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب بھی موجود تھے۔ اس لیے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ بہت ابتدا میں اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور مشورہ ہی سے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، ان کی رائے کی اس سے

تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مدینہ کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ کو ہمارے ساتھ جانے کی ہدایت دیں اور خود بھی مدینہ تشریف لے آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہجرت کرکے مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ صحابہ ایک ایک کرکے مدینہ منورہ جانے لگے۔ یہ جو معاہدہ ہوا، جس میں باقاعدہ بیعت بھی ہوئی اس کو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بیعت بیعت حرب کہلاتی ہے۔ پہلی بیعت النساء کہلاتی ہے۔ بیعت النساء کے لفظی معنی تو ہیں عورتوں کی بیعت۔ لیکن عورتوں کی بیعت سے مراد بیعت کے وہ الفاظ ہیں جو سورۃ ممتحنہ میں آئے ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ خواتین سے بیعت کریں تو فلاں فلاں چیزوں کی بیعت لیں۔ خواتین چونکہ میدان جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ نہ ان سے یہ وعدہ لینا مناسب تھا کہ وہ میدان جنگ میں جا کر لڑیں۔ اس وجہ سے ان سے جنگ میں حصہ لینے کی بیعت نہیں لی جاتی تھی۔ اس لیے جنگ کے علاوہ اور چیزوں کی بیعت کو بیعت نساء کہا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلی بیعت کو بیعت نساء کے نام سے یاد کیا گیا۔

دوسری بیعت میں انصار مدینہ نے یہ وعدہ کیا کہ ہم آپ کا دفاع بھی کریں گے۔ آپ کے لیے لڑیں گے۔ جو آپ پر حملہ آور ہوگا اس کو ہم اپنے اوپر حملہ آور سمجھیں گے اور آپ کے ساتھ ہر سرد و گرم میں مل کر رہیں گے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر چیز میں ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ جب یہ بیعت ہو گئی تو بعض انصاری صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں مکہ فتح کر دے تو آپ واپس مکہ چلے جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟ انھوں نے مناسب انداز میں یہ سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا۔ جواب میں آپ مسکرائے اور فرمایا: میرا خون تمھارا خون، تمھارا خون میرا خون، تمھاری صلح میری اور میری صلح تمھاری صلح۔ اب تمھارے ساتھ مرنا جینا ہوگا۔ جس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

آج سیاست و ریاست کے سیاق و سباق میں سوشل کنٹریکٹ کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ روسو کے زمانے سے ہو رہی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یورپ میں کوئی ریاست کسی باقاعدہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر قائم ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کوئی تاریخی ثبوت ایسا نہی ہے کہ کسی حکمران کے ساتھ ریاست کے قیام سے پہلے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو اور اس معاہدہ کے نتیجہ میں کوئی ریاست قائم ہوئی ہو۔ یورپ کے برعکس یہاں تمام سیرت نگار اور مورخین متفق ہیں کہ دو مرتبہ معاہدہ ہوا۔ ۷۲ آدمی جو نہ صرف اپنے اپنے قبائل کے نمائندہ تھے بلکہ اتنے نمایاں افراد تھے کہ پہلے سے وہاں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے قبیلہ کی طرف سے معاہدہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق فرمائی اور اس کے نتیجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جو ایک آزادانہ سوشل کنٹریکٹ کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔

مدینہ کی ریاست اور بقیہ ریاستوں میں ایک دوسرا بڑا اہم فرق یہ ہے کہ جب ریاست بنتی ہے تو اس کو چلانے کے لیے قانون کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا ریاست مقصد ہے اور قانون اس کو چلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں اس کے برعکس ہے۔ یہاں ایک قانون الٰہی نازل ہو رہا تھا۔ ایک شریعت دی جا رہی تھی۔ اس شریعت کے بعض احکام مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکے تھے۔ اس شریعت کے نفاذ اور تحفظ کے لیے ریاست کی ضرورت تھی۔ یہاں قانون اصل چیز تھی اور ریاست ذریعہ تھی۔ لہٰذا شریعت اصل مقصود ہے اور ریاست اس کا ذریعہ ہے۔ اسلام میں ریاست مقصود نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست حصول مقصد کا ایک اہم اور ضروری وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں ریاست کا درجہ بعد میں ہے۔ شریعت کا درجہ پہلے ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو بیعت عقبہ تھی اور جس میں ریاست کی بنیاد رکھی گئی یہ اسلامی ریاست کا روز آغاز تھی۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۳ نبوت کو یا اس کے فوراً بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اگر ریاست مدینہ کے آغاز کی تاریخ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچنے سے پہلے شمار کی جائے تو وہ

نبوت کے گیارہویں سال ذی الحجہ کی تیرہویں تاریخ ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے شمار کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس معاہدہ کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ ریاست مدینہ کا سربراہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اسلامی قوانین پر چلنے کا عہد و پیمان ہو چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ کارندے وہاں ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔ اس لیے ریاست تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام جانا شروع ہو گئے، جو صحابی وہاں پہنچتے گئے انھوں نے وہاں ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۱ ذی الحجہ سن ۱۳ نبوی کو مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سربراہ کے طور پر بعد میں وہاں تشریف لے گئے۔

مدینہ میں ریاست کے قیام کا طریقہ کار

مدینہ منورہ جانے سے پہلے جو بیعت ہوئی اس کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک سیاسی اور ریاستی بندوبست کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ انصار مدینہ نے طے کیا کہ ہم ہر معاملہ میں آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، یعنی سمع و طاعت۔ آپ کے ارشادات قانون کا درجہ رکھیں گے اور ہم ان کی پیروی کریں گے۔ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اپنی ذمہ داری انجام دیں گے۔ آپ کے احکام کو بجالانے میں ہم اپنی قوت استعمال کریں گے، جو حق کا معاملہ ہوگا اس میں صرف حق کی پیروی کریں گے اور کسی قبائلی عصبیت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ حق کے معاملہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے خوف نہیں کھائیں گے۔

معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ میں ایک چھوٹی سی کامن ویلتھ قائم ہو گئی۔ کامن ویلتھ اس لیے کہ یہ ایک قبائلی معاشرہ تھا، ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائلی یونٹوں کو ختم نہیں کیا، بلکہ ہر قبیلہ میں عریف اور نقیب مقرر فرمائے تاکہ اس قبیلہ کی طرف سے بات کر سکیں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے نمائندے بھی مقرر فرمائے۔ اس طرح سے الگ الگ یونٹ قائم ہو گئے۔ ان یونٹوں کے باہمی اتحاد سے ایک ایسی دولت مشترکہ وجود میں آ گئی جو داخلی طور پر خود مختار یونٹوں پر مشتمل تھی۔

یہ جزیرہ نمائے عرب کے وسیع سلسلہ ریگستان میں واقع ایک چھوٹا سا نخلستان تھا، حجاز اور تہامہ جو مغربی عرب کے دو بڑے صوبے ہیں، قریش کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ عموماً پہاڑی اور ریگستانی علاقے پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں میں جابجا چھوٹے چھوٹے نخلستان پائے جاتے ہیں۔ ان میں نسبتاً ایک بڑا نخلستان ہو تھا جس کو مدینۃ النبی اور دارالہجرت ہونے کا لازوال شرف حاصل تھا۔ یہ نخلستان ایک ایسے خطہ میں واقع ہیں جہاں ایک طویل زمانے تک ایک بہت بڑے لاوے کی چٹانیں پھٹتی رہتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے کچھ

سال پہلے، غالباً دس یا بارہ سال پہلے بھی لاوے کی چٹانیں پھٹنے کے اثرات آج چودہ سو چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی مدینہ منورہ جانے والوں کو نظر آتے ہیں۔ یہ لاوے کی چٹانیں وہ ہے جس کو عربی میں "لابہ" کہا جاتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے قرب وجوار کو حرم قرار دیا تھا، اسی طرح میں مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم مدینہ کی حدود مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ " ما بین لابتی المدینہ" یعنی میں مدینہ کے دونوں لابوں کے درمیان سرزمین کو مقدس اور محترم قرار دیتا ہوں۔ یہ لابہ کب پھٹا تھا یا کب سے پھٹنا شروع ہوا تھا، اس بارے میں بہت سے مؤرخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

علامہ سمہودی نے " وفاء الوفاء" میں لاوے کے بارے میں خاصی معلومات دی ہیں، اس لاوے کے پھٹنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے قرب وجوار کی زرخیزی میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی سرزمین کے اندر سے معدنیات نکال کر مدینہ منورہ کی سرزمین پر ڈال دیں جس سے وہاں کی پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی، اور آج تک عرب کی سرزمین میں مدینہ کی زرخیزی ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

یہ علاقہ جس کے رقبہ اور وسعت کے بارے میں میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا، اس کی لمبائی تقریباً بارہ سے چودہ میل تک اور چوڑائی آٹھ سے دس میل تک ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل تھا جن کی تعداد بیس بائیس بتائی جاتی ہے۔ ہر بستی میں چھوٹے چھوٹے قلعے یا گڑھیاں موجود تھیں جن کا تذکرہ مدینہ منورہ کے تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے کیا ہے۔

ان قلعوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے آثار اب بھی مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ خاص طور سے کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مدینہ منورہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر اب بھی موجود ہیں، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آطام کی نوعیت کیا تھی۔ یہ آطام جن کے اندر بستی کا سربراہ بھی رہتا تھا، قبیلہ کے اور ذمہ دار بھی رہتے تھے۔، ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا، بعض صورتوں میں اگر اُطم بڑا ہوتا تھا تو پورا قبیلہ اس میں رہتا تھا۔ اس کے باہر کی سرزمین جو اکثر و بیشتر بگات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی، وہ اس قبیلہ یا اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی

تھی۔ اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا، ضرورت کی چیزیں محفوظ کرنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں جو اس رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں، بعد میں ان سب کا نام مدینۃ النبی قرار پایا۔ تاہم یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں ایک گاؤں یثرب کہلاتا تھا۔ یثرب جغرافیائی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور آبادی لے لحاظ سے بڑا بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج مدینہ کہلائے جانے والے پورے علاقہ کو اس دور کی عام بول چال میں یثرب کہا جاتا تھا۔

الغرض جس شہر کو مدینہ منور کا نام دیا گیا یہ کوئی ایک شہر نہیں تھا۔ بلکہ یہ بہت سی بستیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا رقبہ تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ غالبا درست ہوگا کہ وہ موجودہ اسلام آباد کے رقبہ تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ غالبا درست ہوگا کہ وہ موجودہ اسلام آباد کے رقبہ کے برابر تھا۔ اس کا طول تقریبًا تیرہ چودہ یا شاید پندرہ میل کے قریب تھا۔ عرض دس بارہ میل کے درمیان تھا۔ تمام سیرت نگاروں نے اس کی شمالی اور جنوبی حد جبل احد اور جبل عیر کو قرار دیا ہے۔ جبل احد اور جبل عیر کے درمیان شمالاً جنوباً یہ حد ہے اور شرقاً غرباً بھی دس بارہ میل کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں یہ سارے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔ ان کے لیے آطام کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ یہ قلعے اس نوعیت کے جس کو اردو میں گڑھی کہتے ہیں۔ گڑھی سے مراد ایک ایسی بڑی حویلی ہے جو دفاعی طور پر مضبوط بنائی گئی ہو۔ جس کے اندر ایک سے زائد خاندان رہتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ بھی وہاں رہتا ہو، اس کے باہر ان کی زمینیں ہوں جس پر وہ کاشت کرتے ہوں۔ کچھ لوگ باہر زمینوں پر رہتے تھے۔ کچھ لوگ اطم یعنی گڑھی میں رہا کرتے تھے۔ اس طرح کے تقریباً 72 آطام مدینہ منور کے قرب وجوار میں موجود تھے۔ اس وقت بھی بعض آطام (قلعوں) کے اثرات مدینہ منور میں موجود ہیں۔ اگر آپ وہاں تشریف لے جائیں تو کعب بن اشرف کے اطم کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مسجد نبوی سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔ خود شہر مدینہ کے اندر بھی بعض آطام کے آثار موجود ہیں۔ اس طرح بعض باغات ابھی تک موجود ہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا باغ ہے جو ایک قبیلہ کی ملکیت ہے۔ اس باغ کے درمیان میں یا اس کے ایک

طرف بڑی حویلی قائم ہے جس میں وہ سارا قبیلہ یا خاندان رہتا تھا،ان کے اندر بستی اور قبیلہ کا سربراہ اور قبیلہ کے دیگر ذمہ دار بھی رہتے تھے۔ یہ ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا، اس کے باہر قبیلے کی سرزمین جو اکثر و بیشتر باغات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی وہ اس قبیلہ اور اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی تھی، اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھااور ضرورت کی دیگر چیزیں بھی محفوظ کرنے کا انتظام اس میں ہوتا تھا۔ اس پورے رقبہ میں ان اطام کے علاوہ بارہ پندرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں کا نام یثرب تھااور جو نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی اس پورے علاقہ کو یثرب بھی کہا جاتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں وہ بھی تھا جس میں آج مسجد نبوی موجود ہے۔ یہ گاؤں بنو مالک بن نجار کی ملکیت تھی۔ وہاں ایک خالی جگہ دو یتیموں کی ملکیت تھی جو حضور نے معاوضہ دے کر خرید لی اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس پورے علاقہ کا نام مدینۃ النبی یا مدینہ قرار پایا۔

مدینہ منور میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بلکہ باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک ریاستی نظم و نسق قائم کیا گیا ہے۔ اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ اور ابتلا کی روایت ختم ہو گئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔ ہجرت سے کچھ عرصہ قبل ایک جنگ شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی۔ کئی سال جاری رہی اور اوس اور خزرج کے قبائل آپس میں شمشیر آزما ہوئے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی۔ اسی جنگ سے مایوس ہو کر اور اس سے پریشان ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دے رکھی تھی کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کی تجویز کے مطابق وہ منتخب سربراہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول تھا جو بعد میں منافقین کا سردار کہلایا۔ اس کی مشترکہ سرداری یا بادشاہی کا معاملہ باقاعدہ طے تو کیا ہوا تھا لیکن تجویز زیر غور تھی۔ بعض لوگ متفق

تھے اور بعض نہیں۔ یقیناً عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے رفقا کی یہ کوشش ہوگی کہ تجویز پر عمل ہو جائے۔ اسی اثنا میں ہجرت کا واقعہ پیش آگیا اور جتنے انصاری صحابہ یعنی اوسی اور خزرجی تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے لیے سوچی جا رہی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ہی مدینہ منورہ کا داخلی نظم و نسق طے فرمادیا تھا۔ جو مہاجرین تھے وہ مختلف انصاری خاندانوں کے ساتھ ان کے خاندانوں کے فرد قرار پائے۔ انصاری خاندانوں میں بارہ نقیب پہلے ہی مقرر کر دے گئے تھے۔ سعد بن عبادہ خزرج قبیلے کے نقیب النقباء کہلائے۔ جو بقیہ نقباء منتخب کے گئے اور جن کو ان کے قبیلوں نے پہلے ہی منتخب کیا تھا وہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو پہلے سے ہی اپنی اپنی قوم میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت براء بن معرور کے بارے میں ابن ہشام کی روایت ہے کہ ان کے بارہ میں لوگوں نے کہا کہ ھو سیدنا و شریفنا و ابن سیدنا و ابن شریفنا، وہ ہمارے سردار بھی ہیں، با عزت آدمی ہیں، ہمارے سردار کے بیٹے ہیں اور شریف آدمی کے بیٹے ہیں۔ اس طرح سے جب یہ سارا مقامی بندوبست مکمل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے آپ نے تین کام کیے۔(۱) مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ اس سے پہلے قبا میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی تھی۔(۲) اس کے بعد آپ نے مواخاۃ کا عمل مکمل فرمایا۔ جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کو مدینہ کے خاندانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ مواخاۃ دراصل ایک قدیم عرب ادارہ کے احیا کا ایک نیا انداز تھا۔ یہ ولاء کے

نام سے عرب میں رائج تھا۔ اسلام کے بعد بھی رائج رہا۔ ولاء سے مراد یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر چاہے تو اپنے قبیلے سے تعلق ختم کر کے کسی دوسرے قبیلہ سے تعلق جوڑ سکتا تھا۔ اگر دوسرا قبیلہ قبول کر لے تو وہ شخص پھر اس دوسرے قبیلہ کا فرد بن جاتا تھا۔ اس کو ولاء کا تعلق کہا جاتا تھا۔ جو شخص اس طرح کا تعلق قائم کرتا تھا اس کو مولیٰ الموالات کہلاتا تھا۔ یعنی وہ شخص جو ولاء کے ذریعے مولا بنا ہو۔ مولیٰ کے معنی دوست، تعلق رکھنے والا، مدد کرنے والا، مدد کی توقع رکھنے والا، یہ سب معنی مولیٰ کے لفظ کے ہیں۔

(۳) تیسرا کام حضور نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مؤرخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام ابو داؤدؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور مؤرخین میں کئی افراد نے اس کے لیے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للانصار والمهاجرين یا بین الانصار والمهاجرين۔ کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں کتاب کا لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لولا کتاب من اللہ سبق لمسكم فيما اخذتم عذاب اليم، اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ آچکا ہوتا، کلا ان الكتاب الابرار لفی علیین کلا ان كتاب الفجار لفی سجين۔ لہٰذا کتاب کا لفظ قرآن پاک میں جہاں کہاں بھی کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور مفہوم میں آیا ہے اس سے مراد فیصلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے بات کی اور چارٹر کی تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں سے ابتدائی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت انسؓ کی گھر میں ہوئی تھی۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابت بیان کرتے ہیں

کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا گھٹنا اور حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ معاہدہ لکھا جارہا تھا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پوری کوشش اور جدوجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو۔ اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے، جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو۔ دنیا سے بدامنی و فساد دور ہو تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔

اسلامی ریاست کے فرائض

قرآن کریم نے انبیاء کرامؑ کے مبعوث کیے جانے کا بنیادی مقصد اقامت دین کو قرار دیا ہے:

"اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو، اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔" (الشوریٰ ۴۲)

انبیائے کرامؑ کی سنت خاتم النبیین ﷺ کی اقامت دین کی جدوجہد کی شکل میں اپنے نقطہ کمال کو پہنچی اور قرآن کریم نے اسوہ رسولؐ کی پیروی امت مسلمہ پر لازم کرتے ہوئے یہ طے فرمادیا کہ جس طرح رسول رحمتؐ نے حق کی شہادت دیتے ہوئے اقامت دین فرمائی، اسی طرح اب یہ کام امت پر اجتماعی اور انفرادی حیثیت میں فرض کر دیا گیا ہے:

"اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔" (البقرہ ۱۴۳)

دین کا جامع تصور اقامتِ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور حج کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ قیام عدل وقسط کے لیے اللہ کی شریعت کو نہ صرف اپنی ذاتی اور عائلی زندگی میں بلکہ اپنی معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی زندگی میں بھی قائم کریں چنانچہ اقامت دین کے دئرہ کار میں عبادات کے ساتھ ساتھ باہمی تعلقات، ثقافت و معیشت اور اقتدار و حکومت گویا زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی حاکمیت اور اس کی شریعت کی برتری یکساں اہمیت کے ساتھ شامل ہے۔

سیاسی جدوجہد اور حصولِ تمکین کے ذریعے نظامِ صلوٰۃ، نظام زکوٰۃ، نظام حیا اور نظام معروف کا قیام اور منکر، فواحش اور عدوان کا خاتمہ کرنا ان کے فرائض میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" (الحج ۴۱)

گویا فکر و عمل، معیشت اور سیاست میں قیادت کا حصول اقامت دین کی جدوجہد کا ایک جزو ہے، دین کے قیام کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح جناب نبی کریمؐ کے وفات کے بعد

جب ریاست مدینہ کی حکمرانی سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے سنبھالی تو انھوں نے اڑھائی سالہ مختصر دورِ حکومت میں تین بڑے اہم کام کیے۔

۱۔ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کرتے ہوئے اُس دور میں مدعیان نبوت کی سرکوبی کی تھی۔

۲۔ زکوٰۃ کے منکرین کا استیصال کر کے ایک دینی فریضہ کا تحفظ کیا تھا۔

۳۔ اور قرآن کریم کو سرکاری طور پر کتابی شکل میں محفوظ کر کے اللہ تعالیٰ کی عظیم اور آخری کتاب کی حفاظت کے بارے میں ذہنوں میں پیدا ہونے والے خدشات و خطرات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا۔

جس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ امت کے اسلامی عقائد کا تحفظ، دینی احکام و فرائض کی حفاظت اور اسلامی علوم کا تحفظ و فروغ ریاستِ مدینہ کی بنیاد تھی اور یہ تینوں کام اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل ہیں۔اسی طرح سیدنا عمر فاروقؓ بھی تاریخ کے مثالی حکمران گزرے ہیں۔انھوں نے ایک مثالی فلاحی ریاست قائم کی اور اس کے نظمِ اجتماعی کو منظم و مدون کرنے کے لیے شعارِ حکمرانی کو نئی جہتیں عطا کیں، جنھیں تاریخ میں ''اولیاتِ عمر'' کے نام سے یاد کر یا جاتا ہے،آپ کا ذہین ایجاد واختراع اور حکمرانی و قانون سازی کی خداداد نعمتوں سے مالا مال تھا۔وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فاتح اور سب سے بڑی ریاست کے حکمران تھے۔

ان کا ذہن ''عرفان حق'' کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، کئی ایسے مواقع آئے کہ انھوں نے وحی ربانی کے نزول سے پہلے ہی اس کے تقاضے کو سمجھ لیا، مفسرین کرام نے ایسی آیات مبارکہ کو ''موٴفقات عمر'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔آپؓ فرماتے ہیں: جب ہم حاکم بنے تو ہمیں معلوم ہوا کہ حاکم کیسا ہونا چاہیے اور جب ہم محکوم تھے تو ہمیں پتا چلا کہ رعیت کی فلاح کس میں ہے۔(الکامل للمبرد)

جہاں بانی اور حکمرانی کے لیے توفیق الٰہی سے انھوں نے جو ایجادات کیں اور جو نئی جہتیں متعارف کرائیں،ان کی طویل فہرست ہے،ان میں سے چند نمایاں امور یہ ہیں۔

مردم شماری کا نظام شروع کیا، نئے شہروں کی آباد کاری کی، آپؓ نے نظام حکومت کو منظم کرنے کے لیے بیت المال قائم کیا اور محکمہ مال کو منظم کیا، عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کیے، سن ہجری کو رائج کیا، فوج کا باقاعدہ دفتر قائم کیا اور فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، ان کے وظائف مقرر کیے، نہریں کھدوائیں، مفتوحہ ممالک کے لیے ذیلی نظم قائم کیا، جیل خانہ قائم کیا، پولیس کا محکمہ قائم کیا، محکمہ ڈاک کو منظم کیا، مسافروں کے لیے مہمان خانے قائم کیے، باجماعت نماز تراویح کا سلسلہ شروع کیا، مصحفِ مقدس کی صورت میں قران کریم آپ کے مشورے سے مدون ہوا، شراب کی حد (سزا) مقرر کی، مدرسین و معلمین اور ائمہ و موذنین کے لیے باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں، عاملینِ حکومت کے لیے کھلے عام احتساب کا نظام قائم کیا، رعایا کے مسائل حل کرنے کے لیے خود ان کے دروازوں تک چل کر گئے، دودھ پیتے بچوں، بیواؤں، معذوروں کے لیے وظائف مقرر کیے، یہ سب ایک اسلامی و فلاحی ریاست اور اسلامی حکمرانی کے فرائض و ذمہ داریاں۔

کچھ لوگوں کا یہ واویلا کہ ریاست کا ان معاملات میں کوئی کردار نہیں ہے، دراصل یہ ریاست مدینہ اور خلافتِ صدیق اکبرؓ و عمر فاروقؓ کے تصور کے ہی خلاف ہے۔

دینی قیادت کا المیہ

سماجی کی اصلاح، ریاست مدینہ کا احیا، عوام کی ایمان کی فکر، امت مسلمہ کی زبوں حالی اور ملک میں اسلامی نظام کے قیام، معاشرہ اور ملک سے سودی نظام کا خاتمہ، دین مدارس اور مذہبی قیادت کو اس کی کریڈٹ جاتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن افسوس کہ یہ فکر کسی یقینی حکمت عملی میں نہ ڈھل سکیں، اس کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ بندی اور اقدام نہیں کی جارہی ہے۔

پچھلے اٹھ دس سالوں سے ملکی سطح پر جو سیاسی و سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس میں دینی قیادت کے لیے عبرت کے ہزاروں سامان پوشیدہ ہیں مگر شرط یہ ہے کہ کوئی سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لینے کو تیار ہو۔ آج کی قیادت کا فکری ڈھانچہ ان خطوط پر استوار ہوا ہی نہیں جو حالات کا گہرا ادراک رکھتا ہو، وہ اخلاص، فکر اور مزاج ہی نہیں بن پایا جو اپنی جماعتی، ملکی اور عالمی حالات کا جائزہ لے کر مناسب حکمت عملی تشکیل دے سکے اور جو تھوڑا بہت ہو بھی رہا ہے وہ بھی وہی پرانی روایت یا عادت کے طور پر سماج اور حالات کی اصلاح اور امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے صرف اخلاص کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے حکمت عملی، جہد مسلسل اور بھرپور تیاری کے ساتھ، میدان عمل میں اترنا شرط اور ضروری ہے۔ "ہم صرف کوشش کے مکلف ہیں" کے فلسفے پر مبرا نہیں ہوسکتے۔

حال ہی کے انتخابات ہمارے سامنے ہیں۔ ہم اب بھی تقدسات اور ووٹ دو جنت لو کی بنیاد پر حکومت بناتے اور اسلام لاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تقدسات اور جنت کے نام پر کچھ ووٹ اور سیٹ لیے جاسکتے تھے لیکن اب دور بدل چکا ہے۔ آج کل لوگ ملک و قوم کے لیے کام کو دیکھتے ہیں۔ جبکہ ہماری مذہبی قیادت اور مذہبی جماعتوں کا رفاہی میدان میں کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہ کوئی جدید طرز کی یونیورسٹی، نہ ہسپتال اور نہ رفاہی ادارہ وغیرہ جس سے لوگ متاثر ہوں۔ بقول امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ انقلاب کے تین مراحل ہیں پہلے تعلیم پھر خدمت خلق تو پھر خلافت قائم ہوگئی۔ دینی قیادت سے میری مراد صرف مذہبی سیاسی جماعتیں نہیں بلکہ ملک بھر میں پھیلے اکثر ادارے، مدارس اور ذمہ داران مدارس، تبلیغی ودعوتی جماعتیں اور دین کی فکر رکھنے والے سب اس میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرف توجہ دلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ملتِ حنفیت
ولی اللٰہی اور سندھی نقطہ نظر

پس منظر:

آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق کی سر زمین اُر میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وقت ساری دنیا اللہ کو بھول چکی تھی اور قومی و بین الاقوامی سطح پر انسانیت دو لعنتوں اور شرکوں میں مبتلا تھی] :ا [انسانی الوہیت [۲] انسانی ربوبیت [شہنشاہیت]

اس وقت روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اپنے اصلی مالک، خالق اور حاکم کو پہچانتا ہو، اور صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرتا ہو۔ اگرچہ اس زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم یہی ابراہیم علیہ السلام کی قوم تھی۔ دنیاوی علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں ترقی کرلی تھی، لیکن دوسری طرف گمراہی میں بھی وہی سب سے آگے تھے۔ دنیاوی ترقی کے باوجود ان کو اتنی سی بات نہ سوجھتی تھی کہ مخلوق کبھی بھی معبود ہونے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ستاروں اور نیک ہستیوں کے مجسموں کی پرستش کرتے۔ نجوم، فال گیری، غیب گوئی، جادو ٹونے، تعویذ گنڈے اور طرح طرح کے توہمات کا ان میں خوب چرچا تھا جیسے کہ آج کل کے ہندوؤں اور جاہل مسلمانوں میں ہے۔ ان میں بھی مجاوروں اور پجاریوں کا ایک طبقہ موجود تھا جیسے ہمارے ہاں ہندوؤں کے پنڈت اور مسلمانوں میں درباروں کے مجاور اور پیر فقیر، جو مندروں اور درباروں کی حفاظت بھی کرتے، لوگوں کو پوجا بھی کراتے، شادی غمی وغیرہ کی رسمیں بھی ادا کرتے اور غیب کی خبریں بھی لوگوں کو بتانے کا ڈھونگ رچاتے تھے۔ تمام لوگ ان کے پھندے میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ انھی کو اپنی اچھی اور بری قسمت کا مالک سمجھتے تھے۔ انھی کے اشاروں پر چلتے تھے اور بے چوں وچرا ان کی خواہشات کی بندگی کرتے کیونکہ ان کا گمان تھا کہ دیوتاؤں اور ہمارے خداؤں کے ہاں ان پجاریوں کی پہنچ ہے، یہ چاہیں تو ہم پر دیوتاؤں کی عنایت ہوگی ورنہ ہم تباہ ہوجائیں گے۔ ان پجاریوں کے ساتھ بادشاہوں کی ملی بھگت تھی۔ عام لوگوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے میں بادشاہ پجاریوں کے مددگار تھے اور پجاری

بادشاہوں کے۔ایک طرف حکومت وقت ان پجاریوں کی پشت پناہی کرتی تھی اور دوسری طرف یہ پجاری، مجاور، پیر، فقیر حکومت کے ایجنٹ بن کر لوگوں کے عقیدے میں یہ بات بٹھاتے تھے کہ بادشاہ وقت بھی خداؤں میں سے ایک خدا ہوتا ہے۔ ملک و رعیت کا مالک ہے، اس کی زبان قانون ہے وہ جو بھی حکم صادر فرمائے تو دل و جان سے ماننا ہوگا، اس کی حاکمیت ہے اور اس کو رعایا کی جان و مال پر ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں۔ یہی دو چیزیں [انسانی الوہیت اور انسانی حاکمیت] ان کی گمراہی کی بنیادی اسباب تھے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام:

ایسے زمانے اور حالات میں ابراہیم علیہ السلام نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولی وہ خود پیروں اور پجاریوں کا گھرانا تھا۔ ان کے باپ دادا اپنی قوم کے پنڈت اور پیر تھے۔ اس گھر میں وہی تعلیم اور وہی تربیت ان کو مل سکتی تھی جو ایک پنڈت زادے اور پیر زادے کو ملا کرتی ہے۔ وہی گدی ابراہیم علیہ السلام کے لیے تیار تھی جو ایک پیر زادے اور گدی نشین کو وراثت میں ملتی ہے، جس پر بیٹھ کر وہ اپنی قوم کے پیشوا بن سکتے تھے۔ وہی نذر و نیاز اور چڑھاوے جن سے ان کا خاندان مستفید ہو رہا تھا ان کے لیے بھی حاضر تھے۔ اسی طرح لوگ ان کے سامنے بھی ہاتھ جوڑنے اور عقیدت سے سر جھکانے کے لیے موجود تھے۔ اسی طرح دیوتاؤں اور درباروں سے رشتہ ملا کر اور غیب گوئی کا ڈھونگ رچا کر وہ بے علم، جٹ، ادنی کسان اور مزدور سے لے کر بادشاہ، وزیر اور مشیر تک ہر ایک کو اپنی پیری کے پھندے میں پھنسا سکتے تھے۔ اسی اندھیرے میں جہاں کوئی ایک آدمی بھی حق کو جاننے اور ماننے والا موجود نہ تھا، نہ تو ان کو حق کی روشنی ہی کہیں سے مل سکتی تھی اور نہ کسی معمولی انسان کے بس کا یہ کام تھا کہ اس قدر زبردست ذاتی اور خاندانی فائدوں کو لات مار کر محض سچائی اور حق کے پیچھے دنیا بھر کی مصیبتیں مول لینے پر آمادہ ہو جاتا سوائے اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام کے۔ ہوش سنبھالتے ہی ان کا یہ ایمان تھا اور من جانب اللہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ یہ سورج، چاند اور تارے خود غلاموں کی طرح گردش کر رہے ہیں، اور یہ نیک ہستیوں کے پتھر کے بت اور مجسمے جن کو انسان خود اپنے ہاتھ سے بناتا اور تراشتا ہے اور یہ بادشاہ جو ہم ہی جیسے انسان ہیں، آخر یہ خدا، حاجت روا،

مشکل کشا اور حاکم اعلیٰ کیسے ہو سکتے ہیں جو بے چارے خود اپنے اختیار سے حرکت نہیں کر سکتے، جن میں آپ اپنی مدد کرنے کی قدرت نہیں، جو اپنی موت اور زیست کے بھی مختار نہیں، ان کے پاس کیا دھرا ہے کہ انسان ان کے آگے عبادت میں سر جھکائے، ان سے حاجتیں مانگے، ان کی طاقت سے خوف کھائے اور ان کی خدمت گاری و فرمانبرداری کرے۔ جب ان سب کا یہ حال ہے تو ان میں سے کوئی رب کیسے ہو سکتا ہے۔ جب ان میں سے کسی نے مجھے نہ پیدا کیا، نہ کسی کے ہاتھ میں میری موت و حیات ہیں اور نہ نفع و نقصان، نہ کسی کے ہاتھ میں رزق اور حاجت روائی کی کنجیاں، تو پھر میں ان کو رب کیوں مانوں اور کیوں ان کے آگے بندگی و اطاعت میں سر جھکاؤں؟ اور ساتھ یہ اعلان کیا!

''میں نے سب سے منہ موڑ کر صرف اسی ذات کو عبادت و بندگی کے لیے خاص کر لیا ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہر گز شرک کرنے والا نہیں ہوں''۔ [انعام آیت: ۹۷]

''ہم تم سے اور ان سے جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو، اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمھارے دین و پروگرام کے منکر ہیں اور ہمارے اور تمھارے درمیان دائمی عداوت اور بیزاری ظاہر ہو گی جو اس وقت تک قائم رہے گی جب تک تم اللہ واحد پر ایمان لا کر موحد نہ بن جاؤ''۔ [سورۃ الممتحنہ: ۴]

مصائب:

یہ اعلان کرنا کیا تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ باپ نے کہا میں عاق کر دوں گا اور گھر سے نکال باہر کروں گا۔ قوم نے کہا ہم میں سے کوئی تمھیں پناہ نہ دے گا۔ حکومت بھی ان کے پیچھے پڑ گئی اور بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ مگر وہ یک و تنہا انسان سب کے مقابلہ میں سچائی اور حق کے خاطر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باپ اور قوم کے باطل دین کے خلاف آواز حق بلند کی اور بادشاہ کے طاغوتی نظام کو للکارا۔ آخر کار شاہی دربار میں فیصلہ ہوا کہ اس شخص کو زندہ جلا ڈالا جائے۔ مگر وہ پہاڑ سے مضبوط دل رکھنے والا انسان اس ہولناک سزا کو بھگتنے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔

ہجرت:

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس کو آگ میں جلنے سے بچایا تو وہ اپنے گھر بار، عزیز و اقارب قوم اور وطن سب کو چھوڑ کر صرف اپنی بیوی اور ایک بھتیجے کو لے کر غریب الوطنی میں ملک ملک کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جس شخص کے لیے اپنے گھر میں وہ گدی موجود تھی جو اس پر بیٹھ کر اپنی قوم کا پیر بن سکتا تھا، دولت و عزت دونوں جس کے قدم چومنے کے لیے تیار تھیں اور جو اپنی اولاد کو بھی اس فائدہ مند گدی پر مزے لوٹنے کے لیے چھوڑ سکتا تھا، اس نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے جلا وطنی اور بے سر و سامانی کی زندگی پسند کی۔ کیونکہ دنیا کے جھوٹے خداؤں کے جال میں پھنس کر خود مزے کرنا اسے گوارا نہ تھا اور اس کے مقابلے یہ گوارا تھا کہ ایک سچے اللہ اور سچے دین کی طرف لوگوں کو بلائے اور اس جرم کی پاداش میں کہیں چین سے نہ بیٹھ سکے۔

وطن سے نکل کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام شام، فلسطین، مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے رہے۔ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ اسی مسافرت کی زندگی میں ان پر کیا گزری ہو گی، مال و زر کچھ ساتھ لے کر نہیں نکلے تھے اور باہر نکل کر اپنی روٹی کمانے کی فکر میں بھی نہیں پھر رہے تھے، بلکہ دن رات فکر تھی تو یہ کہ لوگوں کو ہر ایک کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کا بندہ بنائیں۔

اسی خیال کے آدمی کو جب اس کے اپنے باپ اور اپنی قوم نے برداشت نہ کیا تو اُسے اور کون برداشت کر سکتا تھا، کہاں اس کی آؤ بھگت ہو سکتی تھی؟ ہر جگہ وہی غیر اللہ کی دربار، مجاور، پیر، فقیر اور وہی خدائی کے مدعی بادشاہ موجود تھے اور ہر جگہ وہی جاہل عوام بستے تھے جو ان جھوٹے خداؤں کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان وہ مرد حنیف کہاں چین سے بیٹھ سکتا تھا جو نہ صرف خود ہی اللہ کے سوا کسی کی خدائی ماننے کے لیے تیار تھا بلکہ دوسروں سے بھی اعلانیہ کہتا پھرتا تھا کہ ایک اللہ کے سوا تمہارا کوئی مالک آقا، حاکم، حاجت روا مشکل کشا نہیں؟ سب کی آقائی و خداوندی کا تختہ الٹ دو اور صرف اس ایک کے بندے بن کر رہو۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کسی جگہ قرار نصیب نہ ہوا۔ سالہا سال بے

خانماں پھرتے رہے۔ کبھی کنعان کی بستیوں میں تو کبھی مصر میں اور کبھی عرب کے ریگستان میں۔اسی طرح ساری جوانی بیت گئی اور کالے بال سفید ہو گئے۔

اولاد:

آخیر عمر میں جب تقریباً 90 برس پورے ہونے والے تھے اور اولاد سے مایوسی ہو چکی تھی تو اللہ نے مہربانی فرما کر اولاد دی، لیکن اللہ کے اس جلیل القدر بندے کو اب بھی یہ فکر نہ ہوئی کہ خود خانماں برباد ہوا ہوں تو کم از کم اپنے بچوں ہی کو دنیا کمانے کے قابل بناؤں اور ان کی دنیاوی مستقبل کا فکر کروں اور انھیں کسی ایسے کام پر لگا جاؤں کہ روٹی کا سہارا مل جائے، نہیں، اسے بوڑھے عظیم مسلمان کو فکر تھی تو یہ کہ جس مشن کو پھیلانے میں خود اس نے اپنی عمر کھپا دی تھی، کاش کوئی ایسا ہو جو اس کے مرنے کے بعد بھی اسی مشن کو پھیلاتا رہے۔اسی غرض کے لیے وہ اللہ سے اولاد کا آرزو مند تھا اور جب اللہ نے اولاد دی تو اس نے یہی چاہا کہ اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے انھیں تیار کرے اور انھیں یہی وصیت کی

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ۔۔۔۔۔۔الخ

اور چونکہ ابتدائے نبوت جب اللہ تعالیٰ نے اسے کہا تھا [اَسْلِمْ] اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے سپرد کرو، میرا ہو کر رہو تو آپ نے جواب میں کہا تھا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [بقرہ:۱۳۱]

میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رب العالمین کا ہو گیا ہوں، میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے اس کے سپرد کر دیا ہے۔سیدنا ابراہیم علیہ السلام اسی قول و اقرار کو ایک سچے بندے کی طرح تمام عمر پوری پابندی کے ساتھ نباہ کر دکھا دیا۔اس نے رب العالمین کی خاطر صدیوں کے آبائی مذہب اور اس کی رسموں اور عقیدوں کو چھوڑا اور دنیا کے ان سارے فائدوں کو چھوڑا۔ اپنی جان کو آگ کے خطرے میں ڈالا، جلاوطنی کی مصیبتیں سہیں، ملک ملک کی خاک چھانی، اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ رب العالمین کی اطاعت اور اس کے دین کی تبلیغ میں صرف کر دیا اور بڑھاپے میں جب اولاد نصیب ہوئی تو اس کے لیے بھی یہی دین اور یہی کام پسند کیا۔

آخری آزمائش:

مگر ان آزمائشوں کے بعد ایک اور آخری آزمائش باقی رہ گئی تھی جس کے بغیر لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ آیا یہ شخص دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر رب العالمین سے محبت رکھتے ہیں؟ وہ آزمائش یہ تھی کہ اس بڑھاپے میں جبکہ پوری مایوسی کے بعد اسے اولاد نصیب ہوئی؟ اپنے اکلوتے بیٹے کو رب العالمین کی خاطر قربان کر سکتا ہے یا نہیں۔۔۔؟ چنانچہ یہ آزمائش بھی ڈالی گئی، اور جب اشارہ پاتے ہی وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تب فیصلہ ہوا کہ ہاں اب تم نے اپنے مسلم ہونے کے دعوے کو بالکل سچا کر دکھایا۔ اب تم اس کے اہل ہو کہ تمھیں ساری دنیا کا امام بنایا جائے۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا [بقرہ: ۱۲۴]

اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان میں پورا اتر گیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تجھ کو تمام انسانیت کا امام بناتا ہوں۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو امامت عالم پر سرفراز کیا گیا اور وہ اسلام کی عالمگیر اور بین الاقوامی تحریک کے لیڈر اور امام بن گئے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امامت عالم اور عالمی تحریک حنیفیت : ابوالانس سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک تقریباً جتنے انبیاء نے کام کیا، قوم کو دعوت دی اور معاشرہ میں انقلاب برپا کرنے کی جو محنت کی وہ کام اور دعوت و انقلاب، قومی سطح پر دین کا کام، دعوت اور قومی انقلاب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام، سیدنا ھود علیہ السلام، سیدنا صالح علیہ السلام، سیدنا شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا تو یا قوم، یا قوم کے الفاظ سے خطاب کرکے پکارا کیونکہ اُن کا دائرہ کار ہی قومی سطح کی تھی جبکہ دوسری طرف انسانی اجتماع [Society] کو ترقی دینے اور بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والوں میں جن بلند فکر اور عالی دماغ لوگوں نے حصہ لیا، ان میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بانی کی حیثیت اور خاص و بلند مقام حاصل ہے۔ آپ سے پہلے جن لوگوں نے انسانی اجتماعات کی رہنمائی کی، ان کا فکر اپنے مخصوص اجتماع (اپنی قوم) کی ترقی کو مرکز بنا کر کام کرتے رہے جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پہلے انسان اور پیغمبر ہیں جنھوں نے انسانیت عامہ کو

اپنے فکر کا محور بنایا اور بین الاقوامی سطح پر انقلاب لانے کی ابتدا کی۔ اس حیثیت سے آپ امام الناس یعنی نوع انسانی کے لیڈر اور پیشواء کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو حنیفیت کہتے ہیں، یہ دعوت کیا تھی؟ اس کو مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ علیہ السلام قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانیت کو دو لعنتوں سے بچانا چاہتے تھے جو آپ علیہ السلام کے زمانے تک پیدا ہو چکی تھیں۔

[۱] انسانی الوہیت (عبادت و بندگی)

[۲] انسانی ربوبیت (شہنشاہیت و انسانی حاکمیت)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی اجتماع [Society] میں بعض اوقات خیانت دار قسم کا علمی طبقہ عوام کو علم عامہ سے محروم کر دیتا ہے اور خود علم کا اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اس علمی اجارہ داری کے طفیل عوام پر خدائی کرتا ہے اور اپنی پیری اور تسلط جماتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان سرمایہ دارانہ علم کے محتاج بن کر علم اور روشنی سے دور رہ جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خائن علمی طبقہ عوام کو طرح طرح حیلوں بہانوں سے لوٹتے ہیں، تیسرا یہ کہ اس جہالت کی وجہ سے یہ پجاری، باطل پیر و باطل مذہبی رہنما عوام کو اپنی اور دیگر غیر اللہ کی عبادت و بندگی پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ سعادت اخروی اور اصلی دین پر غور کرنے کی استعداد بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی عبادت، بندگی، عاجزی، رکوع و سجود، قیام و قعود، نذر و نیاز، اللہ کے بجائے غیر اللہ کی ہو جاتی ہے اور ان کی جبین نیاز اوروں کے قدموں میں پڑتی ہے۔ یہ برہمنیت، پجاریت اور اسی قسم کی پیریت، انسانیت کے لیے بہت بڑی لعنت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام انسانیت کو اس انسانی الوہیت سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو ملکی سیاست پر قبضہ کر کے اپنی خاندان یا اپنی جماعت کے مفادات کو ترقی دینے والے اپنے خود ساختہ قوانین نافذ کرتے ہیں اور اسی طاقت کے بل بوتے پر اپنی رعایا سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں۔ یہ حالت بھی انسانیت کے لیے بہت بڑی لعنت ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اس کے بھی بہت مخالف اور اس طاغوتی قانون و نظام کے بہت بلند درجے کے باغی تھے۔

غرض اس عظیم فکر کے ذریعے ابراہیم علیہ السلام نے ایک طرف انسانی ربوبیت [شہنشاہیت، مطلق العنان بادشاہی] کا خاتمہ کر دیا تو دوسری طرف خدا شناسی کے علم کو عام کر کے برہمنیت کا اجارہ داری ختم کر کے انسانی الوہیت کا بھی خاتمہ کر دیا اور تمام انسانوں کو اللہ کی بندگی میں لا کر مساوات کے سٹیج پر لا کھڑا کر دیا۔ اس طرح انسان اور انسانیت کا پایہ انھوں نے بہت بلند کر دیا۔ اب ان کو اسی عالمگیر تحریک کی اشاعت کے لیے ایسے آدمیوں اور نائبوں کی ضرورت پیش آئی جو مختلف علاقوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں اور ان کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے کام کریں۔ لہٰذا اسی کام میں تین آدمی آپ علیہ السلام کے لیے قوت بازو ثابت ہوئے۔ ایک ان کے بھتیجے سیدنا لوط علیہ السلام جو آپ علیہ السلام نے مشرق اردن کے علاقے سدوم میں بٹھایا۔ اسی علاقے سے ایران، عراق اور مصر کے درمیان آنے جانے والے سب تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ یہاں بیٹھ کر اسی علاقے کے ساتھ ساتھ دور دراز کے علاقوں پر بھی اثر ڈالنا مقصود تھا اور وہ یہاں سے دونوں طرف تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا۔

دوسرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے سیدنا اسحاق علیہ السلام کو کنعان [فلسطین] کے علاقے میں آباد کیا۔ یہ علاقہ شام اور مصر کے درمیان واقع ہے اور سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں پر بھی یہاں اثر ڈالا جا سکتا تھا۔ یہیں سے سیدنا اسحاق علیہ السلام کے بیٹے سیدنا یعقوب علیہ السلام اور پوتے سیدنا یوسف علیہ السلام کی بدولت اسلام کی یہ عالمگیر تحریک مصر تک پہنچی۔

تیسرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک اور صاحبزادے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو حجاز میں مکہ کے مقام پر رکھا اور ایک مدت تک خود ان کے ساتھ رہ کر عرب کے تمام گوشوں میں اسی عالمگیر اسلامی تحریک کی تعلیم پھیلائی۔ پھر یہیں دونوں باپ بیٹے نے عالمگیر بین

الاقوامی اسلامی تحریک کا مرکز بھی تعمیر کیا جو کعبہ کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔

یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی جیسے سجدیں ہوا کرتی ہیں بلکہ اول روز ہی سے اس کو دین اسلام کی عالمگیر اور بین الاقوامی تحریک کا مرکز تبلیغ و اشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہاں ایک خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ ساتھ ایک اللہ کو ماننے والے ہر جگہ سے کھینچ کھینچ کر یہاں جمع ہوا کریں اور مل کر اللہ کی عبادت اجتماعی طریقے پر ادا کریں اور اسلام کی عالمگیر پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔اس بین الاقوامی مرکز میں اسلام کا عالمگیر اجتماع حج بھی اسی مقصد کے لیے یہاں ہوا کرتا ہے۔

بہر حال حکمت الٰہی کے تقاضے کے مطابق پہلے کنعان کی سرزمین سے اس عالمگیر فکر کی اشاعت و تبلیغ شروع ہوئی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے اس علم کو بلند کیا جن میں سیدنا یوسف علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جیسے الو العزم نبی و داعی پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل کو تورات جیسا بین الاقوامی قانون بھی عطا ہوا۔ لیکن بد قسمتی سے بعد کے لوگوں کی دنیا پرستی، اصل مقصد سے غفلت اور درکار محنت نہ ہونے کی وجہ سے وہ عالمی و بین الاقوامی تحریک قبائلیت و قومیت کی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکی اور اس انسانیت گیر تحریک کی جتنی اشاعت ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ الغرض اسرائیلی شاخ سے حنیفی [ابراہیمی] فکر کی جس قدر خدمت ہو سکتی تھی سو وہ ہو چکی اور ان میں اس فکر کو آگے بڑھانے کی مزید صلاحیت ظاہر نہ ہوئی تو حکمت الٰہی نے ابراہیمی نسل کی دوسری شاخ بنی اسماعیل سے جو عرب میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل کر رہے تھے، یہ خدمت لینی چاہی اور ان کی رہنمائی کی خاطر انھی میں سے بہترین انسان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کرکے ہدایت کا ذریعہ بنایا اور ان کو

اس عالمی اور بین الاقوامی تحریک اور پروگرام کی تکمیل کے لیے قرآن کریم جیسی عظیم کتاب اور قانون دی گئی جس میں انسانی انقلاب کا مکمل پروگرام موجود ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ۔ [نحل: ۱۲۳]

اس انقلابی اور عالمگیر پروگرام اور مشن کو آگے چلانے کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت مضبوط، جان نثار جماعت تیار کی جس کی نظر بین الاقوامی بلکہ انسانیت گیر تھی۔ اسی بین الاقوامی جماعت کی تنظیم نہایت مستحکم طبعی اصولوں پر کی گئی جو رہتی دنیا تک انقلاب کی تکمیل میں مدد دیتی رہے گی۔ اسی طرح جماعت بنا کر کام کرنے کا نتیجہ یہ رہا کہ اس پروگرام کو چلانے والی حکومت اور ایک اسلامی ریاست مدینہ میں وجود میں آگئی، جس نے انسانیت عامہ کی ترقی میں معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور روحانی پہلوؤں کو برابر اپنے سامنے رکھا۔ اور اس بین الاقوامی فکر، حنیفیت (براہیمیت) کو ساری دنیا میں اشاعت اور اقامت کا حق ادا کیا۔

قرآن اور اقامت دین

قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نعمت و دولت ہے انسانی زندگی کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی اور ان کو زندگی میں کامیابی کا راستہ دکھانے کے لیے عطا فرمائی ہے۔

یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے آپ اور ساری دنیا کو ہدایت پر لانے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن کی ہدایت، رہنمائی اور اقامت دین کے تین پہلو ہیں:

(1) خداشناسی:

سب سے اہم اور پہلا شناخت، اللہ تعالیٰ کی شناخت ہے کہ ہم اللہ کو پہنچان سکے، اس کی مرضی معلوم کر سکے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی ڈھال سکے۔ بس اللہ سے تعلق جوڑنا، اللہ تعالیٰ کی پہچان اور رضا حاصل کرنے کے لیے قرآن کا فہم حاصل کرنا نہایت اہم ہے۔
خداشناسی، اسلام کی بنیاد اور اسلام پر عمل پیدا ہونے کے لیے اصل سہارا اور قوت ہے۔

(2) خودشناسی:

دوسرا یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کیا ہے، کس لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسے انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے، یہ دیکھنا کہ ہمیں کیا کام اور کون سی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔
اس چیز کو قرآن نے ایک لفظ میں بیان کیا ہے اور وہ ہے استخلاف۔ اس لیے فرد کی اصلاح اور تزکیہ، کردار سازی کرنا، علم اور عمل کے اعتبار سے اس لائق بنانا کہ وہ زمین کے حقیقی خلیفہ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے۔

(3) خلق شناسی:

اس سے مراد انسانوں سے، معاشروں سے، اقوام سے اور کائنات کی ہر مخلوق سے قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق ربط و تعلق قائم کر کے معاملہ کرنا تاکہ دنیا عدل، امن اور احترامِ آدمیت کا گہوارا بن جائے۔

الغرض ان تینوں بنیادوں کو قرآن اور شریعت نے جامع اصطلاح ''اقامت دین'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

یہ قرآن دین کی اقامت چاہتا ہے، یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں کہ آرام سے مسند یا کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے سے سمجھ میں آئے گی۔ یہ نری مذہبی کتاب بھی نہیں کہ مدرسے اور خانقاہ میں صرف اس کے سارے رموز حل ہوں بلکہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس کو سمجھنے کے بعد قائم کرنا بھی ہے۔

یہ کتاب انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر، دینا کے مقابلے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے اجتماعی زندگی اور خلافت الہیہ کے قیام تک ۲۳ سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور ایک ایک منزل اور مرحلے پر تعمیر کے نقشے بتائے۔

فکری جنگ

وہ دور چلا گیا کہ دو بدو لڑائیاں ہوا کرتی تھیں، فوجیں میدان جنگ میں اترتیں اور لاشیں میدان میں گرتی۔ اب میدان کارزار کی بجائے ٹھنڈے کمزرو میں گھومتی کرسیوں کی پشت پر یہ معرکے ہوتے اور جیتے جاتے ہیں۔

اب تلوار سے تلوار نہیں ٹکراتی بلکہ افکار کا افکار سے تصادم ہوتا ہے اور ایک تہذیب کا دوسری تہذیب سے لڑائی ہے۔

دنیا گلوبل ویلج (عالمی گاؤں) بن گئی ہے، دور و نزدیک برابر ہو گئے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کو اس بات کا احساس ہوا کے اسلامی ممالک پر قبضہ ضروری ہے، لیکن نقصان یہ ہے کہ عوام پر کنٹرول برقرار رکھنا مشکل ہے۔ عوامی فلاح کے جیسا بھی عمدہ نظام دیا جائے پھر بھی وہاں کے لوگ ناخوش رہتے اور وقفے وقفے سے بغاوتیں اور شورشیں سر اٹھاتی رہتی ہے۔

ایسے حالات میں بہتر راستہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک پر براہ راست قبضہ کے بجائے وہاں کی معاشرت، رہن سہن اور اخلاق پر قبضہ کیا جائے اور ان پر فکری حملہ کیا جائے، اس حملے میں ملک کا کوئی بھی باشندہ نہیں بچ سکتا، اسلام کا نام لے کر بھی عملی زندگی میں دین کو نکال باہر کریں گے۔

اس فکری جنگ کے لیے بطور موثر ذریعہ میڈیا استعمال ہو رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور انٹر نیٹ کے ذریعے ہر لمحہ اسلام کو بدنام کرنے، اسلامی روایات کو ختم کرنے کی غرض سے زہر پھیلایا جارہا ہے۔ اس وقت 10 ہزار ویب سائٹس مختلف ناموں سے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے متحرک ہیں۔ ان میں اکثر کے نام اسلامی ہیں، جس سے اکثر نو مسلم یا دین سے دور برائے نام مسلمان دھوکہ کھا جاتا ہے۔ آج کے دور 20 فیصد جنگ میدان میں جبکہ 80 فیصد جنگ میڈیا کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔ اس جنگ کو میڈیا وار کہتے ہیں۔

اسلام کے خلاف یہ دس ہزار ویب سائٹس تقریباً دو ارب ڈالر سے بھی زیادہ سرمایہ خرچ کر کے بنائی گئیں ہیں بلکہ ان کے مقابلے میں اسلام کے دفاع کے لیے صرف 200 ویب سائٹس ہیں، جن کی لاگت چند لاکھ ڈالر سے زیادہ نہیں۔

اس فکری جنگ اور میڈیا وار کا نتیجہ ہے کہ اسلامی کلچر اور مشرقی اقدار کا جنازہ نکلتا جا رہا ہے کسی بھی سرکاری غیر سرکاری تقریب میں جا کر دیکھیں چھری کانٹا ہاتھ میں پکڑے دائیں ہاتھ سے کاٹے گا اور بائیں سے کھائے گا، 80 فیصد لوگ پانی گلاس بائیں ہاتھ میں پکڑ کر ایک ہی سانس میں پییں گے۔

ہمارے نوجوانوں کے کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں کڑے اور گلوں میں سونا، چاندی کی زنجیریں نظر آنے لگی ہیں۔ ان کے بالوں کا انداز اور داڑھی منڈانے کا اسٹائل کسی نہ کسی انڈین اداکار سے ضرور ملتا ہے۔

ہر فرد کے ہاتھ میں سمارٹ فون ہے، میڈیا اور خاص کر شوشل میڈیا اس جنگ کا بہت کارگر ہتھیار ہے۔ نوجوان نسل کا فکر، سوچ اور عقیدہ و نظریہ وہ بن رہا جو میڈیا چاہتا ہے۔ تمدن اور کلچر وہ عام ہوتی جا رہی ہے جو میڈیا پیش کرتی ہے۔ اس جنگ کا اصل مقصد اور ہدف ہی یہ ہے کہ مسلمان کو ذہنی اور شعوری طور پر مردہ کر کے اپنے سانچے میں ڈھل لینا ہی دشمنانِ اسلام کا اصل ہدف ہے۔

اس فکری جنگ کا آغاز فرانس کے بادشاہ لوئس نہم نے صلیبی جنگوں میں بار بار شکست کھا کر عسائیت کو جمع کر کے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کو شکست دینی ہے تو اسلحے سے جنگ نہ کرو، تلوار سے وہ تمہیں کئی بار شکست دے چکے ہیں، اب مسلمانوں کے عقیدے اور فکر سے جنگ لڑنا ہی کامیابی کا شاہ کلید ہے۔

یہ ہے یورپ کی طرف سے فکری جنگ کے باقاعدہ آغاز کا اعلان، جس میں وہ کامیاب ہو گئے اور مسلمان اس جنگ کے شکار ہو کر مغربی فکری ارتداد اور یورپی تہذیبی یلغار کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔

نیو ایئر نائٹ، کفار سے مشابہت

نیو ایئر کی تقریبات کا آغاز انیسویں صدی کے شروع سے برطانیہ میں ہوا اور پھر آہستہ آہستہ یورپ کے دیگر ممالک اور پھر ہمارے ہاں بھی رائج ہوا۔اس وقت امریکا میں نیو یارک سینٹر، لندن میں ٹرائی فالگراس کوائر اور جرمنی کے دار الحکومت برلن کے برائیڈن برگ گیٹ میں نیو ایئر کی بڑی بڑی تقریبات ہوتی ہیں۔ نیو یارک کی تقریب میں ایک لاکھ کے قریب نوجوان شرکت کرتے ہیں، ٹرائی فالگراس کوائر پر 60 ہزار افراد جمع ہوتے ہیں جبکہ برائیڈن گیٹ پر دنیا کی سب سے بڑی نیو ایئر نائٹ منائی جاتی ہے، اس میں 15 لاکھ جوڑے شرکت کرتے ہیں۔

31 دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب رات 12 بجے تمام روشنیاں گُل کر دی جاتی ہیں، آسمان پر آتش بازی ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد شراب کے نشے میں دُھت نوجوان برف پر رقص کرتے ہیں۔ یہ تقریبات دنیا بھر کے ٹیلی ویژن دکھاتے ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ تمام ممالک کے فائیو اسٹار ہوٹلوں اور فحاشی و عریانی کے مارے لوگ اپنے گھروں میں ان تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق صرف امریکا میں اس روز 171 ارب ڈالر کی شراب پی جاتی ہے۔ 600 ملین ڈالر کی آتش بازی ہوتی ہے اور نوجوان اربوں ڈالر رقص گاہوں میں اڑا دیتے ہیں۔

1980ء تک نیو ایئر کی تقریبات امریکا اور یورپ تک محدود تھیں لیکن 1980ء کی دہائی میں اس مرض نے آگے پھیلنا شروع کر دیا۔ یہ مشرق بعید آیا اور پھر یہ بر صغیر میں بھی جڑیں پکڑنے لگا۔ 1992ء میں کراچی کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پہلی "نیو ایئر نائٹ" منائی گئی اس تقریب میں کراچی کے تاجروں، زمینداروں اور اداکاروں نے شرکت کی۔ کڑے پہرے میں یہ تقریب منائی گئی جس میں شراب اور رقص کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ سال ہے اور آج 2014ء ہے۔ نیو ایئر پاکستان کے 140 بڑے شہروں میں منائی جاتی ہے جس میں ہزاروں اوباش نوجوان شریک ہوتے ہیں۔

نیو ایئر نائٹ کی تقریبات نے پوری دنیا کی ثقافت پر گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ اپنے ساتھ فحاشی، عریانی اور بے حجابی کے ایسے جراثیم لے کر آئیں جو آہستہ آہستہ نوجوان نسل کی اخلاقیات کو چاٹ رہے ہیں۔ جو انھیں آوارگی، بے حیائی اور جنسی بے راروی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے اندر جس جس فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ تقریب ہوتی ہے وہاں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آنے والے جوڑے کی شکل میں ہوں۔ اس تقریب میں کوئی تنہا شخص شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ بے حیائی کا پہلا قدم ہے۔

نیو ایئر نائٹ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس سے پوری دنیا اس وقت تنگ نظر آ رہی ہے، وہ پہلو حادثات ہیں، مثلاً 2003ء کے نیو ایئر پر پوری دنیا میں بے شمار حادثات ہوئے۔ برازیل کے شہر روڈی جنیر میں ایک بد نام زمانہ ساحل ہے جس کا نام ”کوپا کابانا (Co Paca Bana)“ بیچ ہے۔ یہ ساحل ساڑھے 4 کلو میٹر طویل ہے۔ اس ساحل پر پچھلے سال 15 لاکھ نوجوان جمع ہوئے، 12 بجے جب روشنیاں بجھیں اور آتش بازی شروع ہوئی تو وہاں ہلڑ مچ گیا، اس ہنگامے میں سینکڑوں نوجوان سمندر میں گر گئے، درجنوں لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی اور بیسیوں لوگ پیروں میں کچلے گئے۔

نیو ایئر نائٹ کا تیسرا پہلو جس کا تعلق خاص کر مسلمانوں کے ساتھ ہے وہ ہے نیو ایئر نائٹ منانے میں کفار کے ساتھ مشابہت۔ ہماری شریعت میں اپنے ماننے والوں کے لیے یہ اصول ہے کہ وہ عقیدہ، عمل، طرز زندگی، کردار و گفتار اور کلچر و رسم و رواج میں غیروں کے مشابہت سے باز رہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ ”جس نے کسی بھی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انھی میں سے ہوگا“۔ (ابو داؤد)

یہ نیو ایئر نائٹ کی تقریبات بے حیائی کی نئی رسم اور کفار سے مشابہت ہے۔ یہ تو نیو ایئر کا وہ ظاہری نقصان ہے جو پوری دنیا کو بھگتنا پڑ رہا ہے لیکن یہ حرکت ملکوں کی ثقافت، اخلاقیات اور معاشرت پر جو اثر مرتب کر رہی ہے اس نقصان کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر بالفرض نئے سال کا استقبال ہونا چاہیے تو نرم خوئی، شرافت اور محبت سے۔ دعاؤں، قربانیوں اور صدقوں سے۔ ذرا سوچیے! ہم جس سال کا آغاز ہی پٹاخوں، گانوں، موسیقی، رقص، شراب اور بے حیائی سے کر رہے ہیں وہ سال آخر تک ہمیں کیا دے گا؟ قدرت ہمیں اس کی شاخوں سے کیسے کیسے تحفے توڑ کر دے گی۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جس کا آج گزشتہ کل سے اچھا نہ رہا تو یہ اس کی ہلاکت ہے۔ اس حدیث کی رو سے ہمیں اپنے آنے والے کل اور آئندہ سال کے لیے سنجیدگی کے ساتھ سوچنا اور لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے۔

انگریزی کا محاورہ ہے: "جس چیز کا آغاز برا ہو اس کا انجام برا ہوتا ہے"۔

دوسرے معاملات میں تو معلوم نہیں یہ محاورہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے لیکن جہاں تک نیو ایئر نائٹ کا معاملہ ہے یہ محاورہ اس پر 100 فیصد صادق ہے۔ ہم اپنے نئے سال کا آغاز جس "گرم جوشی" سے کرتے ہیں اس کا اختتام بھی اسی گرم جوشی اور بے حیائی سے ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے جس معاشرے کا نوجوان بد اخلاق اور بے حیا ہو جاتا ہے وہ معاشرہ پیپ کا تالاب بن جاتا ہے جو کسی شخص کو تعفن تو دے سکتا ہے لیکن اسے خوشبو، امن اور سکون دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام اور ویلنٹائن ڈے

ویلنٹائن ڈے (یوم محبت) رومن بت پرستوں کے تہواروں میں سے ایک تہوار ہے جبکہ رومیوں کے یہاں بت پرستی سترہ صدیوں سے زیادہ مدت سے رائج تھی، اور یہ (تہوار) رومی بت پرستی کے مفہوم میں حب الٰہی سے عبارت ہے۔

اس بت پرست تہوار کے سلسلے میں رومیوں اور ان کے وارثین عیسائیوں کے یہاں بہت ساری داستانیں اور کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں۔

سینٹ ویلنٹائن نصرانی کنیسہ کے دو قدیم قربان ہونے والے اشخاص کا نام ہے اور ایک قول کے مطابق ایک ہی شخص تھا جو شہنشاہ ''کلاودیس'' کے سزا کی تاب نہ لا اس کا 269ء میں ہلاک ہو گیا۔ اور جس جگہ ہلاک ہوا اسی جگہ 350 میلادی میں بطور یادگار ایک کنیسہ تیار کر دیا گیا۔

جب رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی تو وہ اپنے اس سابقہ تہوار کو مناتے رہے لیکن انھوں نے اسے بت پرستی (محبت الٰہی) کے مفہوم سے نکال کر دوسرے مفہوم ''محبتِ شہداء'' میں تبدیل کر دیا، اور انھوں نے اس محبت وسلامتی کی دعوت دینے والے ''سینٹ ویلنٹائن'' کے نام کر دیا جسے وہ اپنی گمان کے مطابق اسے اس راستے میں شہید گردانتے ہیں اور اسے عاشقوں کی عید اور تہوار کا نام بھی دیتے ہیں، اور سینٹ ویلنٹائن کو عاشقوں کا سفارشی اور ان کا نگران شمار کرتے ہیں۔

اس تہوار کے سلسلے میں ان کے باطل اعتقادات میں سے یہ طریقہ بھی تھا کہ نوجوان اور شادی کی عمر میں پہنچنے والی لڑکیوں کے نام کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ کر ایک برتن میں ڈالتے اور اسے ٹیبل پر رکھ دیا جاتا، اور شادی کی رغبت رکھنے والے نوجوان لڑکوں کو دعوت دی جاتی کہ ان میں سے ہر شخص ایک پرچی کو نکالے، لہٰذا جس کا نام اس قرعہ میں نکلتا وہ اس لڑکی کی ایک سال تک خدمت کرتا اور وہ ایک دوسرے کے اخلاق کا تجربہ کرتے، پھر بعد میں شادی کر لیتے، یا پھر آئندہ سال اسی تہوار یوم محبت میں دوبارہ قرعہ اندازی کرتے، لیکن دین نصرانی کے

علماء اس رسم کے بہت زیادہ مخالف تھے، اور اسے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے اخلاق خراب کرنے کا سبب قرار دیتے، لہٰذا اٹلی جہاں پر اسے بہت شہرت حاصل تھی، اسے باطل و ناجائز قرار دیدیا گیا۔ پھر بعد میں اٹھارہ اور انیسویں صدی میں دوبارہ اس تہوار اور رسم کو زندہ کیا گیا، وہ اس طرح کہ بعض یوروپی ممالک میں ایک کتاب (ویلنٹائن کے نام) کی فروخت شروع ہوئی، جس میں عشق و محبت کے اشعار تھے، جسے عاشق قسم کے لوگ اپنی محبوبہ کو خطوط میں لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اس میں عشق و محبت کے خطوط لکھنے کے بارہ میں چند ایک تجاویز بھی درج تھے۔

اسی طرح اس تہوار کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ: "جب رومی بت پرستوں نے نصرانیت قبول کرلی، اور عیسائیت کے ظہور کے بعد اس میں داخل ہوگئے تو تیسری صدی میلادی میں رومانی بادشاہ "کلاودیس دوم" نے اپنی فوج کے لوگوں پر شادی کرنے کی پابندی لگادی کیونکہ وہ بیویوں اور بچوں کی وجہ سے جنگوں میں نہیں جاتے تھے۔

عیسائیوں کے ایک پادری سینٹ ولنٹائن نے اس فیصلہ کی مخالفت کرتے ہوئے چوری چھپے فوجیوں کی شادی کروانے کا اہتمام کیا، اور جب کلاودیس کو اس کا علم ہوا تو اس نے سینٹ ویلنٹائن کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا اور اسے پھانسی کی سزا دے دی، کہا جاتا ہے کہ قید کے دوران ہی سینٹ ویلنٹائن کو جیلر کی بیٹی سے محبت ہو گئی۔ یہ تعلق خفیہ تھی کیونکہ پادریوں اور راہبوں پر عیسائیوں کے نزدیک شادی کرنا اور محبت کے تعلقات قائم کرنا حرام ہیں۔

شہنشاہ نے اسے عیسائیت ترک کرکے رومی (بت پرستی) دین قبول کرنے کو کہا کہ اگر وہ عیسائیت ترک کردے تو اسے معاف کردیا جائے گا اور وہ اسے اپنا داماد بنانے کے ساتھ اپنے مقربین میں شامل کرلے گا جبکہ عیسائیوں نے اس کو نصرانیت پر قائم رہنے کی سفارش کی لیکن ویلنٹائن نے رومی دین اختیار کرنے سے انکار کردیا اور عیسائیت کو ترجیح دی اور اسی پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا، تو چودہ فروری 270ء کے دن اور پندرہ فروری کی رات اسے پھانسی دے دی گئی، اور اسی دن سے اسے "قدیس" یعنی پاکباز بشپ کا خطاب دے دیا گیا۔ اسی قصہ کو بعض مصادر نے

چند تبدیلی کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے: کہ پادری ویلنٹائن تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں رومانی بادشاہ "کلاودیس ثانی" کے زیر اہتمام رہتا تھا، کسی نافرمانی کی بنا پر بادشاہ نے پادری کو جیل کے حوالے کر دیا، جیل میں جیلر کے ایک چوکیدار کی لڑکی سے اس کی شناسائی ہو گئی اور وہ اس کا عاشق ہو گیا یہاں تک کہ اس لڑکی نے نصرانیت قبول کر لی اور اس کے ساتھ اس کے 46 رشتہ دار بھی نصرانی ہو گئے، وہ لڑکی ایک سرخ گلاب کا پھول لے کر اس ویلنٹائن کی زیارت کے لیے آتی تھی، جب بادشاہ نے یہ معاملہ دیکھا تو اسے پھانسی دینے کا حکم صادر کر دیا، پادری کو جب یہ پتہ چلا تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ اس کا آخری لحات اس کی معشوقہ کے ساتھ ہوں، چنانچہ اس نے اس کے پاس ایک کارڈ ارسال کیا جس پر لکھا ہوا تھا "نجات دہندہ ویلنٹائن کی طرف سے" پھر اسے 14/فروری 270ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد یورپ کی بہت ساری بستیوں میں ہر سال اس دن لڑکوں کی طرف سے لڑکیوں کو کارڈ بھیجنے کا رواج چل پڑا، ایک زمانہ کے بعد پادریوں نے سابقہ عبارت کو اس طرح بدل دیا "پادری ویلنٹائن کے نام سے" انھوں نے ایسا اس لیے کیا تا کہ پادری ویلنٹائن اور اس کی معشوقہ کی یادگار کو زندہ رکھا جائے۔ اس لیے اہل یورپ اس تہوار کو مناتے ہیں۔

دیگر تہواروں کی طرح خوشی و سرور کا اظہار سرخ گلاب کے پھولوں کا تبادلہ اور وہ یہ کام بت پرستوں کی اپنے معبود سے محبت اور نصاری کے باب عشق کی یاد میں کرتے ہیں اور اسی لیے تو اس کا نام بھی عاشقوں کا تہوار رکھا گیا ہے۔

اس کی خوشی میں کارڈوں کی تقسیم، اور بعض کارڈوں میں کیوپڈ کی تصویر ہوتی ہے جو ایک بچے کی خیالی تصویر بنائی گئی ہے اور اس کے دو پیر ہیں اور اس نے تیر کمان اٹھا رکھا ہے، جسے رومی بت پرست قوم، محبت کا الہ مانتے ہیں۔

کارڈوں میں محبت و عشقیہ کلمات کا تبادلہ جو اشعار یا نثر یا چھوٹے چھوٹے جملوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور بعض کارڈوں میں گندے قسم کے اقوال اور ہنسانے والی تصویریں ہوتی ہیں اور عام طور پر اس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ "ولنٹائینی ہو جاؤ" جو کہ بت پرستی کے مفہوم سے منتقل ہو کر نصرانی مفہوم کی تمثیل بنتی ہے۔

بہت سے نصرانی علاقوں میں دن کے وقت بھی محفلیں سجائی جاتی ہیں اور رات کو بھی عورتوں اور مردوں کا رقص و سرور ہوتا ہے اور بہت سے لوگ پھول، چاکلیٹ کے پیکٹ وغیرہ بطور تحفہ محبت کرنے والو، شوہروں اور دوست واحباب کو بھیجتے ہیں۔

مذکورہ بالا پس منظر کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تہوار اصلاً رومی بت پرستوں کا عقیدہ ہے جسے وہ محبت معبود سے تعبیر کرتے ہیں اور رومیوں کے یہاں اس تہوار کی ابتدا بے بنیاد قصے کہانیوں اور خرافات پر مشتمل تھی۔

ویلنٹائن دین اسلام کی نظر میں:

مسلمانوں کے لیے اس تہوار کو منانا کئی وجوہات کی بنا پر جائز نہیں:

اس سے کفار، بت پرست رومیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مشابہت ہے اور کفار چاہے وہ بت پرست ہوں یا اہل کتاب ان سے عمومی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے چاہے وہ مشابہت عقیدہ میں ہو یا ان کی عادات و رسم و رواج یا عید و تہوار میں، اللہ کا فرمان ہے:

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے پاس روشن دلیل آجانے کے بعد تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا انھیں لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا) (آل عمران: 105)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے ہے" مسند احمد (50/2)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"اس حدیث کی کم از کم درجہ کفار سے مشابہت کرنے کی تحریم کا تقاضا کرتی ہے اگرچہ حدیث کا ظاہر مشابہت کرنے والے کے کفر کا متقاضی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اور جو بھی تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے یقیناً وہ انھیں میں سے ہے"

(الاقتضاء 1/314)

اس دور میں ویلنٹائن ڈے منانے کا مقصد لوگوں کے مابین عشق و محبت کو عام کرنا ہے چاہے وہ مومن ہوں یا کافر، حالانکہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ کفار سے محبت و مودت اور دوستی کرنا حرام ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت کرتے ہوئے ہرگز نہیں پائیں گے ،اگرچہ وہ کافران کے باپ، یا بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے قبیلے کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں) (المجادلۃ: 22)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں

" اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ کوئی بھی مومن ایسا نہیں پایا جاتا جو کافر سے محبت کرتا ہو، لہٰذا جو مومن بھی کافر سے محبت کرتا اور دوستی لگاتا ہے وہ مومن نہیں، اور ظاہری مشابہت بھی کفار سے محبت کی غماز ہے لہٰذا یہ بھی حرام ہو گی"۔

(الاقتضاء 1/490)

آج کا ویلنٹائن ڈے عیسائیت اور رومن کی بے بنیاد روایات سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کو مرد و عورت کے درمیان غیر شرعی محبت کے دن منانے کے لیے جواز بنایا گیا ہے۔ کیا اسلام اور اسلامی اقدار میں اس بات کی کہیں گنجائش موجود ہے کہ غیر محرم، کسی غیر محرم نوجوان لڑکی کو سرخ گلاب کی کلی، کینڈی یا چاکلیٹ یا کوئی اور تحفہ وغیرہ پیش کرے۔ اسلام محبت کا دین ہے اور اس کے لیے حدود مقرر کیے ہیں۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کے بعد والدین، اولاد، بزرگان دین، عُلما و صلحا اور بنی نوع انسان کے لیے خیر خواہی کا حکم دیا گیا ہے۔ سرخ پھول، تحفہ تحائف کی محبت صرف اپنی شرعی رفیق حیات [بیوی] کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ غیر اسلامی معاشروں میں اس قسم کے بے حیا چیزوں کو منانا یقیناً اسلامی احکامات کی خلاف ورزی ہے۔ غیر اسلامی معاشروں کے افراد کی یہ بے راہ روی اور بے حیائی اس قسم کی چیزوں کے ذریعے پھیلانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لہٰذا سارے غیور، با اخلاق اور اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے لوگوں پر فرض ہے کہ اس غیر اسلامی رسم کو بیخ سے اکھاڑ پھینک دے۔

"اپریل فول کی حقیقت"

مغرب کی بے سوچے سمجھے تقلید کے شوق نے ہمارے معاشرے میں جن رسموں کو رواج دیا ہے، انھی میں سے ایک " اپریل فول" منانے کی رسم ہے، اس رسم کے تحت یکم اپریل کی تاریخ کو جھوٹ بول کر کسی کو دھوکہ دینا، اور دھوکہ دے کر اسے بے وقوف بنانا، نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے ایک کمال قرار دیا جاتا ہے۔ جو شخص جتنی صفائی اور چابکدستی سے دوسرے کو جتنا بڑا دھوکہ دے اتنا ہی اُسے قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ یہ مذاق جسے در حقیقت بد مذاقی کہنا چاہیے، نہ جانے کتنے افراد کو بلا وجہ جانی اور مالی نقصان پہنچانے کا سبب بن چکا ہے اور لا تعداد ہلاکتیں بھی واقع ہو چکی ہیں۔

یہ رسم جس کی بنیاد جھوٹ، دھوکے اور کسی بے گناہ کو بلا وجہ بے وقوف بنانے پر ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس قسم کے حرکات سے گریز کرنا چاہیے، اخلاقی اعتبار سے اس کے اثرات و نتائج کسی سے مخفی نہیں، لیکن اس کا تاریخی پہلو بھی ان لوگوں کے لیے انتہائی شرمناک ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تقدس پر کسی بھی اعتبار سے ایمان رکھتے ہیں۔

اس رسم کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس بارے میں مورخین کے بیانات مختلف ہیں۔

دی ورلڈ بک انسائکلوپیڈیا "The World Book" نے اسے یورپین ممالک کی تقریبات کا ایک حصہ بتایا ہے۔ اس کی دی گئی معلومات کے مطابق فرانس کا اپنا کیلنڈر اپریل سے شروع ہوتا تھا، جب فرانس میں 1564 میں نیا کیلنڈر ماہ جنوری سے شروع ہوا تو جو لوگ نئے کیلنڈر کو تسلیم نہیں کرتے تھے انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا اور ان پر پھبتیاں کسنے کے ساتھ ساتھ بد سلوکی بھی کی جاتی۔

بعض کے خیال کے مطابق یہ رسم بت پرستی کے آثار میں سے ہے جو آج بھی قدرِ جدت کے ساتھ جاری و ساری ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں شکار کا موسم ہونے کے پہلے دنوں میں بالعموم شکار نہیں ملتا۔ یہی وجہ بعد ازاں اپریل فول منانے کی بنیاد بن گئی۔ (دیکھئے عاصم بن عبد اللہ القریوتی کا مضمون، اپریل فول)

اپریل لاطینی زبان کے لفظ اپریلس ”Aprillis“ یا ”Aperire“ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھلنا، کونپلیں پھوٹنا۔ قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی پرستش کرتی تھی اور اُسے خوش کرنے کے لیے لوگ شراب پی کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے۔ یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اپریل فول کا اہم حصہ بلکہ غالب حصہ بن گیا۔

انسائیکلوپیڈیا انٹر نیشنل کے مطابق مغربی ممالک میں یکم اپریل کو عملی مذاق کا دن قرار دیا جاتا ہے۔ اس دن ہر طرح کی نازیبا حرکات کی چھوٹ ہوتی ہے اور جھوٹے مذاق کا سہارا لے کر لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

یورپی اقوام کا من پسند پرندہ ”کوکو“ جو دھیمے سروں میں گنگناتا ہے۔ اپریل کے آغاز میں منظر عام پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے سکاٹ لینڈ کے لوگ بے وقوف بننے والے لوگوں کو ”کوک“ (بے وقوف، بے تکا، گھامڑ) کہتے ہیں۔

ایک وجہ انیسویں صدی عیسوی کی معروف انسائیکلوپیڈیا ”لاروس“ نے بیان کی ہے، اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ در اصل یہودیوں اور عیسائیوں کی بیان کردہ روایات کے مطابق یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنایا گیا، موجودہ نام نہاد انجیلوں میں اس واقعے کی تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان کی گئی ہیں۔

افسوس! آج مسلمانوں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ یکم اپریل ہی کی تاریخ تھی جب اموی خلیفہ عبد الرحمٰن والی اندلس کے جانشینوں کو شاہ فرانس شارلمان کے ہاتھوں ایسی شکست سے دوچار ہونا پڑا جس کے آثار آج بھی اس خطے میں نمایاں ہیں۔ فرانسیسی عیسائیوں نے مسلمانوں کو چن چن کر اندلس کے گلی کوچوں میں اپنے نیزوں اور تلواروں کا نشانہ بنایا۔

اکثر مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بعض نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے عیسائی ہونے کا اظہار کر دیا۔ بچے کھچے مسلمانوں کو بحری جہاز میں سوار کرکے انھیں چکمہ دیا گیا کہ تمھیں مسلمان ملک میں پہنچا دیا جائے گا، لیکن یکم اپریل منانے والی عیسائی قوم نے جب بحری جہاز سمندر کے وسط میں پہنچایا تو مسلمانوں کو سمندر کی اتھاہ گہرائی میں دھکا دے کر

انھیں فول کیا۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ہر سال اُن کے دیے گئے زخموں کو تازہ کیا جاتا ہے۔ شریعت کی رو سے یہ رسم مندرجہ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے۔

۱۔ جھوٹ بولنا۔

۲۔ دھوکہ دینا۔

۳۔ دوسرے کو اذیت پہنچانا۔

۴۔ ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے، یا توہم پرستی، یا پھر ایک پیغمبر کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔

اب مسلمانوں کو خود فیصلہ کرلینا چاہیے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر اسے فروغ دیا جائے؟

ویلنٹائن ڈے ہو، بسنت یا اپریل فول، غیر مسلموں کے تہوار اور طور طریقوں کو جس طرح اندھا دھند طور پر مسلم عوام منا رہے ہیں، اس نے ان کے اندر سے دینی محبت، غیرت اور حمیت کی آخری رمق تک کھینچ لی ہے۔ غیر مسلم اقوام کی نقالی پر اتر آنے اور مر مٹنے والی مسلم نسل کی غفلت پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے ماحول میں اپریل فول منانے کا رواج بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن آج تک ہر سال اپریل فول منانے کی کچھ نہ کچھ خبریں سننے کو ضرور ملتی ہیں۔ مسلمان اگر سنجیدگی سے اس رسم کی حقیقت، اصلیت اور اس کے نتائج پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ اس سے پرہیز کی اہمیت تک ضرور پہنچ کر رہیں گے۔ البتہ غیر مسلموں کے تہواروں کو منانے اور اُن کے طور طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے بارے میں یہی کچھ کہا جا سکتا ہے

ؔ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہولو کاسٹ کیا ہے؟

یہودی ایک طویل مدت سے دنیا کو جنگوں کی آگ میں دھکیلنے کی سازشیں کررہے تھے۔ آخر یہ سازشیں رنگ لائیں اور 1914ء میں دنیا آپس میں لڑپڑی، جرمنی اس جنگ کا اہم فریق تھا جسے یہودیوں نے جنگ میں گھسیٹا اور پھر اسے تباہ وبرباد کردیا۔ ایک مدت تک جرمنی اپنے زخم چاٹتا رہا پھر ہٹلر نے جرمن قوم کو متحد کیا اور یورپین اقوام سے انتقام پر تُل گیا۔ ساتھ ہی اس نے یہ حقیقت جان لی کہ جرمنی بلکہ ساری دنیا کی تباہی کے پیچھے اصل ہاتھ یہودیوں کا ہے۔ آخر 1938ء میں ہٹلر نے تمام بین الاقوامی قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ جنگ چھیڑی جسے دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ ہٹلر نے جنگ سے پہلے لاتعداد یہودیوں کو ملک بدر کردیا، پھر جنگ چھڑی تو اس نے بہت سے یہودیوں کو گرفتار کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہودیوں کے اپنے ذرائع ابلاغ نے مشہور کیا کہ ساٹھ لاکھ یہودی اس قتل عام کا شکار ہوئے۔ اس قتل عام کو ''ہولوکاسٹ'' کا نام دیا اور تمام مرنے والے یہود کو ''مقدس شخصیات'' مانا گیا۔ حالانکہ یہ تعداد نہایت مبالغہ انگیز تھی کیونکہ چار براعظموں میں لڑی جانے والی دوسری جنگ عظیم کے کل مقتولین پونے دو کروڑ کے لگ بھگ بتائے جاتے ہیں، تو کیا ممکن تھا کہ ان میں لگ بھگ ایک تہائی فقط یہودی ہوں۔ بلکہ سب سے بنیادی سوال تو یہ ہے کہ کیا اس وقت جرمنی میں ساٹھ لاکھ یہودی آباد بھی تھے؟ جبکہ ان کی اکثریت پہلے ہی ملک بدر ہو چکی تھی؟ دراصل یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ قرآن پاک میں یہود کے متعلق وہ واقعات جس میں یہود کی ہلاکت اور اموات کا تذکرہ ہے انھوں نے ہولوکاسٹ کی طرح اسرائیلی روایات کے ذریعے اسے بڑھا چڑھا کر حد درجے کی مبالغہ انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہمارے 70 ہزار یہاں مرے ہیں، 70 ہزار یا لاکھ اُدھر مرے ہیں وغیرہ۔ یہ ان کی پرانی جھوٹ ہے۔

الغرض یہودیوں نے اس مسئلے کو ایک ''مقدس مسئلہ'' بنادیا۔ انھوں نے دنیا سے یہ منوالیا کہ ''ہولوکاسٹ'' کی تعداد ذرائع ابلاغ، انسائیکلوپیڈیاز، مقالات، دستاویزی فلموں اور کسی بھی قسم کی رپورٹوں میں ساٹھ لاکھ بتائی جائے گی۔ یہود نے طے کیا کہ اس سے کم تعداد بتانا یا ساٹھ لاکھ کو مشکوک قرار دینا اور اس کے بارے میں کوئی دلیل یا ثبوت پیش کرنا قوم یہود کے لیے باعثِ دل شکنی ہے، اس لیے اس بارے میں ''آزادی اظہار رائے'' کو پابند کیا جانا چاہیے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ نے اپنی حکومت کو یہ اختیار

دے دیا کہ اگر دنیا میں کوئی شخص کہیں بھی ہولوکاسٹ کی تعداد ساٹھ لاکھ سے کم ظاہر کرے، تو اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے، اسے سزادی جاسکتی ہے، اسے نفرت پھیلانے اور اشتعال انگیزی کرنے کا مجرم سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یورپ کے تقریباً تین درجن ممالک میں یہودی اسے ایک قانون کی شکل دلوانے میں کامیاب ہیں۔ یورپ کے کتنے ہی صحافی، دانشور اور محققین ہولوکاسٹ کے بارے میں یہود کے افسانے کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور سزائیں بھگتتے رہے۔ ان میں سے بعض کے خلاف بین الاقوامی وارنٹ جاری ہوئے اور وہ نشانہ عبرت بنادیے گئے۔ برطانوی لبرل پارٹی کے ایک ممبر ڈیوڈ وارڈ نے اپنے بلاگ میں فقط یہ لکھ دیا تھا: ''میں ہولوکاسٹ کے دور میں یہود کو پیش آنے والے ناقابل یقین واقعات پڑھ کر غم گین ہوتا ہوں، مگر ایسے مصائب برداشت کرنے والے یہودی فلسطینیوں پر کیوں مظالم ڈھارہے ہیں؟'' ان الفاظ کی پاداش میں ڈیوڈ پر اس قدر لعن طعن کی گئی کہ اسے معافی مانگنا پڑی۔

یہ طاقت ہے دنیا کی ایک دھتکاری ہوئی اقلیتی قوم کے اتحاد کی کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف ایک معمولی سی بات کو ایشو بنالیتی ہے اور پوری دنیا کو پابند کردیتی ہے کہ یہاں آزادی اظہار رائے نہیں ہوگی، یہاں وہی لکھا اور کہا جائے گا جو یہودی پسند کرتے ہیں، چاہے وہ بالکل جھوٹ کیوں نہ ہو۔

دوسری طرف مسلمان دنیا میں سوا ارب سے زائد ہیں۔ ان کے 56 ممالک موجود ہیں، وہ دنیا کے مرکزی علاقوں میں آباد ہیں، مگر ایک مدت سے یورپی ممالک میں بار بار خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے، مسلمان احتجاج تو کرتے ہیں، مگر افسوس کہ آج تک وہ بین الاقوامی فورمز پر اس سلسلے میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کرپائے، وہ کوئی ایسا عالمی قانون نہیں بنواسکے جو پیغمبر ﷺ کی عزت و حرمت کو تحفظ دیتا ہو۔

مغرب کا تہذیبی دعویٰ

مغرب کا دعویٰ ہے کہ اس نے نسل انسانی کو ایک ایسی تہذیب سے روشناس کرایا ہے جو جدید ترین، مکمل اور انسانی تاریخ کی آخری تہذیب اور فائنل کلچر ہے۔ اس کے بعد اور کوئی تہذیب نہیں آئے گی اور دنیا کے خاتمے تک اس کی حکمرانی ہو گی۔

پہلا دعویٰ:

ان کا یہ ہے کہ مغربی تہذیب جدید اور ترقی یافتہ تہذیب ہے۔ اس دعوے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تہذیب جدید اور ترقی یافتہ نہیں بلکہ اس کلچر کی بنیاد جن چیزوں پر ہے وہ پرانی جاہلی تہذیبوں کا خلاصہ اور نئی ایڈیشن ہے۔ شراب، ناچ گانا، زنا، ہم جنس پرستی، حرام خوری، جوا، سود، استحصال، وغیرہ یہ سب جاہلیت اولیٰ کا حصہ ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے ختم کرکے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ میں اعلان فرمایا تھا:

كُلُّ اَمْرٍ جَاهِلِيَّةٍ مَوْضُوعٌ تَحْتَ قَدَمَیَّ۔ کہ آج جاہلیت کے تمام قدریں میرے قدموں کے نیچے ہیں۔

دوسرا دعویٰ:

کہ یہ تہذیب انسانی سوسائٹی کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق اور اس کو پوری کرنے والی ہے۔

یہ دعویٰ بھی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اہل دانش کے ہاں یہ مادر پدر آزاد تہذیب تو نفسانی خواہشات سے مطابقت رکھتا ہے مگر ضروریات کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ سطحی اور نفسانی، حیوانی، خواہشات کو تو پورا کرتی ہے جبکہ وہ خواہشات، جس حصے کا عقل، دانش اور فہم وتدبر کے ساتھ تعلق ہے یہ تہذیب، ان اقدار کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ باقی رہی ضرویات، تو

گزشتہ دو صدیوں کے دوران اس تہذیب کے ہاتھوں انسانی سوسائٹی تباہ و برباد ہو رہی ہے، جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

دو عالمی جنگ اور اب تیسری عالمگیر جنگ کے اسباب کے پیچھے ذہن مغرب ہی کا ہے۔ سود و استحصالی معاشی نظام دنیا کے وسائل پر قبضہ، بھوک و افلاس کا اضافہ، خاندانی نظام کی تباہی، خونی رشتوں کے تقدس کی پامالی سب مغرب کا تحفہ ہے۔

تیسرا دعویٰ:

یہ آخری تہذیب، انسانی تاریخ کا آخری ''راونڈ'' ''اینڈ آف ہسٹری'' ہے اور اس مغربی تہذیب اور حکمرانی پر تاریخ ختم ہو گی۔

مغرب کا یہ دعویٰ بھی جھوٹا ہے اینڈ آف ہسٹری کا اعلان آج سے چودہ سو برس قبل نبی کریم ﷺ نے اس طرح فرمایا تھا کہ میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے واضح کر دیا کہ میرے بعد قیامت آئے گی، نہ کوئی نیا نبی آئے گا، نہ کوئی نیا دین اور نہ کوئی نئی تہذیب آئے گی۔ بس تاریخ کی آخری راونڈ نبی کریم ﷺ اور اس کی امت ہے۔

اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے غلبے کے دو ادوار ہوں گے۔ ایک نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کا اور دوسرا دور حضرت عیسیٰؑ کے نزول اور امام مہدی کے ظہور کا، اس کے بعد قیامت قائم ہو گی۔

الغرض اینڈ آف ہسٹری مغربی تہذیب نہیں بلکہ اسلام ہے جس کا دوسرا راونڈ شروع ہونے والا ہے، ان شاءاللہ۔

دراصل مغرب اپنی طاقت، جل وفریب کی صلاحیت کے ذریعے اسلام کے اس دوسرے ''راونڈ'' کو روکنا چاہتا ہے جبکہ ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہو گی۔

(یہ مضمون دراصل علامہ زاہد الراشدی صاحب کے بیان کی تلخیص ہے)

مغربی تہذیب سے آزادی

مغربی سامراج سے صرف سیاسی آزادی مطلوب نہیں بلکہ فکری، نظریاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی آزادی بھی مقصود ہے تاکہ مسلمان اسلام کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو مرتب و منظم کر سکے۔

یہی فکر و فلسفہ، تجدید و احیائے دین کی خدمت انجام دینے والی عظیم شخصیات اسلام نے پیش کیا۔ بعض امور میں باہم اختلاف کے باوجود ان سب کے سوچ کا دھوارا اور مجموعی ماثر یہی ہے۔

اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ اس آفاقی اور عالمگیر مقصد کے حصول کے لیے محض سمجھ لینا اور صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں، صرف سیاسی، جغرافیائی آزادی اور نماز و مسجد کی آزادی کافی نہیں۔

بقول علامہ اقبال

؎ ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بلکہ خاندانی نظام کا تحفظ، اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر، دینی بالادستی اور اجتماعی زندگی کا نظام، اسلامی بنیادوں پر استوار ہو۔

اسلام در حقیقت ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اپنا نظریہ حیات اور ایک اپنا نظام حیات رکھتا ہے۔ اس لیے اسلام فکری، تہذیبی اور سیاسی میدان میں آزادی کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلام غلامی کی ہر رمز اور محکومی کی ہر علامت کو رد کرتا ہے تاکہ اسلام کو قبول کرنے والے زندگی کی تشکیل کر سکیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنی روایات، اقدار و تہذیب اور قانون و ضابطے کے مطابق گزار سکیں۔

تجدید و احیائے دین، اسلامی تاریخ کی ایک روشن روایت ہے عقیدۂ ختم نبوت اور دین اسلام کے کامل ہونے کا تقاضا ہے۔

اسلامی احیا ہی انسانی زندگی کے لیے خیر و فلاح کا سرچشمہ ہے۔ جس کا ماخذ قرآن اور سیرت ہے لہٰذا قرآن و سیرت کی بنیاد پر دین کو سمجھا جائے اور ساتھ قرآن اور سیرت کی حکمت عملی کو اپنایا جائے۔

پھر اس کے زیر سایہ اسلامی احیا کی تحریک کو منظم کیا جائے۔ یہ کام دعوت و تنظیم، افراد و رجال کار کی تیاری اور اداروں کی تعمیر و ترقی ہی سے ممکن ہے، جس میں سب سے مرکزی اور بنیادی ادارہ خاندان اور پھر سوسائٹی اور ریاست ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دور جدید کے جدید ذرائع، جدید اسلوب کو دعوت و تنظیم اور بیداری کا ذریعہ بھی بنایا جائے۔

اسلامی کیلنڈر

لیجیے! کیلنڈر نے ایک اور صفحہ الٹ دیا۔اب 1433 کے بجائے 1434ھ ہو گئے۔ دنیا میں انسان کی زندگی دن کے ساعات منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کی تبدیلی کے ساتھ گھٹتی چلی جارہی ہے، لیکن اس کو پہچاننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود اور نشانیاں مقرر کی ہیں۔یہ حدود ہم سورج اور چاند کے ذریعے پہچان سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اس گردش کو محسوس کرنے کے لیے دو نظاموں یعنی شمسی نظام اور قمری نظام کو دنیا میں مقرر و متعین کر کے چلایا ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔[سورۃ یونس: ۱۵]

الغرض اس آیت کی رو سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و کتاب کے لیے دو قسم تقویم ایک شمسی تقویم اور دوسرا قمری تقویم مقرر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس شمس و قمر کی حرکت کی بنا پر دنیا میں عام طور پر دو کیلنڈر رائج ہیں۔ایک شمسی کیلنڈر جسے عام طور پر انگریزی کیلنڈر بھی کہا جاتا ہے اور دوسرا قمری کیلنڈر جس کو اسلامی کیلنڈر کہتے ہیں۔ شمسی اور انگریزی کیلنڈر جنوری سے شروع ہو کر دسمبر پر ختم ہو جاتا ہے جبکہ قمری اور اسلامی کیلنڈر محرم سے شروع ہو کر ذی الحجہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

ان دونوں کیلنڈروں میں ایک امر مشترک یہ ہے کہ دونوں میں بارہ مہینے ہیں۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ شمسی کیلنڈر کے مہینے میں 30 یا 31 دن ہوتے ہیں جبکہ قمری مہینوں کے دن 29 یا 30 ہوتے ہیں۔قمری سال کا کوئی مہینہ 29 سے کم اور 30 سے زیادہ نہیں ہوتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کی منزلیں 28 مقرر ہیں۔جب مہینہ تیس کا ہو تو دو رات اور اگر انتیس کا ہو تو ایک رات چاند چھپا ہوا ہوتا ہے۔ان منازل سے مراد وہ مسافت ہے جو چاند ایک رات اور ایک دن میں اپنی مخصوص حرکت یا چال کے ساتھ طے کرتا ہے۔ہر رات کو ایک منزل پر پہنچتا ہے جس سے کبھی خطا نہیں ہوئی۔ابتدائی منزلوں میں وہ چھوٹا اور باریک

نظر آتا ہے پھر بتدریج بڑا ہوتا چلا جاتا ہے حتی کہ چودھویں منزل پر وہ مکمل بدرِ کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ سکڑنا اور باریک ہونا شروع ہو جاتا ہے حتی کہ آخر میں ایک یا دو راتیں چھپا رہتا ہے اور پھر ہلال بن کر نئے مہینے کی صورت میں طلوع ہو جاتا ہے۔ اس اسلامی کیلنڈر کو ہجری کیلنڈر بھی کہتے ہیں یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت کی طرف اس کی نسبت ہے۔ عربی زبان میں ہجر کے معنی چھوڑنے کے ہیں۔اسی سے ہجرت کا لفظ ماخوذ ہے ہجرت ایک اسلامی اصطلاح ہے، ایمان کی حفاظت یا دین کی اشاعت کی غرض سے ترک وطن کرنے کو ہجرت کہتے ہیں۔

اس عظیم الشان اسلامی تاریخی اور انقلابی واقعہ کی مناسبت سے اسلامی کیلنڈر کو موسوم کیا گیا، تاکہ یہ کیلنڈر ہمیں ہماری تشخص یاد دلاتا رہے اور ہجرت کے عبرت آمیز اور مواعظت انگیز واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں کا اپنا کوئی مخصوص اور الگ کیلنڈر نہیں تھا اور نہ اس وقت اس کا کوئی داعیہ پیدا ہوا تھا۔اگرچہ اسلامی عبادات اور احکامات قمری حساب سے ادا کیے جاتے تھے، لیکن مسلمانوں کا اپنا ایک علیحدہ کیلنڈر کا داعیہ یہ بنا کہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں یمن کے گورنر سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ ہمیں تمام سرکاری امور کو تاریخ کے ساتھ اندراج کرنا چاہیے۔ایک روایت کے مطابق خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مقدمے میں بحیثیت خلیفہ ایک فائل سامنے لایا گیا جس پر نہ تاریخ درج تھی نہ سال، نہ مہینہ تو آپ کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا اپنا ایک علیحدہ کیلنڈر ہونا چاہیے۔

اس غرض کی خاطر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس شوریٰ بلائی گئی جس میں سب نے اپنی اپنی رائے دی۔ کسی نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت، کسی نے یوم وفات سے شروع کرنے کی رائے دی۔ کسی نے کہا کہ بعثت سے شروع کیا جائے۔اس کے علاوہ اور بھی تجاویز سامنے آئیں۔

آخر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ہم اپنے کیلنڈر کی ابتدا ہجرت سے شروع کرتے ہیں اور اس کی رائے پر سب نے اتفاق کر لیا لیکن اب مسئلہ کیلنڈر کے آغاز کا تھا کہ سنہ کس مہینے سے شروع کیا جائے۔اس پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ حج سے واپسی کے بعد اپنے سنہ کا آغاز کرنا چاہیے۔ کیونکہ حج سے فراغت کے بعد مسلمان اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ تاریخ اور سنہ کا آغاز ہجرت سے اور سال کی ابتدا محرم سے کریں اور فرمایا کہ " الهجرة فرقت بين الحق والباطل" ہجرت کی وجہ سے حق اور باطل کے بیچ فرق اور امتیاز قائم ہوا۔

جمعہ اور عیدین علی الاعلان ادا کیے گئے ،اسلام کی عزت اور غلبہ کی ابتدا ہوئی ، ہجرت ہی سے اسلامی ریاست کا قیام معرض وجود میں آیا، ہجرت مدینہ سے اخوت کا عظیم جذبہ پیدا ہوا ،ہجرت ہی سے اشاعت اسلام کی متعدد راہیں کھل گئیں ،ہجرت ہی سے ثابت ہوا کہ اسلام انفرادی نظام کے بجائے اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اجتماعی نظام کا نفاذ اس کی ترجیح ہے۔

اگرچہ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ تاریخ اور سنہ ہجری کی ابتدا ربیع الاول سے ہوتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مہینہ میں مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔بقول اصحاب سیرۃ ربیع الاول ۱۳ نبوی آپ قبا میں رونق افروز ہوئے لیکن پھر بھی ربیع الاول کے بجائے محرم الحرام سے اس سنہ ہجری کی ابتدا کی گئی اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ اور فیصلہ اسی ماہ محرم میں فرما چکے تھے۔انصار نے مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اطہر پر بیعت عقبہ ثانیہ کی اور حج کر کے ذی الحجہ کے آخر میں مدینہ منورہ واپس آئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی واپسی کے چند روز بعد ہی ہجرت کا ارادہ کر لیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو ہجرت کی اجازت دے دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے آہستہ آہستہ ہجرت شروع کی۔اس کے برعکس عام طور پر کیلنڈر اور تقویم کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی ولادت ، وفات ، قیام سلطنت یا بڑی بڑی فتوحات سے ہوا ہے۔یہ صرف اسلام کا طرہ امتیاز ہے کہ اس کی تقویم کا آغاز واقعہ ہجرت سے ہوتا ہے،اسلام نے اپنے دین کا نام بھی اپنے رسول کے

نام پر دین محمدی نہیں رکھا بلکہ اس دین کے پیغام پر اس کا نام اسلام رکھا۔جو طرز حیات اور ضابطہ زندگی ہے اور جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے اس کا تعلق اور نہ وفات سے،حالانکہ یہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں۔

کیلنڈر کسی قوم کی اپنی شناخت ہوتی ہے اس سے قوم وملت کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے ہجری کیلنڈر پر غور کیا جائے اس میں اکثر مہینوں کے نام وہ ہیں جو اسلامی عبادات اور مسلمانوں کی مذہبی روایات کی نشاندہی کرتے ہیں اور نام ہی سے ان مہینوں سے متعلق عبادات اور واقعات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔دوسری قوموں کے جو کیلنڈر مروج ہیں وہ ان کے مذہبی افکار اور روایات کا مظہر ہیں۔یہی حال مہینوں اور ہفتوں کے ناموں کا بھی ہے۔مثلاً sunday اور Monday کے الفاظ پر غور کیجیے۔ان کے معنی ہیں سورج کا دن اور چاند کا دن۔ چونکہ اہل یونان کے ہاں ایک سورج کی عبادت کی جاتی تھی اور ایک دن چاند کی۔اس لیے مختلف دیوتاؤں کے نام سے دنوں کے نام ہوا کرتے تھے،کچھ اس طرح کا معنی مہینوں کے نام کے پیچھے بھی کارفرما ہے اس لیے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کیلنڈروں کو قبول نہیں کیا جو اس زمانے میں مروج تھے۔پس اسلامی کیلنڈر مسلمانوں کی اپنی ایک پہچان ہے۔

اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس کیلنڈر کو رواج دیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے پس منظر اور اس کی دینی وملی حیثیت سے واقف کرائیں، کیونکہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کل اکثر مسلمانوں کو اپنی اسلامی کیلنڈر کے مہینوں کے نام تک یاد نہیں۔علمائے کرام نے لکھا ہے کہ ہجری کیلنڈر کے چلن کو باقی رکھنا اور اس کی ترویج کی کوشش کرنا فرض کفایہ یعنی امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔

قرون اولیٰ میں مسلمان اس پر عمل پیرا تھے کہ اپنے اوقات،تواریخ اور حسابیات کے لیے اسلامی تاریخ کو باعث فخر اور طرہ امتیاز سمجھتے تھے، لیکن افسوس کہ موجودہ دور میں اہل اسلام نے اسلامی تاریخ کا رواج ترک کر دیا ہے یہاں تک کہ اکثر حضرات کو اسلامی تاریخ تک یاد نہیں ہوتی کہ آج کون سی تاریخ ہے اور کون سا اسلامی مہینہ ہے؟ یہاں تک کہ اکثر دینی

مدارس اور مساجد کا نظام و انصرام بھی انتظامی حوالے سے اسلامی تاریخ کے مطابق نہیں ہوتا سوائے دینی مدارس کے نظام تعلیم کے کہ اس کا آغاز اور اختتام اسلامی تاریخ کے مطابق ہوتی ہے۔جس طرح اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن آہستہ آہستہ مسلمانوں سے مفقود ہوتا ہوا نظر آرہاہے اسی طرح اسلامی تاریخ کارواج بھی مفقود ہے۔اسی طرح نیااسلامی سال منانے کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ عام مسلمان اسلامی سال کی عظمت سے روشناس ہوں، غیروں کی تقلید سے اپنا دامن چھڑا سکیں جس کی ترغیب آج غیروں کا میڈیا بڑے موثر انداز اور غیر محسوس انداز سے پیش کر رہاہے۔ہمارے معاملات اور عبادات اسلامی تقویم اور تاریخ کے مطابق رائج کرنے کے فوائد، ہجرت کے ثمرات سے عامۃ المسلمین کی آگہی بے حد ضروری ہے، تاکہ لوگوں میں اصلاح احوال اور اصلاح معاشرہ کا جذبہ بیدار ہو اور وہ اسلامی احکامات پر تجدید عزائم کے لیے پوری کوشش کر سکیں۔در حقیقت اسلام منانے کے بجائے اپنانے یعنی عمل کا تصور پیش کرتا ہے۔

اسلامی ہجری سال، پیغام اور خصوصیات

اسلامی ہجری تاریخ نے ایک اور ورق پلٹ لی، اب ۱۴۳۹ ہجری کی بجائے ۱۴۴۰ ہجری ہو گی۔ کُلُ عامٍ وَ اَنْتُمْ بِخَیْرٍ! اسلامی تقویم کلینڈر کی ابتدا ہجری ماہ محرم سے سیدنا عمر فاروقؓ کے دور میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ سے طے پایا۔

سن ہجری کا آغاز ایمان والوں کے لیے جداگانہ شناخت کا مظہر ہے۔ ایمان سے خالی لوگ اس طرح کے مواقع کے عیش و عشرت اور بے معنی خوشی میں گزارتا ہے، جبکہ بندۂ خدا ان مواقع کو اپنے معبود کے ساتھ رشتہ عبدیت مضبوط بنانے اور اس کی رضاجوئی میں صرف کرتا ہے۔ اسلامی سال کا ہجرت جیسے عظیم الشان واقعے سے آغاز اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس امت کے افراد میلوں ٹھیلوں، لہو لہب اور جاہلی تہذیبوں کے دل دادہ نہیں ہو سکتے۔ انھیں ہمیشہ ہجرت جیسا واقعہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جب رسول اللہؐ اور جان نثار صحابہؓ نے محض دینِ حق کے تحفظ اور اس کی دعوت کی خاطر صعوبتیں اٹھائیں اور حق و باطل کے درمیان فرق واضح کرنے کی سنگ میل قائم کیا۔ جب گزشتہ ہجری سال کو الوداع کہہ کر نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ کچھ دیر ٹھہر کر اپنی ذات اور اپنی زندگی کے گزشتہ ایام کا محاسبہ کریں۔ یہی نئے سال کا پیغام ہے۔

یہ دنیا فانی اور انسانی زندگی نہایت مختصر ہے لہٰذا آخرت کی جاودانی زندگی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ہجری سال کے اختتام اور آغاز کا یہی پیغام ہے کہ انسان گزشتہ کا محاسبہ اور مستقبل کا منصوبہ بندی کرے۔ یہ محاسبہ اور منصوبہ بندی ہر مسلمان پر لازم ہے خصوصاً مقتدا و پیشوا، داعی و مبلغ، اسلامی تحریک کے کارکن، کسی دینی جماعت کے رہبر اور خصوصاً وہ لوگ جن کے ساتھ امت کا اجتماعی مفاد وابستہ ہیں۔ اسلامی ہجری کلینڈر کے اندر بے شمار خصوصیات و امتیازات جو دوسرے اقوام عالم کے کلینڈر میں نظر نہیں آتیں۔

دیگر کلینڈرز میں نقائص:

۱۔ ماہ وسال کی غیر فطری ترتیب

۲۔ مہینوں یا دنوں کے ناموں کا بادشاہوں یا امر اور بتوں کے نام سے منسوب ہونا۔

۳۔ جغرافیائی طور پر عالمی کی بجائے مقامی سہولیات کے اعتبار سے مرتب کیے جاتے رہے اس وجہ سے ان کو شمسی تقدیم کہا جاتا ہے۔

۴۔ شمسی تقدیم میں موسمی تبدیلی نہیں ہوتی یعنی ہر مہینہ ایک ہی موسم کے ساتھ ہر وقت خاص رہتا ہے۔

ان نقائص کا اگر غور سے جائزہ لیا جائے تو پھر اسلام کے تجویز کردہ ایک ایک امر کی فوقیت واضح ہو جاتی ہے۔

اسلامی ہجری کلینڈر کی خصوصیات:

۱۔ اسلامی کلینڈر کے مہینوں، دنوں کے ناموں کو دیکھا جائے تو ان میں کسی حد تک اغیار کے عدم موافقت کے پاس رکھا گیا ہے کہ کوئی نام ایسا تجویز نہیں کیا گیا جس میں کسی رسم ورواج کی بو آتی ہو۔

۲۔ ہر ایک مہینہ محرم سے ذوالحجہ تک اپنے معانی میں ایک خاص سبق رکھتا ہے۔

۳۔ ہجری کلینڈر کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس کی ترتیب فطری ہے یعنی رات دن کے شروع ہونے اور مہینہ کے آغاز کے حوالے سے اصول سب فطری ہیں۔ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے معلوم کرنا آسان ہے۔

۴۔ مہینے یا دن کا نام کسی بادشاہ یا بت کے نام کے ساتھ منسوب نہیں ہے۔

۵۔ دیگر کلینڈرز کی طرح مقامی صورتحال کو سامنے رکھنے کی بجائے، اسلامی ہجری کلینڈر عالمی اصولوں کے تحت رواج دیا گیا ہے۔ مثلاً چاند کے حوالے سے آپؐ نے فرمایا صوموا لرویتہٖ وافطروا لرویتہٖ۔

٦۔ اسلامی کلینڈر کے مہینوں میں موسمی تبدیلی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلامی مہینوں میں عبادات مثلاً روزہ، حج، قربانی وغیرہ ہر موسم میں دستیابی کا انتظام ہو گیا ہے۔ روزہ یا حج و قربانی کبھی گرمی میں تو کبھی سردی میں ادا کئے جاتے ہیں تا کہ ایمان والوں کو یہ احساس ہو کہ موسم خواہ کیسا ہی ہو اپنے خالق و مالک کی عبدیت کا حق ادا کرتے رہنا چاہیے۔

بہار ہو کہ خزاں لاالہ الااللہ

بس انھی کیفیات کو زندہ رکھنے کا سبب یہ ہجری سال بنا، جس میں بندہ اپنی بندگی کا اظہار ہر موسم میں کر کے اپنے خالق کی محبت اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ یقیناً اس عظیم کارنامے پر امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروقؓ خراج تحسین و عقیدت کے مستحق ہیں۔

محرم الحرام کی حقیقت

سال اور سن شمسی ہو کہ قمری، دونوں میں سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہی ہوتی ہے۔ شمسی سال میں مہینوں کے نام جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ہیں جبکہ قمری کیلینڈر کے مہینے بالترتیب محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔

اسلامی کیلینڈر کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے اشہر الحرام کہلاتے ہیں۔ اسلام میں ان مہینوں کی فضیلت اور احترام روز اول سے چلا آرہا ہے بلکہ قبل از اسلام زمانہ جاہلیت، اور دیگر ادیان میں بھی اس کی فضیلت و احترام مسلم چلی آرہی تھی۔ مشرکین عرب ان مہینوں کے احترام کے پیش نظر اپنی خانہ جنگیوں کو بند کر دیا کرتے تھے۔ ابتدا اسلام میں بھی ان مہینوں کے احترام کے باعث قتال کی ممنوعیت کو برقرار رکھا گیا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

"اور آپ سے حرمت والے مہینے کی بابت یعنی اس میں قتال کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجیے کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے" (البقرہ: ۲۱۷)

مگر حرمت قتال کا یہ حکم آیات قرانیہ سے بعد میں منسوخ ہو گیا اور ان مہینوں میں قتال جائز قرار دیا گیا، اگرچہ افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال کی ابتدا نہ کی جائے۔ قرآن پاک میں ان چار اشہر الحرم کا بیان اس طرح ہوا ہے کہ:

"بے شک اللہ کے ہاں اللہ کے علم میں مہینوں کی تعداد اس دن سے بارہ ہے جب سے اللہ نے زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں ان میں سے چار عزت والے ہیں" (توبہ: ۳۶)

ان چار مہینوں سے مراد احادیث اور اقوال مفسرین کی رو سے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب ہے۔ بہر حال یوں تو سال کے بارہ مہینے اور ہر مہینے کے تیس دن اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے پورے سال کے بعض مہینے اور پھر مہینے میں بعض ایام کو مخصوص فضیلت عطا فرمائی اور پھر ان میں کچھ مخصوص احکام مقرر فرمائے ہیں۔ ان مہینوں میں محرم الحرام بھی حرمت اور فضیلت والا ایک مہینہ ہے۔ جس کی

حرمت اور عظمت ایک قدیم زمانہ سے مسلم شدہ حقیقت ہے۔ قرآن پاک نے بھی اس کو حرمت والا مہینہ قرار دیا ہے۔ محرم تحریم سے نکلا ہے اور باب تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ تحریم کے کئی معنی ہیں جن میں سے ایک معنی تعظیم بھی ہے۔ تو اس لحاظ سے محرم کا معنی ہوا عظمت والا مہینہ۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ کسی زمانے، دن یا رات، صبح یا شام، مہینہ یا سال میں عظمت ذاتی نہیں ہوتی بلکہ عظمت کا اصل سبب اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور انوار کا اس وقت میں ظاہر ہونا ہے اور یہ کہ یہ عظمت اللہ تعالیٰ اور شریعت کی رو سے دی گئی ہو۔ اگرچہ بعض واقعات غیر معمولی اور عظیم الشان اور اہم واقعات کا کسی زمانہ میں رونما ہونا بھی ثانوی حیثیت سے اس زمانہ کی عظمت و فضیلت کا سبب اور موجب ہو جاتا ہے اور جس زمانہ میں انوار و تجلیات کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اس زمانہ میں اجر و ثواب بھی بہ نسبت دوسرے ایام کے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ زمانہ اپنی ذاتی حیثیت کے اعتبار سے یکساں اور مساوی ہے فضیلت اگر اس میں آئی ہے تو اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات خاصہ کے نزول کی وجہ سے آئی ہے اور جس کا علم بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے ناممکن ہے۔ اپنی طرف سے کسی زمانہ کے عظمت اور فضیلت کا یقین و اعتقاد جائز نہیں اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر میدان عرفات کو لیجیے ۹ ذی الحجہ کے علاوہ سال کے کسی دن وہاں اگر وقوف کر لیا جائے تو ذرہ برابر بھی عبادت کا ثواب نہیں ملے گا حالانکہ وہی میدانِ عرفات ہے اور اس میں وہی جبل رحمت موجود ہے لیکن ۹ ذی الحجہ کے علاوہ عام ایام میں وہاں وقوف کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں۔ البتہ ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں کھڑے ہونے کا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے اس تاریخ اور دن کو وہاں وقوف کرنا عبادت ہو گی اور پھر عبادت بھی ایسی عبادت کہ جو دنیا کے کسی زاویہ میں ادا نہیں ہو سکتی سوائے عرفات کے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ میدان عرفات میں اور نہ ہی وقوف میں ذاتی طور میں کچھ کمال ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گیا تو فضیلت ثابت ہو گئی۔

اسی طرح ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کا عظیم الشان فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے اگر ایام قربانی ۱۲،۱۱،۱۰ کے بعد کوئی آدمی لاکھوں قربانیاں بھی کرے، قربانی کا ذرا ثواب بھی اسے نہیں ملے گا اور اسی طرح ایام قربانی میں اگر کوئی آدمی قربانی کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کر دے تو ہر گز قربانی کا ثواب نہیں ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وقت کی عظمت اور فضیلت کے تقاضوں کو شرعی حدود کے مطابق پورا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح محرم الحرام میں بھی فضیلت اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوئی ہے اور ماہ محرم کے احترام کے تمام تقاضوں کو بھی شریعت کے مطابق پورا کرنا ضروری ہے ورنہ شرعی حدود کے دائرے سے تجاوز کے مترادف ہوگا جو کہ عظیم گناہ ہے۔

محرم الحرام کی فضیلت کی وجوہات:

محرم کی فضیلت اور حرمت کی سب سے پہلی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور کائنات کی پیدائش ہی سے چار فضیلت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ محرم کا بھی ٹھہرایا ،اور پھر محرم کے مہینے میں خاص طور پر دسویں تاریخ کو فضیلت بخش دی گئی جس کو عام طور پر عاشورا کہا جاتا ہے جس کا معنی ہے دسواں دن۔ یہ دن اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کا خصوصی طور پر حامل ہے۔

ان مہینوں کی عزت اور حرمت پہلے ہی سے دین ابراھیمی میں بھی چلی آرہی تھی حتی کہ مکہ والے بھی اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی پیروی میں اشہر الحرام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً محرم الحرام کو بہت محترم مہینہ سمجھتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ”زمانہ جاہلیت میں قریش بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے“

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس محرم کا تقدس اور اہمیت دین موسوی میں یوں اور بھی بڑھ گئی جب سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون لعین سے اسی ماہ محرم کی ۱۰ تاریخ کو نجات ملنے کی خوشی میں اللہ کا شکرادا کرنے کے طور پر اس دن روزہ رکھنے کا حکم ملا جسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے ساتھ بجالایا۔ اس طرح یہ طریقہ عزت واحترام بنی اسرائیل میں چلا آتا رہا۔

جب اسلام آیا تو اس نے بھی محرم الحرام کی یہی عزت برقرار رکھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک دفعہ وہاں انھوں نے

یہودیوں کو محرم کی ۱۰ تاریخ کو روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ دریافت کی۔ پوچھنے پر جواب ملا کہ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی تھی، تو آپ نے روزہ رکھا تھا اس لیے یہود موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کر کے اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا پھر موسیٰ علیہ السلام کی طرح عمل کرنے کا میں تم لوگوں سے زیادہ مستحق ہوں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کا روزہ خود بھی رکھا اور صحابہ کرامؓ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت جو سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ یہودی عاشورا کے دن کو عید شمار کرتے اور روزہ رکھتے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حکم دیا کہ تم لوگ بھی اسی دن روزہ رکھو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں جب بھی عاشورا کا دن آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے لیکن وفات سے پہلے جب محرم کا مہینہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کا روزہ رکھا اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دس محرم کو ہم مسلمان بھی روزہ رکھتے ہیں اور یہود بھی روزہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھ ہلکی مشابہت ہو جاتی ہے۔ میں اگر آئندہ سال زندہ رہا تو صرف عاشورا کا روزہ نہیں رکھوں گا بلکہ اس کے ساتھ ایک روزہ اور ملاؤں گا یعنی ۹ یا ۱۱ محرم الحرام کا روزہ بھی ساتھ رکھوں گا تاکہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت ختم ہو جائے، لیکن اگلے عاشورا کا دن آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں ملی چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی اس لیے صحابہ کرامؓ نے عاشورا کے روزے کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا اور ۹ یا ۱۱ محرم کا ایک روزہ ساتھ ملا کر رکھا اور اس کو مستحب قرار دیا اور تنہا عاشورا کے

روزہ رکھنے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں عُلما نے مکروہ تنزیہی اور غیر اولیٰ قرار دیا۔

الغرض یہ شریعت میں محرم الحرام کی عظمت اور حرمت کی وجوہات تھیں جن کی بنا پر محرم ایک فضیلت اور کرامت والا مہینہ بن گیا ہے۔ پھر تاریخ اسلام میں اس مہینے اور ۱۰ تاریخ کو اتفاقی طور پر بعض واقعات اور حادثات بھی وقوع پذیر ہوئے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ نے اس ماہ یکم محرم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا۔ خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروقؓ کی شہادت بھی یکم محرم ہی کو ہوئی۔ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوایوب انصاریؓ کی وفات بھی یکم محرم کو پیش آئی اور اسی طرح محرم کی ۱۰ تاریخ کو نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسینؓ کی شہادت کا حادثہ فاجعہ بھی واقع ہوا۔

محرم کی تاریخ و پس منظر اور اس کی فضیلت

عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ محرم کا تقدس واحترام اور اس کی وجہ حرمت، سیدنا حسینؓ کی شہادت ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔اصل میں فضیلت محرم، شہادت حسینؓ اور وقوع کربلا کے باعث نہیں۔اسلام میں اس مہینے کی فضیلت اس سے پہلے بھی تھی بلکہ اسلام سے قبل کے ادیان میں بھی اس کی فضیلت واحترام مسلم چلی آرہی تھی۔

ایک تو یہ کہ محرم کا شمار ان چار اشہر الحرم میں سے ہوتا ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے کہ:

"بے شک اللہ کے ہاں اللہ کے علم میں مہینوں کی تعداد اس دن سے بارہ ہے جب سے اللہ نے زمین وآسمان پیدا کیے اور ان میں سے چار عزت والے ہیں" [التوبہ: ٦٣]

ان چار مہینوں سے مراد احادیث و اقوال مفسرین کی رو سے ذوالقعدہ، ذوالحجہ محرم اور رجب ہیں۔ بہر حال یوں تو سال کے بارہ مہینے اور ہر مہینے کے تیس دن اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے پورے سال کے بعض ایام کو خصوصی فضیلت عطا فرمائی ہے اور ان ایام میں کچھ مخصوص احکام مقرر فرمائے ہیں۔یہ محرم کا مہینہ بھی ایک ایسا مہینہ ہے جس کو قرآن کریم نے حرمت والا مہینہ قرار دیا ہے۔آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ چار مہینے ایسے ہیں جو حرمت والے ہیں، ان میں سے ایک محرم کا مہینہ ہے۔ خاص طور پر محرم کی دسویں تاریخ جس کو عام طور پر "عاشورا" کہا جاتا ہے، جس کے معنیٰ ہے "دسواں دن" یہ دن اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کا خصوصی طور پر حامل ہے۔

دوسرا ان مہینوں کی عزت و حرمت پہلے ہی سے دین ابراہیمی میں بھی چلی آرہی تھی حتیٰ کہ مکہ والے بھی ان مہینوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے خصوصا محرم کو بہت محترم مہینہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔

"زمانہ جاہلیت میں قریش بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔جب اسلام آیا تو اس نے بھی یہی عزت و حرمت برقرار رکھی"۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس محرم کا تقدس واہمیت دین موسوی میں یوں اور بھی بڑھ گئی جب حضرت موسیٰؑ و بنی اسرائیل کو فرعون لعین سے اسی ماہ محرم کی 10 تاریخ کو نجات ملنے کی خوشی میں اللہ کا شکرادا کرنے کے طور پر اسی دن روزہ رکھنے کا حکم ہوا جسے سیدنا موسیٰؑ نے مع قوم بجالایااس طرح یہ طریقہ عزت واحترام بنی اسرائیل میں چلاآتا رہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں انھوں نے یہود کو یہ روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر جواب ملا کہ اس دن موسیٰؑ کو نجات ملی تھی اور آپؑ نے روزہ رکھا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ عاشورہ [۱۰ محرم] کے دن یہود روزہ رکھتے ہیں دریافت فرمایا: کیا بات ہے ؟[روزہ رکھنے کی کیا وجہ ہے] تو یہودیوں نے عرض کیا کہ یہ اچھا دن ہے ،اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دلائی تھی پس اسی لیے موسیٰؑ نے اس دن روزہ رکھا تھا [اس لیے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں] اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو پھر موسیٰؑ کی طرح عمل کرنے کا میں تم لوگوں سے زیادہ مستحق ہوں ۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کا روزہ خود بھی رکھا اور دوسرے صحابہؓ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

چوتھی اہم بات یہ کہ ’’ اس مہینے کا نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر اللہ یعنی اللہ کا مہینہ رکھا اس کی اضافت اس کی خاص مخلوق کے علاوہ کسی اور کی نہیں جاسکتی جیسا کہ محمد ابراھیم ،اسحاق ،یعقوب ،وغیرہ انبیاء علیھم السلام کی اضافت اللہ تعالیٰ کے بندے ہونے کے ساتھ ہے [یعنی یہ سب نبی عباد اللہ ہیں] اسی طرح اللہ کی طرف اللہ تعالیٰ کے گھر بیت اللہ کی نسبت ہے ایک اونٹنی کی اضافت اللہ کی طرف ہے جسے قرآن پاک میں ناقۃ اللہ کہا گیا ہے [کیونکہ وہ ایک خاص اونٹنی تھی] تو جب یہ مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے خاص کر دیا گیا اور روزہ کی نسبت تمام اعمال میں سے اللہ کی طرف کی گئی ہے تو مناسب یہ ہے کہ اس مہینے کو بھی اس خاص عمل روزے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیا جائے گا۔

ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہیں کہ اس مہینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کسی دوسرے کو اختیار نہیں ہے کہ اس کی حرمت کو بدل ڈالے جیسا کہ دور جاہلیت میں اہل عرب اس کو حلال کر دیتے تھے اور اس کی جگہ صفر کو حرمت کا مہینہ بنا دیتے تھے اشارہ کر دیا اس بات کی طرف کہ یہ اللہ کا مہینہ ہے اللہ نے اس کو حرمت کا مہینہ بنایا ہے پس اس کی طرف مخلوق میں سے کسی اور کو اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کو بدل دے"

اس کے علاوہ محرم میں بہت سے اہم واقعات شہادت حسینؓ سے قبل کے تاریخ اوراق میں وقوع پزیر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ نے اس ماہ یکم محرم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تھا۔

۲۔ خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروقؓ کی شہادت یکم محرم ہی کو ہوئی۔

۳۔ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابو ایوب انصاریؓ کی وفات بھی یکم محرم کو پیش آئی۔

اس کے بعد اتفاقی طور پر اسی محرم کی ۱۰ تاریخ کو نواسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسینؓ کی شہادت کا حادثہ فاجعہ بھی سبائی ٹولہ کے سازشی ذہن کے مکر و فریب سے واقع ہوا۔[جس کی تفصیل بندہ کے رسالہ "واقعہ کربلا کی حقیقت" میں دیکھی جا سکتی ہے]۔

بہر حال اس بحث سے معلوم ہوا کہ اس کو حرمت کا مہینہ شہادت حسینؓ یا واقعہ کربلا کی وجہ سے بنانا صحیح نہیں۔ مگر رافضی سبائیوں نے لوگوں کے اذہان میں غیر محسوس طور پر ایک تو یہ جھوٹ سما دیا کہ محرم کی عظمت و حرمت شہادت حسینؓ ہی کی وجہ سے ہے [جو صریح جھوٹ ہے جیسا کہ پہلے ثابت ہوا] اور دوسرا یہ غلط خیال بھی لوگوں کے دلوں میں جما دیا کہ دنیا میں شہادت حسینؓ جیسا مظلومیت کا اور کوئی سانحہ رونما ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ اس سے کئی زیادہ دل سوز اور مظلومیت کے بے شمار واقعات تاریخ اسلام میں جا بجا موجود ہیں جن میں سے ایک واقعہ خلیفۃ الرسول امیر المؤمنین سیدنا عثمانؓ کی شہادت کا ہے جس کی مظلومیت کی نظیر بلا

شک و شبہ کہیں نہیں ملتی، مگر باوجود اس کے مسلمان اس حادثہ ظلم و جبر اور مظلومیت سے اس قدر بے خبر ہیں کہ گویا ان کے نزدیک یہ فرش و عرش کو لرزا دینے والا سانحہ وقوع پذیر ہی نہیں ہوا۔ کیا آپ نے کبھی کسی زبان کو اس مظلومیت کی داستان بیان کرتے ہوئے، کسی کان کو اس طرف التفات کرتے ہوئے، کسی قلم کو یہ جان نگار حادثہ لکھتے ہوئے اوراق تاریخ میں اس کی تفصیل دیکھنے کے لیے کسی نگاہ کو توجہ دیتے ہوئے اس مظلومیت پر کسی دل میں احساس درد کرتے اور کسی آنکھ کو کبھی اشک بار دیکھا ہے؟

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقدام مبارک کا طائف میں لہو لہان ہونا، جہاد میں کفر سے برسرپیکار رہ کر درندہ صفت کفار کے ہاتھوں دانت مبارک کا شہید ہونا، چہرہ انور کا زخمی ہونا اور اسے نہ رکنے والا خون جاری ہونا، انگلی سے خون بہنا اور بہت سے انبیاء علیہم السلام کے ظلم اور بے دردی کے ساتھ شہید ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے جانباز و جان نثار اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اسلام کا مکار رافضی غنڈوں کے ہاتھوں شہید ہونے کا بیان اس درد سے ہونا کبھی سنا ہے۔

کیوں آج دل و دماغ ان دل گداز واقعات کی حقیقت جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کیوں آج زبان و قلم ان واقعات کی سچی تصویر پیش کرنے اور اظہار حقیقت کرنے سے قاصر ہیں۔ کیوں ہاتھ آج سچی تاریخ کو ٹٹولنے کی سکت نہیں رکھتے؟ اور کیوں آنکھ میں وہ نور نہیں رہا کہ تاریخ کی ان مسلمہ حقیقتوں کا مشاہدہ کرسکے؟

وجہ ان سب کی یہ ہے کہ اسلام دشمنی کے ان سفاکانہ حالات و واقعات کے علم سے اسلام دشمنی اور شیعت و رافضیت کی مکاری و تقیہ کا پردہ چاک ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان دشمنان اسلام نے اپنے بے شمار مذموم مقاصد کے حصول کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام اور باقی صحابہ کرامؓ کی شان کو اہلیان اسلام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی خاطر اس ایک واقعہ [شہادت حسینؓ] کی ایسے غلط انداز سے منظر کشی کی اور اس کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ان دونوں اہداف کو نشانہ بنایا کہ نہ تو آج ان انبیا اور صحابہؓ پر ظلم وجور کے جو پہاڑ توڑے گئے وہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان کی اسلام دشمنی کے مکر وہ فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے غور کیجیے کہ یہ اسی رافضیت کا زہر نہیں تو اور کیا ہے؟

ماہ صفر کی حقیقت

جوں جوں انسان قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات سے غافل اور دور ہوتا چلا جاتا ہے ٹھیک اُسی رفتار سے اُس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کمزور ہوتے ہوتے بالآخر وہ آخرت سے غافل اور دنیا کی ہوس میں بُری طرح گرفتار ہو جاتا ہے۔اس پر شیطان کا تسلط قائم ہونے سے وہ طرح طرح کے شیطانی تصرفات کا شکار ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ سے تعلق کی کمزوری اور شیطانی تسلط کی وجہ سے قسم قسم کے توہمات اور وساوس اس کا پیچھا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور شریعت کے بتائے ہوئے سیدھے اور سچے راستے سے بھٹک کر شیطانی راستوں پر چل پڑتا ہے۔اوہام پرستی کا یہ سلسلہ اسلام سے قبل یعنی دور جاہلیت میں کہیں زیادہ تھا، لیکن اسلام کا نور پھیلنے سے اس کفر وشرک اور توہمات کی ظلمتوں کا خاتمہ ممکن ہوا، لیکن پھر جب زمانہ عہد نبوت سے دور ہوتا چلا گیاتو مسلمانوں میں عملی واعتقادی کمزوری دوبارہ آتی چلی گئی۔آج مسلمان پھر دور جاہلیت کی گمراہیوں کے طرف بڑھ رہے ہیں، انھی گمراہیوں اور توہمات میں سے زیر بحث مسئلہ ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگ بعض مخصوص ایام اور مہینوں کو منحوس، بے برکت اور بے خیر سمجھتے ہیں۔اس میں شادی بیاہ اور دوسرے کوئی اہم خوشی وغیرہ کے کام نہیں کرتے۔ طرح طرح کی باتیں اور کام اپنی طرف سے گھڑ لیتے ہیں جن کا شریعت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ان بعض مخصوص ایام اور مہینوں میں سے اسلامی سال کا دوسرا مہینہ صفر المظفر بھی ہے جس میں جاہل قسم کے لوگ مختلف قسم کے توہمات، وساوس، تحریمات اور غیر شرعی کاموں میں مبتلا ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ صفر کو نامرادی، ناکامی، بے خیری اور بے برکتی کا پیش خیمہ تصور کرتے تھے اور اسے منحوس سمجھتے تھے۔ شیخ ابو علی زورقی اصفہانی کی کتاب ''الازمنہ والامکنہ' ' میں ہے کہ اس مہینے کو صفر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اس مہینے میں ''صفریہ'' نامی مقام کو جاتے اور وہاں کھانا تیار کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ماہ میں اُن کے علاقوں میں آب وگیاہ کی کمی یا ختم ہونے کی وجہ سے چوپایوں میں دودھ کم ہو جاتا تھا جس

کی وجہ سے یہ علاقے دودھ سے خالی ہو جاتے تھے۔اس بنا پر اس مہینے کو صفر (خالی اور بے خیر مہینے) کا نام دیا گیا۔

ماہ صفر کے متعلق اہل عرب کا یہ گمان بھی تھا کہ صفر ایک قسم کا سانپ ہے جو انسان کے پیٹ اور معدے میں ہوتا ہے۔ بھوک کی شدت میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ اسی کے ڈسنے سے ہوتی ہے۔ بعض کے خیال کے مطابق صفران کیڑوں کو کہتے ہیں جو جگر اور پسلیوں کے سرے میں پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان کا رنگ بالکل پیلا پڑ جاتا ہے جس کو طب کی اصطلاح میں ہر قان اور پیلیہ کہا جاتا ہے۔انھی تصورات سے انسان لرز اٹھتا ہے اور صفر کی آمد سے اس کے تصورات واحساسات میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ زمانہ جاہلیت میں ماہ صفر میں بعض اتفاقی مصائب وحوادث ، فتنے مصیبتیں، بلائیں وبائیں پیش آئیں تھیں جن کی بنیاد پر یہ عقیدہ قائم ہو گیا تھا کہ یہ مہینہ مصیبت زدہ ہے۔یوں اس مہینے کو نحوست والم کا مہینہ قرار دیا گیا، لیکن افسوس ٹھیک اُسی جہالتِ قدیمہ کی مانند جہالتِ جدیدہ میں (موجودہ دور کے) جاہل مسلمان بھی اس ماہ کے متعلق وہی عقیدہ اور تصور رکھتے ہیں کہ یہ مہینہ منحوس اور بے خیر ہے۔اس لیے بعض لوگ اس ماہ صفر کو آفات و مصائب آنے والا مہینہ تصور کرتے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق اس میں بھوت پریت اور بلاؤں کا نزول ہوتا ہے۔ عورتیں کہتی ہیں کہ صفر میں رجال الغیب ، غیب عالم (بھوت پریت) آتے ہیں۔اس لیے رات کو گھر سے باہر نکلنا اچھا نہیں سمجھتے۔ بچوں، شام کے وقت بچوں کو باہر نکلنے نہیں دیتے، تاکہ ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچ نہ جائے بعض لوگ ماہ صفر میں خوشی ومسرت کی تقریبات شادی بیاہ و نکاح منعقد نہیں کرتے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صفر میں کی ہوئی شادی صِفر (ناکام) ہوتی ہے۔اس مہینے میں دلہن کی رخصتی موقوف ہوتی ہے اور ان دنوں میں ولادت کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔اگر کسی کے ہاں ولادت ہوتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کی آمد پریشانیوں کا پیش خیمہ ہے اور اگر اتفاقی طور کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو فوراً اُسے نومولود کی آمد سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ماہ صفر میں سفر پر جانا بھی معیوب تصور کیا جاتا ہے۔خرید وفروخت سے بھی اجتناب کیا جاتا ہے، چنانچہ صفر کے مہینے کے گزرنے کا بہت شدت

سے انتظار ہوتا ہے۔ بعض عورتیں صفر کا مہینے ختم ہونے پر گھر کے تمام کوزے مٹکے توڑ ڈالتی ہیں اور پانی وغیرہ بہا دیتی ہیں کہ اس کو صفر نے جوٹا کیا ہو گا، لہٰذا اب یہ قابل استعمال نہیں۔ بعض لوگ صفر کے مہینے میں مٹکے اور برتن وغیرہ بہت اہتمام کے ساتھ ڈھانکتے ہیں، اسے کھلا نہیں چھوڑتے کہ کہیں صفر اس میں منہ نہ ڈال دے اور اس کو جوٹھا نہ کر دے، حالانکہ برتن کا ڈھانکنا تو حدیث کی رُو سے ہر وقت ضروری ہے۔ لیکن ان کا یہ عمل اس غلط عقیدے کی وجہ سے اس وقت کرنا باطل ہے۔ یہ تمام عقائد بالکل باطل ہیں۔ اسلام نے جاہلیت کی توہم پرستی کے مقابلے میں ماہ صفر کو مظفر و مسعود قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مہینوں میں اس مہینے کے ساتھ خصوصیت سے مظفر (کامیاب) کی صفت لگی ہوئی ہے اور اسے صفر المظفر کہا جاتا ہے۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ایام ظفر و سعادت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

صفر کو نحوست اور بے خیری کا مہینہ ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات کچھ من گھڑت اور جھوٹی روایات بھی پیش کی جاتی ہیں، جس کے بارے میں ملا علی قاریؒ نے الاسرار المرفوعہ، علامہ محمد طاہر پٹنیؒ نے تذکرۃ الموضوعات اور علامہ عجلونیؒ نے کشف الخفا میں اُن روایات کو موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔

نحوست اور بے خیری کسی دن یا مہینے میں نہیں بلکہ لوگوں کے اپنے بد اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انبیا علیہم السلام جب اپنی قوموں کو مسئلہ توحید اور دین کی تبلیغ کرنے آتے تو مشرکین اس سے بد فالی پکڑتے اور کہتے ہم نے تمھیں نامبارک پایا ہے (سورۃ یٰسٓ:۸۱)۔ تو انبیا علیہم السلام انھیں جواب دیتے ہوئے یہ بات واضح فرما دیتے کہ تمھاری نحوست تمھارے اپنے ساتھ ہے۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی بد فالی اور کسی چیز کی نحوست کے عقیدے کو رد کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "بد فالی لینا اور منحوس سمجھنا شرک ہے"۔ (ترمذی)

اسی طرح عمر بن حصینؓ، ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نقل کرتے ہیں: "وہ ہم میں سے نہیں جو بد فالی نکالتا ہے نہ وہ جو بد فالی نکلواتا ہے، نہ ہی غیب کی خبریں بتانے والا یا پوچھنے والا اور نہ ہی جادو کرنے والا یا جادو کروانے والا۔"

(طبرانی معجم کبیر معجم اوسط، جامع صغیر سیوطی، الحلیۃ لابی نعیم، الترغیب والترہیب)

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نبی کریمؐ سے نقل کرتے ہیں۔

”جس نے بد شگونی اور بدفالی کے ڈر کر اپنی کوئی بات یا کام چھوڑ دیا تو بے شک اُس نے شرک کیا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ ! اس کا کفارہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا (اس عقیدۂ بد سے توبہ کر کے یہ یقین پختہ کرے اور) یوں کہے ! اے اللہ ! کسی چیز میں بذات خود نحوست نہیں مگر جسے تو منحوس کردے، اور کسی چیز میں بذات خود بھلائی نہیں مگر جسے تو بھلا کردے اور تیرے سوا کسی کا کچھ اختیار نہیں، کوئی الٰہ نہیں۔“

(مسند احمد، طبرانی کبیر، جامع صغیر، عمل الیوم واللیلہ)

جابر بن عبداللہ انصاریؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

”نہ کسی بیماری میں بذات خود کسی کو لگنے کی صلاحیت ہے، نہ کسی چیز میں بدفالی ہے، نہ کوئی بدروح ہے، نہ ماہ صفر میں کوئی نحوست یا بلائیں ہیں اور نہ ہی کوئی بھوت پریت ہے۔“

(جامع صغیر)

اس قسم کی متعدد روایات مختلف صحابہ کرامؓ سے کتب احادیث میں اور بھی مروی ہیں۔ چونکہ صفر کی نحوست دور جاہلیت میں فتنوں اور حوادثات کی وقوعات سے وابستہ کی گئ تھی اور اس کو وہ فتنوں کی تحریک میں مؤثر خیال کرتے تھے لہٰذا شریعت اسلامی نے مسلمانوں کو اس عقیدے سے باز رکھا ہے۔ بہر حال یہ بد شگونی اور بدفالی وغیرہ خالص جاہلی تصورات ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہندوؤں اور مشرکوں کے باطل عقائد وتوہمات کی آمیزش کی وجہ سے رفتہ رفتہ رائج ہوتے چلے جارہے ہیں۔ سعد و نحس کا یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے محض اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم کے آگے کسی کا اختیار نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایک مسلمان کی یہی شان ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ہر قسم کے وہمی تصورات سے قطعاً پاک اور صاف ہو۔

رمضان المبارک اور قرآن

دنیا میں قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور اسی مناسبت کا نام "قرآن" ہے، یعنی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب۔ کروڑوں انسان صرف ناظرہ پڑھنے والے ہیں، جو لوگ دوسری زبان کے ہیں وہ بھی اسے کلام الٰہی سمجھ کر عقیدت سے پڑھتے ہیں اور مشقت کے ساتھ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں، مگر اس عمل کو عبادت جان کر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کو یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں، رمضان کے مبارک مہینوں میں دنیا کے ہر خطے میں رات کو تراویح میں حفاظ اس کو دل بستگی اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور کروڑوں لوگ دل بستگی اور خوش عقیدگی کے ساتھ سنتے ہیں، بہت سے اس کی مختلف تفسیریں پڑھتے ہیں، اس کے الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں فکر وتدبر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کے علوم ومعارف میں غرق رہتے ہیں، کروڑوں ہیں جو اس کو خوش الحانی اور ترتیل وتجوید سے پڑھتے ہیں۔ غرض دنیا کے گوشے گوشے میں قرآن حکیم کے پڑھنے کا جو اہتمام ہوتا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب کا نہیں ہوتا۔

قرآن پڑھنے پڑھانے کی بات جب کی جاتی ہے تو اصلاً اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ سمجھ کر پڑھا پڑھایا جائے۔ اس لیے کہ یہ محض وظیفے کی کتاب نہیں بلکہ ہدایت اور احکام کی کتاب ہے اور یہ اسی لیے نازل ہوئی ہے کہ لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں کہ ان پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کرکے اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں، یہ بات ان تعلیمات اور احکام کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ ایک بات نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ قطعی طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کو یہ امتیازی مقام حاصل ہے کہ محض اس کے الفاظ کو دہرانا اور بغیر سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث ثواب ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے، اللہ کے کلام کو جو عظمت وتقدس حاصل ہے۔ اور اس میں تسخیر وتاثیر کی جو قوت ہے۔ ایمان کو گرمانے، روح کو بالیدگی بخشنے اور آنکھوں کو نمناک

کرنے کی جو کیفیت ہے۔ وہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ اور محفوظ کتاب ہے۔ قرآن کا آغاز ہی اس حقیقت سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے، اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کے الفاظ ہیں۔ کسی زبان میں اس کا ترجمہ ان الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ اور تفسیر ان الفاظ کے مفہوم و معانی سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور بس وہ کلام الٰہی کا بدل نہیں ہیں۔

اس تصور کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے قوانین اور احکام نازل کیے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی ہے کہ مسلمان اس کتابِ ہدایت کے مطابق اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی گزاریں، یہ الٰہی قوانین اور تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ یہ امت کا منصبی فریضہ ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو عام کرے، ہر دور کے انسانوں کو سمجھائے۔ ظاہر ہے امت یہ منصبی فریضہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے اور اس ہدایت نامے کی روشنی میں زندگی گزارنے کا حق ادا کر سکتی ہے، جب وہ اس میں غور و فکر کی عادت ڈالے، اس کے احکام کی روح کو سمجھے، ہر طرح کے سرد و گرم حالات پر اس کو منطبق کرے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا پختہ فیصلہ کرے۔ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نزول کا یہی مقصد بتایا ہے۔

”یہ کتاب مبارک ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور وتدبر کریں اور اہل عقل اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کریں“۔ [ص: ۳۸]

امت نے اس قرآن کے ساتھ یہ نہایت غلط سلوک اور انتہائی زیادتی کی ہے کہ اس کو سمجھنے سمجھانے میں غور وتدبر کرنے اور اس کے احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت بڑی حد تک ختم کر دی ہے۔ حالانکہ قرآن نے بار بار اس کی ہدایت فرمائی ہے، یہی اس کا مقصد نزول بتایا ہے۔

رمضان کا مہینہ قرآن کا مہینہ ہے۔ قرآن کو مشن و مقصد اور زندگی میں حکمراں بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا اور کرنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ حیات اجتماعی میں ریاست اور قانون کے دائروں میں کافرما قوتوں سے جو کچھ اور جتنا کچھ کرایا جا سکتا ہو، اس کے لیے بھرپور

جدوجہد جاری رکھی جائے۔ لیکن اتنا ہی، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم اور فہم کو عام کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں حکومت کے سربراہ، حکومتی ادارے، تعلیم گاہیں، غیر سرکاری ادارے اور افراد نجی طور پر وہ سب کچھ کریں جو وہ کر سکتے ہوں۔ کچھ اقدامات بہ سہولت کیے جا سکتے ہیں اور دور رس نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں:

ہر آدمی جو پڑھ سکتا ہو، اس رمضان المبارک میں یہ عہد کرے اور اس پر عمل شروع کر دے کہ وہ روزانہ کم سے کم تین آیات یا جتنا زیادہ ممکن ہو، ضرور ترجمہ کے ساتھ پڑھے گا۔ یہ کام آج شروع ہوگا تو دو، چار، چھ سال میں مکمل ہو جائے گا۔

تمام تعلیمی اداروں میں قرآن مجید باترجمہ پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اس کا امتحان بھی لیا جائے۔ اس کے نتائج کو امتحانی نتائج میں اسی طرح، بلکہ اس سے زیادہ وزن دیا جائے جتنا دوسرے مضامین کو دیا جاتا ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں بھی قرآن مجید کے کچھ حصے باترجمہ پڑھنا لازمی قرار دیے جائیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے اور مقابلے کے سارے امتحانات میں بھی قرآن مجید کے ترجمے کا امتحان لازم کر دیا جائے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات سب اپنے وقت اور صفحات کا ایک حصہ قرآن مجید کے ترجمے کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیں۔ محلوں، دیہاتوں، مساجد، پبلک اداروں اور عمارات میں بھی قرآن مجید کے ترجمے کی تعلیم کے انتظامات کیے جائیں۔ اساتذہ اور دیگر تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید باترجمہ پڑھانے کی تربیت دی جائے۔ اساتذہ اور سرکاری ملازموں کو فارغ اوقات میں کلاسیں لینے کی ترغیب دی جائے اور ممکن ہو تو مالی معاوضہ بھی دیا جائے۔ اس طرح حکومت، غیر سرکاری ادارے اور افراد سب مل کر پوری قوم میں قرآن پڑھنے اور قرآن کو سمجھنے کی ایک لہر پیدا کر دیں۔ یہ لہر بہت سا خس وخاشاک، ملبہ اور گندگیوں کو بہا کر لے جائے گی۔

قوم کا تعلق قرآن سے قائم ہو جائے گا تو ایمان قوی ہوگا، سوچ درست ہوگی، عمل کی اصلاح ہوگی اور جدوجہد کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

"رمضان نیکیوں کا موسم بہار"

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، جو نیکیوں کی فصلِ بہار ہے اور تہی دامانِ عمل کو بقدرِ توفیق اس فصل گل سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے، رسول اللہ کو اس ماہ مبارک کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کی آمد سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس ماہ کی برکتوں اور سعادتوں کے بارے میں خبر دار فرماتے اور عبادت کی طرف خاص طور پر انھیں متوجہ کرتے۔ اس ماہ کا اصل اور بنیادی عمل روزہ ہے، یعنی صبح طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے، پینے اور دوسرے نفسانی تقاضوں سے اپنے آپ کو باز رکھنا، یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے، انسان کے لیے گھنٹے دو گھنٹے بھی بھوکا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، بیمار ہو تو پرہیز مشکل ہو جاتا ہے، دنیا کی ساری لذتیں انھی خواہشات سے متعلق ہیں، آدمی بطور خود اپنے آپ کو ان سے روک لے، حالاں کہ اس کو روکنے کے لیے نہ کوئی چوکیدار ہو، نہ کوئی قانونی پہرہ دار اور نہ جسمانی مضرت و نقصان کا اندیشہ۔

یہ انسان کی تربیت کا نہایت موثر اور بے مثال طریقہ ہے، جس سے محض روحانی مقاصد کے تحت اپنے آپ پر قابو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ نفس کے گھوڑے کے لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھے، جو شخص نفس کی آواز کو دبانے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لے اس کے لیے کسی بھی گناہ سے بچنا چنداں دشوار نہیں، اسی لیے روزہ کو تقویٰ کا باعث قرار دیا ہے اور رمضان کے مہینے کو صبر کا مہینہ فرمایا گیا۔

رمضان کیا ہے؟

آیئے! سب سے پہلے رمضان کا حقیقی تعارف خود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنتے ہیں:

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت کے مطابق شعبان کی آخری تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے ارشاد فرمایا: لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینے کی ایک رات ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس مہینے

کے روزے اللہ نے فرض کیے ہیں۔ اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے کو عبادت مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی نفل عبادت کرے گا تو اسے دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر اس کا اجر ملے گا۔ اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزے دار کو افطار کرایا۔ یہ اس کے لیے گناہوں کی مغفرت، آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہے اور اس روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ روزے دار کے ثواب میں کمی کی جائے۔

عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا''۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی یا صرف پانی ہی کے گھونٹ کے ذریعے کسی روزے دار کو افطار کرادے۔ جو کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلادے، اسے اللہ تعالیٰ میرے حوض یعنی حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا''۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ماہ کا ابتدائی حصہ رحمت درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی کا ہے۔'' بعد ازاں آپ نے فرمایا: ''جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام، ملازم اور خادم کے کاموں میں تخفیف اور کمی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اسے دوزخ سے رہائی اور آزادی دے گا۔

نیکیوں کا موسم:

رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس کو سال کے دوسرے مہینوں پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ اس میں شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ ہر نیکی کا ثواب 70 گنا ہو جاتا ہے۔ دعا کی قبولیت بڑھ جاتی ہے۔ اس ماہ میں اللہ اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ بہت سے ایسے جہنمیوں کو آزاد کرتے ہیں جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن لوگوں کے ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ جس میں ہدایت کی اور نیک و بد میں تمیز کی واضح

نشانیاں ہیں۔ یہ رحمت، مغفرت، جہنم سے نجات اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا خاص مہینہ ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے فرشتے آواز لگاتے ہیں: ”اے بدی اور برائی کرنے والے تو رک جا! اے نیکی کے طالب تو اس میں مزید طلب پیدا کر! جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو عرش سے ایک ہوا چلتی ہے جس کے جھونکوں کی وجہ سے جنت کے درختوں کے پتے اور کواڑوں کے حلقے تک بجنے لگتے ہیں۔

کیسی غمخواری؟

تھوڑی دیر کے لیے ٹھہریے! آگے بڑھنے سے قبل ہمیں اپنے تاجر دوستوں سے کچھ کہنا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس ماہ مبارک کی نمایاں خصوصیت ”غمخواری و مواخات“ ہے۔ خدا خود رحم فرماتا ہے اور بندوں سے بھی اس کا یہی مطالبہ ہے، مگر ہم شاید خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پکار پر لبیک کہنے کو تیار نہیں۔

اس ماہ مبارک میں ہر نیک عمل کا ستر گنا ثواب ملتا ہے، چنانچہ جہاں اور عبادات ہیں، وہاں اس ماہ مبارک میں صدقہ و خیرات بھی خوب کرنا چاہیے۔ اپنی حیثیت کے مطابق جس قدر ممکن ہو، یہ سعادت بھی حاصل کریں۔ یہ بھی خوب سمجھ لیجیے اس ماہ مبارک میں جس طرح نیک اعمال کا بے حد و بے حساب اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کا مواخذہ و عذاب بھی بہت شدید ہے۔

حکم ہے ”رمضان کی تیاری شعبان ہی سے کرو۔“ بدقسمتی سے ہمارے تاجر اور دکان دار اسی فارمولے اور سنہری اصول پر عمل کرتے ہوئے رمضان کی آمد سے قبل اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں، جبکہ رمضان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیزیں ذخیرہ کرکے مارکیٹ سے غائب کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ واضح حدیث ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کتنا برا ہے اشیائے ضروریہ کو روک لینے والا آدمی۔ اگر اللہ چیزوں کے نرخ سستا کرتا ہے تو اسے غم ہوتا ہے اور جب قیمتیں چڑھ جاتیں ہیں تو خوش ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اندازہ کریں۔ یہ عام دنوں کی بات ہے، اگر رمضان کے مقدس مہینے میں ایسا کیا جائے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہا جائے؟ لہٰذا غریب عوام کو چاہیے کہ چینی، آٹا، دال، چنے، بیسن، تیل اور پھل وغیرہ کا بندوبست پہلے سے ہی کر لیا کریں، کیونکہ رمضان میں مزید قیمتیں بڑھ جانے کا قوی اندیشہ بلکہ سو فیصد یقین ہوتا ہے۔

یہ عجیب چلن ہے حکومت کے مکمل انتظامات کے باوجود تاجروں اور دکانداروں کی بے حسی کی انتہا ہے کہ جوں ہی نیکیوں کا موسم بہار شروع ہوتا ہے۔ جیسے جیسے لوگ مسجدوں میں جا کر گڑگڑا کر معافی مانگ رہے ہوتے ہیں، رجوع الی اللہ کر رہے ہوتے ہیں ویسے ویسے تاجر اور دکان دار بیسن اور ٹماٹر تک کی قیمتوں میں دگنا تگنا اضافہ کر دیتے ہیں، جبکہ غیر مسلم ممالک میں ہر تہوار اور خوشی کے مواقع پر اکثر چیزوں کی نرخوں میں چالیس سے پچاس فیصد تک رعایت اور کمی ہو جاتی ہے، بلکہ غریبوں کے لیے خصوصی پیکجز بھی دیے جاتے ہیں، تاکہ غریب اور نادار لوگ بھی خوشی میں شامل ہو جائیں، لیکن نجانے کیوں ہمارے ہاں تو کمائی کا سیزن ہی ان تہواروں کو سمجھا جاتا ہے بلکہ کئی لوگوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پورے سال کی کمائی صرف اسی ''ایک ڈیڑھ ماہ'' میں کر لیتے ہیں۔ موسم بہار سے خوب ''فائدہ'' اٹھاتے ہیں۔ غریب کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ہمارے تاجر بھائیوں کو اوپر کی حدیث ضرور سامنے رکھنی چاہیے۔

نقصان دہ فائدہ:

حیرت ہے کہ ماہ مقدس میں ایثار کے بجائے لوٹنے کی حرص ہے۔ غریبوں کو نفع پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔ راحت کے بجائے تکلیف دیتے ہیں۔ نیکیوں سے دامن بھرنے کے بجائے ناجائز نوٹوں سے بھرتے ہیں۔ اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے بجائے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ غریبوں سے دعا لینے کے بجائے بددعائیں لیتے ہیں۔ صدقات و خیرات کرنے کے بجائے ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ غم خواری کے بجائے نمک پاشی کرتے ہیں۔ سخاوت کے بجائے بخل سے کام لیتے ہیں۔ ایثار اور قربانی کے بجائے جھوٹ اور فراڈ سے کام لیتے ہوئے غریبوں کی چمڑی اتارتے ہیں۔ اپنے مال کو خرچ کرنے کے بجائے جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت عطا فرمائیں۔

رمضان اور تقویٰ

اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں ان میں انسان کی تربیت اور اصلاح کا پہلو بھی ملحوظ ہے، روزہ بھی ان ہی عبادتوں میں سے ایک ہے، جس میں نفس کی تربیت اور تزکیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پر روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہیں کہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ: ۳۸۱)

"تقویٰ" کا لفظ عربی زبان میں "وقایہ" سے ماخوذ ہے، وقایہ کے معنی انتہائی درجہ حفاظت کے ہیں، الوقایہ فرط الصیانۃ (تفسیر کبیر: ۱/۱۸۳) تقویٰ کے معنی جہاں بچنے کے ہیں وہیں خوف اور خشیت کے بھی ہیں اور قرآن مجید میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (جیسے: النساء: ا، الشوریٰ: ۶۰۱، آل عمران: ۲۰۱) گویا محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے اس کا نام تقویٰ ہے۔ اسی کو سلف صالحین نے مختلف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، خود حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جب تک بندہ گناہ کی باتوں سے بچنے کے لیے از راہ احتیاط بعض جائز باتوں سے بھی اجتناب نہ کرے متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ (تفسیر کبیر: ۱/۱۸۳)

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے ایک مثال کے ذریعہ تقوی کو سمجھایا، حضرت ابی ابن کعبؓ نے عرض کیا کہ اے عمرؓ! کبھی کسی خاردار راستہ سے گزرے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں، حضرت ابیؓ نے دریافت کیا کہ اس موقعہ پر آپؓ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے پائینچے اٹھا لیے اور احتیاط سے کام لیا۔ حضرت ابی ابن کعبؓ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے۔

(تفسیر قرطبیؒ: ۱/۲۶۱)

گویا دنیا ایک راہ گزر ہے جو خاردار جھاڑیوں سے گھری ہوئی ہے، یہ جھاڑیاں خواہشات اور گناہوں کی ہیں، جو انسان کے دامن عمل سے لپٹ جانا چاہتی ہیں، متقی شخص وہ

ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے دامن کو خدا کی نافرمانیوں اور سے بچا کر دنیا کا یہ سفر طے کر لے۔ اسی طرح رمضان کے لفظ میں بھی یہی تقویٰ کا معنی مراد ہے کیونکہ اصل عربی زبان میں رمضان کے معنی ہیں جھلسا دینے والا اور جلا دینے والا اور اس ماہ کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ سب سے پہلے جب اس ماہ کا نام رکھا جارہا تھا، اس سال یہ مہینہ شدید جھلسا دینے والی گرمی میں آیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا نام رمضان رکھ دیا، لیکن علما نے فرمایا کہ اس ماہ کو رمضان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے گناہوں کو جھلسا دیتے ہیں، اور جلا دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ مقرر فرمایا۔ گیارہ مہینے دنیاوی کاروبار، دنیاوی دھندوں میں لگے رہنے کے نتیجے میں غفلتیں دل پر چھا گئیں، اور اس عرصہ میں جن گناہوں اور خطاؤں کا ارتکاب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر بخشوالو، اور غفلت کے پردوں کو دل سے اٹھادو، تاکہ زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا:

یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون

یعنی یہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تو رمضان کے مہینے کا اصل مقصد یہ ہے کہ سال بھر کے گناہوں کو بخشوانا، اور غفلت کے حجاب دل سے اٹھانا، اور دلوں میں تقویٰ پیدا کرنا۔ جیسے کسی مشین کو جب کچھ عرصہ استعمال کیا جائے تو اس کے بعد اس کی سروس کرانی پڑتی ہے، اس کی صفائی کرانی ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو گناہوں سے صاف ستھرا کرنے کے لیے یہ رمضان المبارک کا مہینہ مقرر فرمایا ہے، تاکہ اس مہینے میں انسان اپنی صفائی کرائیں، اور اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دیں۔

لہٰذا صرف روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کی حد تک بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس مہینے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس مہینے میں دوسروں کاموں سے فارغ کرلے۔ اس لیے کہ گیارہ مہینے تک زندگی کے دوسرے کام دھندوں میں لگے رہے۔ لیکن یہ مہینہ انسان کے لیے اس کی اصل مقصد تخلیق کی طرف لوٹنے کا مہینہ ہے۔

اس طرح تقویٰ ایک جامع لفظ ہے۔ جو خیر کی تمام باتوں کو شامل ہے۔ (قرطبی: ۲۶۲/۱)

چنانچہ مشہور بزرگ شیخ ابویزید بسطامی نے فرمایا کہ متقی وہ ہے کہ جو کچھ کہے اللہ کے لیے کہے، اور جو کچھ کرے اللہ کے لیے کرے، مَنْ اِذَا قَالَ قَالَ لِلّٰهِ وَمَنْ اِذَا عَمِلَ عَمِلَ لِلّٰهِ (حوالۂ سابق: ۱۶۱/۱) تقویٰ کے اس وسیع مفہوم کو قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان فرما دیا ہے کہ:

متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (البقرۃ: ۳، ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ تین باتوں کو تقویٰ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان میں پہلی چیز عقیدۂ و ایمان کی اصلاح ہے۔ یہ اسلام کی خشت اول ہے، اور اسی پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

دوسری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: اقامت صلاۃ یعنی نمازوں کا قائم کرنا ہے۔

متقیوں کی تیسری صفت انفاق ہے۔ انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہیں۔ قرآن کے بیان کے مطابق تقویٰ والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی کم و بیش عطا ہوتا ہے وہ اس کا ایک حصہ اپنے غریب بھائیوں پر خرچ کرتا ہے، دراصل دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال و دولت ہے۔ اس کی حرص اولاً انسان کو خدا سے بے توجہ کرتی ہے۔

الغرض تقویٰ تین باتوں کو شامل ہے، دل میں ایمان و یقین کی حقیقی کیفیت کو پیدا کرنا، ایسا یقین جو دل کی دنیا کو بدل دے، اور خدا کی مرضیات کو بجالانے میں اسے لطف آنے لگے، دوسرے وہ اللہ کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو، فرائض و واجبات کو پورا کرتا ہو اور گناہوں سے بچتا ہو، تیسرے وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، مال کے ذریعہ بھی غریب بھائیوں

کا تعاون کرتا ہو۔ اور اپنی زبان سے بھی لوگوں کی عزت وآبرو کو محفوظ رکھتا ہو، اس طرح تقویٰ پوری انسانی زندگی کو شامل ہے، اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔

غرض تقویٰ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے، اور تقویٰ کی منزل تک پہنچنا اس کے بغیر ممکن ہیں کہ انسان اپنی روحانی بیماری کی شناخت کرے، اور جہاں گناہ کا پیپ ہے وہیں اصلاح کا نشتر لگائے، اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ نیکیوں کی توفیق فرمائی تو اس سے دھوکہ نہ کھائے کہ کسی مریض کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند تصور کرنے لگے روزہ کا مقصد ایک مسلمان کو تقویٰ کی منزل تک پہنچانا ہے، اب کہ رمضان المبارک کے آخری ایام ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور احتساب کا آئینہ اپنے رخ زندگی کے سامنے کر دیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے تقویٰ کی طرف سفر شروع کر دیا ہے اور اگر شروع نہیں کیا تو کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟

تقویٰ کے انعامات:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جابجا تقویٰ کا حکم دیا ہے۔ دنیا میں کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر کام چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تقویٰ کا حکم دیا کہ تمام ظاہری و باطنی گناہ چھوڑ دو۔ اس حکم پر عمل پیرا ہونے پر ہمیں کیا ملے گا؟ تقویٰ پر اللہ تعالیٰ کیسے دینی و دنیاوی انعامات سے نوازتے ہیں؟ اس بارے میں مشائخ واکابر حضرات نے تقویٰ کے دس انعامات شمار فرمائے ہیں۔

(۱) کام میں آسانی:

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ومن یتق اللہ یجعل له من امرہ یسرا ”اگر تم تقویٰ اختیار کروگے تو ہم تمھارے سب کام آسان کر دیں گے۔ ذرا سوچیے! یہ نعمت نہیں ہے کہ انسان کے سب کام آسان ہو جائیں گے۔

(۲) مصائب سے چھٹکارا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا ”کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مصیبت سے جلد نکال دیں گے اس کو مصائب سے نکلنے کا راستہ ملے گا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

ویرزقه من حیث لا یحتسب ”جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسے راستہ سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا“۔

(۴) نور فارق:

تقویٰ پر اللہ تعالیٰ ایک ایسا نور عطا فرماتے ہیں جس سے برائی، بھلائی کی تمیز رہتی ہے جیسا کہ سورہ انفال کی آیت میں فرمایا گیا ہے:

یا ایها الذین امنوا ان تتقوا الله یجعل لکم فرقانا

”اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کر دے گا تم میں فیصلہ۔

(۵) نور سکینہ:

صاحب تقویٰ کو اللہ تعالیٰ نور سکینہ عطا فرماتے ہیں۔ اس کی حفاظت کریں گے اور گناہ سے بچا لیں گے۔ گناہ میں اس کو ایسی موت نظر آئے گی کہ گناہ کے ہزار مواقع ہوں گے وہ یہی کہے گا کہ بھائی تقویٰ ہی میں فائدہ ہے، گناہ میں تو بہت مصیبت نظر آ رہی ہے۔

(۶) پر لطف زندگی:

اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور تقویٰ پر وعدہ ہے کہ ہم تو ضرور بالطف زندگی دیں گے۔ ہماری نالائقی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اتنے اہتمام سے ذکر فرمایا ہے۔

(۷) عزت واحترام:

سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان اکرمکم عند الله اتقکم ”در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو۔ ایک اعلیٰ خاندان کا شخص اگر گناہ گار ہے اور ایک گھٹیا خاندان کا شخص متقی ہے تو یقیناً دوسرا ہی افضل ہے کیونکہ یہ صاحب تقویٰ ہے۔ متقی شخص دنیا میں بھی معزز ہے اور آخرت تو ہے ہی متقین کے لیے۔

(۸) اللہ کی ولایت کا تاج :

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر تم متقی رہو گے تو ہم تمھاری غلامی کے سر پر اپنی دوستی کا تاج رکھ دیں گے۔

(۹) گناہوں کا کفارہ :

تقویٰ کا ایک انعام گناہوں کا کفارہ ہے۔ تقویٰ سے ایسے اعمال صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے جو اس کی سب لغزشوں پر غالب آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیاتہ ”جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف کردے گا۔

(۱۰) آخرت میں مغفرت :

تقویٰ کے انعامات میں سے ایک انعام آخرت میں مغفرت اور گناہوں کی معافی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تقویٰ کیسے حاصل ہو؟ تقویٰ اس طرح حاصل ہو گا کہ جیسے یہ ایک ماہ رمضان گزارا جاتا ہے، باقی زندگی اسی نمونے پر گزار لیں۔ جیسے رمضان کے چند دن بعد ختم ہو جانے والا ہے، ایسے ہی عمر بھی تھوڑی سی ہے۔ یعنی پچاس ساٹھ سال ختم ہو جانے والی تھوڑی سی مدت۔ اس کو رمضان کے ایک ماہ پر قیاس کر لیں جو تمھاری اس تھوڑی عمر کو تقویٰ والی زندگی بنادے گا اور اللہ اس کی مدد کرے گا۔

رمضان کے بعد عید کا دن خوشی کا دن ہوتا ہے، ایسے ہی عمر کو پابندیوں کے ساتھ گزار لیا جائے تو پھر خوشی کا دن آئے گا۔ نمونے کے خوشی کا دن عید صرف تھوڑی دیر کا ہے۔ پھر وہی کاروبار کے دھندے اور فکر و غم۔ لیکن اصل خوشی کا دن (دخول جنت) کبھی ختم نہ ہو گا۔ خواہ کتنے ارب سال گزر جائیں۔ جیسے عید کے دن عورتیں سجتی ہیں، ایسے ہی وہاں عورتیں ہمیشہ سجی بنی رہی ہیں۔ جیسے عید کے دن کھانا اور لباس عمدہ ہوتا ہے، ایسے ہی اس خوشی کے دن سے لے کر ہمیشہ کو ایسے کھانے اور لباس رہیں گے۔ تو جیسے رمضان تھوڑا اور پھر عید۔ ایسے ہی زندگی تھوڑی اور پھر ہمیشہ خوشی کے دن کی طرف انتقال ہے۔ زندگی تقویٰ پر گزار لی تو عید ہمیشہ کو ملے گی۔ بس ہم موت تک تقویٰ کو اختیار کر لیں تو پھر عید کا چاند ایسا طلوع ہو گا جس کا غروب نہیں۔